



# اُردو انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر: عبدالحق

انجمن ترقی اُردو (ہند) شائع کردہ  
دہلی

# اُردو

- ۱۔ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے۔
- ۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔
- ۳۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔
- ۴۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۱ دریا گنج۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشہر

## انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

### نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

چار بار کے لیے	ایک بار کے لیے	ہالم
۳۰ روپے	۸ روپے	د۔ ہالم یعنی پورا ایک صفحہ
۱۵ روپے	۴ روپے	۷۔ ہالم (آدھا صفحہ)
۸ روپے	۲ روپے ۴ آنے	۸۔ صف ہالم (چوتھائی صفحہ)

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہوا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ بار چھپوائے جنس کے ان کے اے یہ رعایت ہوگی کہ مشہر صف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور صف چاروں اشتہا چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شایع اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کر دے۔

المشہر

## انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

# اُردو

جلد ۲۲	جنوری سنہ ۱۹۴۲ء	نمبر ۱
--------	-----------------	--------

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت :- دہلی



---

سید صلاح الدین جمالی منبر انجمن نے جیہ پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر  
دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

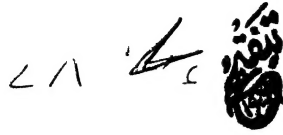
---

## نمبر ۱

# فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نمبر	نمبر شمار
۱	جناب سید عہد الزین صاحب استاد گورنمنٹ کالج امویہ	۱ ایک قدیم اردو شاعر راجا رام
۱۰	نوشتہ: آقائے جلال ہائی ترجمہ جناب حمزہ لکھنوی	۲ اصفہان کی بعض ادبی انجمنیں اور شعرا
۲۳	سید رشید الحسن صاحب ایم۔ اے	۳ سرسید کے لکچر
۶۳	جناب حسن بیگ صاحب عندلیب ایم۔ اے ایل ایل بی علیگ	۴ اردو کی نشوونما میں میرٹھ کا حصہ
۸۳	نواب صدیقار جنگ مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی	۵ خطبہ صدارت گل ہند اردو کانفرنس ناگ پور
۹۴	عبدالحی	۶ رپوٹ۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو
۱۰۳	سید ہاشمی فرید آبادی	۷ اصلاح رسم الخط
۱۲۱	جناب حیات اللہ انصاری صاحب	۸ سہ ماہی تبصرو
۱۳۹	ایڈیٹر دیگر حضرات	۹ تبصرے





# ایک قدیم اُردو شاعر راجارام

(از جناب سید ظہیر الدین صاحب مدنی اُستاد گورنمنٹ کالج احمد آباد)

ہندستان کے مسلمان سیاسی فائقوں سے پہلے روحانی فاتح شمالی دکن میں مورچے باندھ چکے تھے انہیں عوام کے دلوں پر فتح حاصل کرنی تھی اس لیے ان دانش مندوں نے تیر و تیر سے کام نہیں لیا بلکہ تیغِ زبان سے عوام کو رام کیا۔ بچوں کے دل کی ترجمان زبان ہو لہذا ان بزرگانِ دین کو پہلے عوام کی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی لیکن اس بازاری زبان میں ابھی اتنی قدرت نہیں تھی کہ ہر خیال کی ترجمانی کی غرض پوری کر سکے جس سے مبلغین کا مقصد بر آئے لہذا ان مبلغین نے اپنی ضروریات کے مطابق زبان کو ڈھالنا شروع کیا اور تلیل عرصے میں اُردو اس قابل ہو گئی کہ اس کے سر پر نظم و نثر کا بار ڈال دیا گیا۔ اس طرح اُردو کی ادبی تفکیک ہوئی اور اس امر میں خصوصاً گجرات میں باجن، گام دھنی، خوب محمد چشتی، محمود دریائی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انرض صوفیائے کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ ادبِ اُردو کی ابتدائی گریباں ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں جب دلی گجراتی نے ہوش سنبھالا تو انھوں نے بغاوتوں کی اس پردریش کردہ حسینہ میں کچھ ایسے معشوقانہ انداز پائے کہ اس پر ڈورے ڈالے اور آخر اس کو لباسِ ریختہ میں ملبوس کر کے کچھ اس طرح پیش کیا کہ اس پر ہزاروں نظریں اٹھنے لگیں ہر صاحبِ ذوق اسے اپنا معشوق سمجھ کر سینے سے لگانے لگا، شعر و سخن کی مجلسیں گرم ہونے لگیں اور شعرائے ریختہ گو میں مقابلے بھی شروع ہو گئے۔ یہ دور عموماً دلی و اشرف کا دور کہلاتا ہے اس میں گجرات و دکن میں متعدد شاعر گزرے ہیں جن میں سے راقم، گجرات

کے ایک شاعر گم نام راجارام کو پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

عصہ دما سے بزرگوں کی رہائی سنا کرتا تھا کہ سچ سے دو ڈھائی سو سال قبل سورت (گجرات) میں دو ہندو ریختہ گو شاعر راجارام اور پینی پرشاد گزرے ہیں جن کا کلام نایاب ہے اور راجارام کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ مشرت بہ اسلام ہوا مگر ظاہر داری ہندوؤں کی سی رکھتا تھا اور اسی کے ساتھ ایک واقعہ بیان کیا جاتا تھا کہ جب راجارام کا انتقال ہو گیا تو اس کے واقعہ راز دو مسلمان دوست (جو شاعر تھے) اس کی لاش کو اس کے مکان سے لے آئے اور تجمیز و تکفین کے بعد خواجہ سید جمال الدین قدس سرہ کی خانقاہ میں کسی جگہ دفن کر دیا۔ مذکورہ بالا بیان سننے کے بعد یہ سب کچھ مبالغہ ہی مبالغہ معلوم ہوتا تھا۔ دل میں ہزار خیال گزرتے تھے کہ ہندوؤں نے اس کی لاش مسلمانوں کو لینے کیسے دی؟ ممکن ہے اس کے عزیز و اقربا نہ ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندو اس کے اسلام سے واقف ہوں۔ بہر حال دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے مگر مجھے شاعر کے کلام سے کام تھا لہذا اس کی کھوج میں لگا رہا۔ اتفاق سے ایک روز ایک دوست کے کتب خانے میں سورت کے ایک ان پڑھ شاعر کا کلام ڈھونڈ رہا تھا کہ قشارا چند اوراق پارینہ ہاتھ لگ گئے ان اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد مشرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ راجارام کا مجموعہ کلام تھا۔

یہ نسخہ ایک مختصر مجموعہ کلام ہے اس کے ابتدائی اوراق یعنی باب الراے تک اور درمیان میں سے بھی چند اوراق گم ہیں اسی طرح آخر کے چند اوراق کم ہیں۔ مجموعے میں صرف پچیس غزلیں پائی جاتی ہیں اور ہر غزل سات یا نو شعر سے زیادہ کی نہیں ہے۔ ایک ترجیع بند بھی ہے اس میں سات بند ہیں اور یہ مکمل ہے۔ اکثر کتابت کی غلطیاں ہوتی ہیں جیسے مضبوط کو مزبوت لکھا ہے ممکن ہے اس زمانے کے رواج کے مطابق ایسا لکھا ہو جیسے ولی اور اس سے پہلے نفع کو نفا اور منع کو منا لکھتے تھے۔ اکثر مصرعے ساکت ہیں جو کتابت ہی کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ خط بہت خراب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے اصل سے نقل کیا ہے۔

ہم یہ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نام راجارام تھا کیوں کہ ایسے نام ہندوؤں میں عام ہیں اور یہ کوئی تخلص نہیں ہو سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے کوئی اور تخلص اختیار کرنے کے بجائے اپنا نام ہی تخلص میں استعمال کیا ہے۔ ہمیں اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ صرف ایک مختصر سے مجموعہ کلام

سے۔ اس کے دہن کے متعلق کلام میں کچھ پتا نہیں چلتا ہاں زبانی روایات کی بنا پر جب تک دوسری تحقیقات ہو، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجارام سورت کا رہنے والا تھا۔

راجارام کے کلام میں زبان کی خصوصیات عام طور پر دہی ہیں جو دلی کے دؤر میں پائی جاتی ہیں۔ کلام میں دلی کے دؤر کے مروج الفاظ و محاورے بے شمار ہیں جیسے سخن، تجھ سری، ہور ہمینی اور، کنے ہمینی پاس، چرن، پون ہمینی ہوا، سیس، ٹک ہمینی ادا، دتا دکھتا، سیتیں (سے)، کتیں، کوں، سیس، پچن، دوجا، انجو (آٹو)، اتھا (تھا)، نپٹ، سوں، موہن، دانار، سرکچن، بلہار، درس، جگ، نین، گلن (اسان)، پھاندا، لگ، وغیرہ

نن دتے ہیں اس کے سبز خط میں	کہ جوں سبزی میں دتے ہیں ہرن سبز
تصور بیچ اوس رشک چمن کے	مجھے دتا زمیں سے تا گلن سبز
جب سستی راجا سخن مجھوں دکھایا ہو درس	ہفت فلک کے اوپر تب سیں ہو میرا دماغ
خاص کہتے ہیں بھیج کر صلوات	جگ میں دوجا نہیں مثال گل
ہو ہر سبز اب بارغ محبت	میرے انجو کے پانی کی تری سوں
دہ اپنی محبت کے پھانڈے میں ایچ	میرے دل کے تیں کر گیا ہو شکار

تذکرہ تانیث کا بھی دہی حال ہو جو دلی کے دؤر میں تھا

دیکھ کر شمع رو کا آرایش	آتش عشق کوں ہو افزایش
جس مجالس میں ماہ رو آوے	شمع کا وہاں نہیں ہو گنجایش
مجھے سیر گلشن خوش آتا نہیں	جدا ہو گیا جب سے گل پرہن

لفظ ساکن کو متحرک بنا دینا بھی دلی کے زمانے کی ایک خصوصیت ہو جو راجارام کے کلام میں عام طور پر پائی جاتی ہو جیسے

جوش حیا کا مکھ پہ ترے دیکھ کر عرق	شبنم میں گل نخل ہو سراپا ہوا غرق
فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے چائی جاتی ہیں	

شلخ گل پُر ہو کے خفتی ہیں نجان او بوالہوس      نودوسی ملبلوں کے تنیں دکھاتی ہو بہار  
 اس شعر میں خم پر سے خفتی کی ترکیب باجن و مدام جنی کے دُور کی خصوصیت ہو ہے  
 سخن دریائے دمدت کا ہو گوہر      سخن میرے سخن کوں رکھ در گوش  
 پڑے کیوں کل، مجھے پٹو کے بغیر از      کیا ہو عشق اس کا دل کوں بے گل  
 منت رہیں کے ساتھ مل گل رو      آغوش گل کوں خار ہو منتاں  
 دلی کے دُور کی ایک اور خصوصیت مندرجہ ذیل شاعریں پائی جاتی ہو ہے  
 شمع رو کی شب کو محفل میں بھلک دکھلا گیا      اب تلک آیا نہیں وہ انتظاری ہو ہنوز  
 دھریاں ہو کر اے راجارام ساقی نے مجھے      ایک دن بوسہ دیا وہ خماری ہو ہنوز  
 دیکھ کر آئینے میں منہ اپنا      مت غوردی سے خود نمائی کر  
 واحد و جمع میں وہی قدیم قاعدہ بتاتا ہو ہے

بھنواں = محراب دیکھ تیری بھنواں کی اے فیدرؤ

فرشاں = باہر وہ آتا ہو سُن فرشاں بچھاتی ہو بہار

دو چلد جگہ ناری اضافت کو ہندی الفاظ کے ساتھ استعمال کرتا ہے

گور گمش میں اے گل پیریں کر      ہر ایک گل پر ترا نقشِ پرن کر

گور ایک دن کیا اس کی بزم میں      ہوا ہو تب سنی رنگِ یون سز

راجارام کے کلام میں روایت لفظی کی صنعت عموماً قدام کے طرز پر پائی جاتی ہو ہے

برہمن ہو کے بن عتیق صند میں      یہ کہہ دل کا بت نہ کیا ہوں

اے شکر لب توں ترش کر کر بات      کٹی میٹھائی میں مت کٹائی کر

سجیلا دیکھ اوس کے سبز خط کوں غلامی خط دیا ہو لکھ کے سنبل

حسن کے بحر سے لے آپ وصل آتشِ ہجر کوں بھجایا کر

عشق کے پھاندے میں کھینچا حسن کے میاں لے رکھ توں اپنے پاس گلِ رو بلبِلِ دل کا قفس  
تشبیہ و استعارہ میں بھی کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ سیدھے سادے استعارے اور صاف  
تشبیہیں استعمال کی ہیں :-

دو زلفاں زرخ پہ اُس کے یوں سہاوے، کتابِ حسن کوں گویا ہو جدول  
نین دے تے ہیں اُس کے سبز خط میں کہ جوں سبزی میں دے تے ہیں ہرن سبز  
غالی سیہ - منہ پر ترے دتا ہو یوں حسن کے گلشن میں جوں سیر کوں اُترا ہو زارغ  
لکھ پہ محبوب کے نہیں ہو خال حسن کے شہر کا ہو دہ کُتوال  
کلام میں صاف اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں :-

پیے جو مِ خودی کے جام اُس کی چشمِ مگوں سے شرابِ عشق سے ہر دم ہیں ہم سرشار اور داغ  
پرتو حسن سے شمعِ رُو کے جلوہ گر عاشقوں کی ہو محفل  
اور راجا رام اُس کے عشق میں یہ دل پریشاں ہو کہ جس کی زلف کا ہر مو ہوا ہو دام سنبل کوں  
عشق میں گلِ بدن کے راجا رام عندلیبِ ریاضِ وحدت ہوں  
دل و اشرف کی طرح راجا رام نے بھی مشکل زمینوں اور قافیہ ردیف میں اکثر غزلیں کہی ہیں  
ایک غزل میں پیرہن سبز چمن سبز وغیرہ باندھا ہو :-

وہ گلِ رُو جب سے پہنا پیرہن سبز ہوا ہو اُس کے پرتو سے چمن سبز  
گزر یک دن کیا سو اُس کے بر میں ہوا ہو تب ستی رنگِ پون سبز  
اور راجا ظلم میں اوس سبز خط کے کیے سارے شہید اپنا کفن سبز



ایک غزل میں فراغ، لاغ وغیرہ کو قافیہ ردیف قرار دیا ہے

اب کہو! یادو ہمارا کیوں ہوئے خاطر فراغ      دل ربا کرتا ہے گستاخی کتنیں ہو کر طفاغ  
 قول جو اڈل کیا ہے یار یاری کوں نبھا      کذبِ یحلمک حدیث ہے ہم سے کیوں ہوتا ہو لاغ  
 لشکرِ خیال میں راجارام ہشیاری ہے خوب      گرچہ رائی سو رہے تو شیر ہوتا ہے شفاغ  
 اسی طرح ایک غزل میں گل زار کا تفص ویدار کا تفص وغیرہ باندھا ہے تو ایک جگہ تجنیں، تلبیس، بلیس جیسے  
 قافیے انتخاب کیے ہیں۔

زبانی روایتوں پر اعتبار کر کے کوئی شخص راجارام کے مسلمان ہونے پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا اور اکثر  
 ایسی روایتیں مذہبی قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں مگر جب راجارام کے کلام کو دیکھتے ہیں تو  
 قدم قدم پر اس روایت کی صداقت پائی جاتی ہے کہ راجارام نے اس راز کو مخفی رکھنا چاہا۔ ایک جگہ لکھا ہے  
 اے راجارام مت کر راز فاش      ہو بے شک وہ بہشتی مردِ خامش  
 دل کا چور زبان پر کیا مگر اس طرح سے ہے  
 شمن ہے یار کوں خدا کا فیض      عشق ہے مجھ کوں مصطفیٰ کا فیض  
 ایک اور جگہ ہے

مجھے کیا خوف راجا عاقبت کا      محمد کا وسیلہ کوں لیا ہوں  
 حشر کا غم نہ کر توں راجارام      شافعِ حشر ہے نبی کی آل  
 مذکورہ بالا اشعار کو دیکھتے ہوئے بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان تھا۔ کیوں کہ اکثر  
 ہندو شعرا کے قلم سے ایسے اشعار نکلے ہیں جو ہندو مسلمانوں کی یگانگی اور اتحاد کا ثبوت دیتے ہیں پڑت  
 دیا شکر نسیم اپنی شہنوی گلزارِ نسیم میں لکھتے ہیں

کرتا ہے یہ در زباں سے یک سر      محمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیں میں یہ حرف زن ہے      یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے

لیکن راجارام اپنے جذبہ عقیدت سے مجبور ہو کر اس کا صاف صاف اظہار کیے دیتا ہے۔ ایک جگہ

وحدت پرستی کا اس طرح اظہار کرتا ہو ۛ

دہ گلِ نو بہارِ احدیت      حُسنِ تیرا رنگیں دیکھا ج کون  
عشق میں گلِ بدن کے راجا رام      عنذلیبِ ریاضِ وحدت ہوں

ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ۛ

اگر تجھ کوں ملے مرشدِ خاص      خدا اور مصطفیٰ بس مت جُدا کر  
اے راجا رام کر ترکِ دوستی کو      توں دینِ مصطفیٰ کوں رہنما کر  
ایک ترجیح بند عشقِ الہی میں لکھا ہو اس کا بھی آخری بند سُن لیجیے ۛ

گزر کر اے دل دار میری طرف      مرے عقل اور ہوش ہیں برطرف  
سپر کو میرے دل کی پُڑے کیا      نگاہِ تیری گویا ہو تیرِ ہدف  
عجب تیرے غم کا ہو گوہرِ صنم      ہو سینہ میرا چاک مثلِ صدف  
مری عرضِ سُن حُسن کے پادشاہ      ترے سے دو عالم نے پایا شرف  
تری یاد میں رام راجا ہو یار      مگر جانتے ہیں وہ شاہِ نجف  
ترے ہجر میں یار کب لگ رہوں      مری اضطرابی یہ کس کو کہوں

مذکورہ بالا شہادتیں دیکھنے کے بعد یہیں یقین ہوتا ہو کہ راجا رام مشرف بہ اسلام تھا۔

راجا رام کا کلام تعبت سے مملو ہو وہ فنا فی اللہ ہو چکا تھا اس کو ہر شے میں ذاتِ حق کا مظہر نظر

آتا تھا ۛ

اے راجا رام سے مخفی رہا نہیں ہو سجنِ ہرگز      اوسے ہر شے میں دستا ہو آپیں اظہارِ ادِ داغ  
خودی کو مٹا کر خدا کو حاصل کرنا چاہتا ہو ۛ

اولِ عارف توں ہستی کو مٹا کر      تصورِ دل اوپر نقشِ بقا کر  
کہاں ہو غیر جو کہنا اوسے غیر      خیالِ غیر سے دل کو صفا کر  
بغیر اوس کے ہر ایک شے کو توں مت دیکھ      خودی کو چھوڑ دے حاصلِ خدا کر

یار مجھ میں ہو محیط ہو کر نہاں      میں سمجھتا ہوں کہ اب تک دُور ہوں  
 راز اناجیٹِ حُسن کا پایا سو میں      چڑھ کے سولی عشق کی منصور ہوں  
 درحقیقت دیکھ راجا آرام میں      گوہر اسرار کا گنجوز ہوں  
 راجا رام نے اپنی شاعری پر تو فخر نہیں کیا لیکن اپنے کلام کے صوفیانہ ہونے پر فخر کیا ہے۔ صرف  
 دو مقطع ایسے ملتے ہیں جن میں شاعرانہ تعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔  
 راجا تیرے شعر کے معنی اگر مئے      آدیں ملک فلک سیتی بیٹے کنتیں سبق

گرچہ پادے مغز راجا آرام تیرے شعر کا      عارفان بولیں گے سُن کر ہر عبث نوع و حرف  
 طفلِ مکتب کیا سمجھتے ہیں اور راجا مغز خاص      شعر تیرا جا سنا کئی صاحبِ عرفاں کوں  
 راجا رام کے کلام کی خصوصیات کو غور سے دیکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجا رام دلی کے  
 دور کا شاعر ہونا چاہیے۔ اُس نے اپنے کلام میں دلی یا کسی اور شاعر کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی  
 ہے کہ راجا رام نے شاید شاعری کو فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا مگر اس نے اس کو صرف مذہبی جذبات  
 کا آلہ اظہار بنایا کیوں کہ کلام میں راجا رام اسرار کا گنجوز، شرابِ عشق سے مخمور، اپنے معشوق کے ناز و ادا  
 سے مسحور، دیدار کا طلب گار اپنی ایک ہی دُمن میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

### نمونہ کلام

عشق میں چھوڑ کے عزیز و خویش      شاہِ خواہاں کے پاس ہو درویش  
 حُسن دیکھلا کے وہ کمانِ ابرو      عشق کے تیر سے کیا دل ریش  
 کیوں لگے دل کے تئیں میرے آرام      عقبِ عشق نے لگایا نیش  
 پارسا کیوں رہے صنم کے پاس      زلفِ اُس کی ہو کافرِ بدکیش  
 عشق میں شمعِ رو کے راجا آرام      مثلِ پروانہ جل - مت اندیش  
 اور دل شبابِ چل توں اب اُس یار کی طرف      خورشیدِ حسن صورتِ انوار کی طرف

ای غنڈیپ دل توں نظارے کوں چل شاب  
گل وہ گیا ہر سیر کوں گل ڈار کی طرف

ای دل توں گل غدار طرف جھک کہیں نہ جھک  
نچ کوں اگر جہاں میں شہیدی کا شوق ہو  
رکتا ہو گرچہ ساغر و صہبا کی آرزو  
راجا توں رام ہو تو کہیں گے تجھے ولی

شیخ رو صحن چمن میں چل شبستاں سے بھل  
تجھ پہ رنگیں کا شہرت سن کے ای خورشیدرو  
شام میں تجھ زلف کے دغاں تلخ کر شب چراغ  
سیر کوں جاوے اگر توں باغ میں او گل بدن  
خواب مغل مج کوں کیوں خوش آوے راجا رام آج

ہمیشہ آفتاب ہوتا ہو قرباں  
اوسی کی چشم میں بلخ ارم ہو  
جن پر دل کوں دیوانہ کیا ہوں  
صنم کے درد کی سمن بنانے  
نیں اس محراب ابرو میں ای راجا  
کہو کئی جا کے اوس نورِ بصر سوں  
چھپا رکھ عاشقوں کا گنج اسرار  
ترا مکھ مخزنِ نورِ الہی  
ای راجا جو سوا مرنے کے آگے  
بندھا سو بار دستارِ زری کوں  
جو کئی دیکھا ہو اُس رشک پری کوں  
وہ اپنا تھا سو بیگانہ کیا ہوں  
ہریک انجو کوں دردانہ کیا ہوں  
دوگانہ کر کے شکرانہ کیا ہوں  
کھوتوں دیکھ الفت کی نظر سوں  
نکر اظہار زاہد بے خبر سوں  
تری تعریف کیوں ہوے بشر سوں  
دہی ہو بے فکر روزِ محشر سوں

# اصفہان کی بعض ادبی انجمنیں اور شعرا

## تیرھویں صدی ہجری میں

نوشتہ: آقاسے جلال ہوائی ————— ترجمہ: جناب محوی لکھنوی ————— (از مجلہ ’مہر‘ طہران)

————— ۶۰ (۱۰۰) —————

بارھویں صدی ہجری کے آخر میں، اصفہان کی بہار آفریں سرزمین، اپنے ادبی اور شعری کارناموں کے لحاظ سے جن شاعروں اور ادیبوں کی رہیں منت ہو، ان میں مشتاق اصفہانی کی شخصیت بہت ممتاز ہو۔ اس دور اندیش شاعر نے اپنی کوشش سے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی، جس نے فارسی نظم میں بڑا انقلاب کیا، دوزِ صفویہ میں جو مذاقِ سخن رائج اور عام تھا، اُس کی کایا پلٹ دی، اور قدیم فصحا، مثلاً رودکی، فرخی وغیرہ کے طرزِ اسلوب کو تازہ و زندہ کر دیا۔ اس انجمن کے پیرو اسی خط پر چلے جو ان قدیم بزرگوں نے قائم کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس عمل کا اثر پوری طود پر کامیاب ہو کر رہا۔

اس جدید ادبی و شعری رجحانات کے بانی اور اس نئی علمی بیداری کے علم بردار (مشتاق) نے سلاطین میں وفات پائی، مگر اطمینان کے ساتھ، کیوں کہ جس تحریک کی منہدی و مبارک بنیاد اُس نے ڈالی تھی، زمانے کی چیرہ دستیوں کے باوجود اس کا سلسلہ نہ ٹوٹا۔ مشتاق نے عربی کو پہنچ کر اپنی حیاتِ مستعار کو تو الوداع کہا لیکن اس کی ادبی تربیت کی رُوح زندہ رہی۔ اس کی فکر و کاوش کے پودوں نے ہونہار شاعر اپنی پوری کوشش اور دل چسپی سے کام میں لگے رہے۔ اور ان میں سے ہر ایک نے ایک گروہ کی تربیت کا ذمہ

لے کر اپنی بہت سی زندہ یادگاریں چھوڑیں۔ ادبی انقلاب کے اس تاب ناک سلسلے میں جسے ”ہارگشتِ ادبی“ کہنا چاہیے، نگار کار کیوں سے کڑیاں ملتی اور جڑتی رہیں، یہاں تک کہ اس کا سرا تیرہویں صدی ہجری تک جا پہنچا۔  
۱۔ مشتاق کی وفات کے دس سال بعد آقائے محمد (عاشقِ اصفہانی) نے بھی انتقال کیا۔ جو اپنے استاد کا جانشین اور اس ادبی انجمن کا رُوحِ رواں تھا۔ اور اُس نے اپنے غزل گو تلامذہ کا ایک ایسا جتھا چھوڑا جو اس کے سبک و دل آویز طرز کا پیرو تھا۔

۲۔ سید محمد (ہاشمِ اصفہانی) بھی اسی انجمنِ مشتاق کے پیروں میں تھے۔ انھوں نے سید محمد (سحاب) جیسا فاضل فرزند چھوڑا۔ سحاب نے ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی۔

۳۔ لطف علی بیگ (آذر) نے حسن علی بیگ (ذخر) جیسا لائق بیٹا دُنیا میں چھوڑا، جو اس تحریک پر چلتا اور چلاتا رہا۔

۴۔ احاج سلیمان (صباحی) نے فتح علی خاں صبا جیسا قابل اور مایہ ناز شاگرد پیدا کیا اور اپنی زندہ نامی یادگار چھوڑ کر سدھار گئے۔ صبا ایران کا بزرگ ترین ملک الشعراء ہوا اور اس نے ۱۳۳۵ھ میں دنیا سے کوچ کیا۔ اس طرح سے مشتاق کی تحریک بتدریج بڑھتی اور پھولتی پھلتی رہی۔ آخر تیرہویں صدی ہجری میں پوری طور پر آشکار اور نمایاں ہو گئی۔

ادبیاتِ فارسی کے مختلف اور متعدد دوروں میں تیرہویں صدی ہجری نمایاں اور ممتاز دور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زریں دور میں بہت سے بلند پایہ اساتذہ پیدا اور نمایاں ہوئے۔ ہر استاد قدیم فصحا کی طرزوں میں سے کسی ایک طرز و اسلوب کو پیش نظر رکھ کر داوِ سخن دیتا رہا۔ ان میں سے کچھ تو محض تقلید ہی پر قانع رہے، اور بعض تازہ اور نئے اسلوب کے موجد ہوئے، اور انھوں نے ایسی طرز کی داغ بیل ڈالی جس کی نظیر ادبیاتِ ایران میں کم یاب بلکہ نایاب تھی۔ اس صدی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایران کے اکثر دبیش تر شہروں میں کہنے اور لکھنے والوں (ادیب و شاعر) نے عرصہ ہستی میں قدم رکھا۔

ان تمام سخن طرازوں اور انشا پردازوں کے ناموں اور ان کی ادبی و علمی زندگی کی تاریخ بیان

کینے کے لیے تو حقیقت ایک مستقل اور مفصل تصنیف کی ضرورت ہو لیکن انوس! ان میں سے اکثر بچارے گم نام ہو گئے، ان کے آثارِ انکار کو شہرت کی نعمت میسر نہ آئی، یا شہور تو ہوئے مگر اب اُن کا سرمایہ انکار باقی نہیں، زمانے کے ہاتھوں تلف ہو چکا ہو۔ بہر حال اب ہم اُن انجمنوں کا مختصر ذکر کرتے ہیں، جنہوں نے ابوابِ ذوق و ادب کے ہاتھوں سرزمینِ اصفہان میں تشکیل اور نشوونما پائی۔

تیرھویں صدی ہجری میں جو ادیب و شاعر اصفہان میں گزرے ہیں، ان کی تعداد دو سو سے زیادہ ہو۔ ان میں سے بعض بزرگوں کے نام اور حالات تذکرہ زینۃ المداخ، انجمن خاقان، مجمع الفصحا جلد دوم، لعد طرائق الحقائق میں آئے ہیں، مگر زیادہ تر ایسے ہیں جن کے ناموں اور حالات کا کسی کتاب میں نام نشان تک نہیں۔

اسی دور میں بہت سی انشا پرداز اور سخن طراز ہستیاں خاکِ اصفہان پر چمکیں اور شہور ہوئیں، جو حقیقت میں شہرت اور ناموری کی سزاوار بھی تھیں جیسے (۱) ناطقِ اصفہانی، (۲) سید محمد سحاب (۳) طبیب، (۴) نشاط، (۵) جگر، (۶) سروش، (۷) رزگر، (۸) فردغی، (۹) شہاب، (۱۰) قطرہ، (۱۱) محمد سیدنا (۱۲) عثمان سامانی، (۱۳) ہامے شیرازی وغیرہ۔ یہ سب تیرھویں صدی ہجری کے ادب پرور اور سخن گستر حضرات ہیں۔ جو مذکور اپنے وطنِ اصفہان میں داغِ سخن دیتے رہے اور آخر کار اسی سرزمین میں اپنی زندگیوں کو خیر باد کہہ کر پیوندِ خاک ہو گئے۔

اسی صدی میں اصفہان میں بہت سی ادبی انجمنوں کی بنیاد پڑی۔ زبردست استاد فن نے ”نوکاروں“ کی ادبی قربت پر اپنی ہمت و توجہ صرف کی۔ مختصر یہ کہ اس عصر میں ادبیات اور فنونِ ذوقیہ سے دلچسپی اصفہان کے عام و خاص میں کچھ اس قدر پھیلی اور بڑھی کہ علمائے روحانی میں سے ایک بزرگ ترین ذات، یعنی حاجی سید محمد باقر نے بھی شعرا اور ابوابِ ادب کی ایک انجمن تشکیل دی۔ یہ بزرگ اپنے زمانے میں پوری مملکتِ ایران اور تمام شیعہ ممالک کے واحد و یگانہ مرکزِ روحانیت تھے۔ اور ہر ممکن طریقے سے سخن گویوں کی حوصلہ افزائی فرماتے، ذوقِ برہانے اور شوقِ دلائے رہتے تھے۔ زبانی ہی نہیں بلکہ گراں قدر انعام و اکرام اور بیش از بیش صلوں سے بھی شعرا کو ابھارتے اور نوازتے تھے۔

ایک بڑی اکثریت کا عقیدہ ہے کہ سروش اصفہانی تیرھویں صدی کا سب سے بڑا قصیدہ سرا شاعر تھا۔ لوگ جانتے اور مانتے ہیں کہ وہ قدیم فصحا مثلاً فرخی و رودکی کے شیوہ سخن کو دوبارہ زندگی دینے والا میما ہو۔ وہ بھی سید صاحب مرحوم ہی کی دست گاہ بلند پایہ کا پرورش یافتہ تھا۔

کتاب تذکرہ باقریہ کا ایک نایاب قلمی نسخہ ہمارے ایک فاضل دوست کے پاس ہے اور انہی کا ملوکہ ہے۔ یہ کتاب اُن شعرا کے حالات اور ادبی آثار پر مشتمل ہے، جو سید موصوف کے مداح تھے، اور ان کے خزان کرم سے بہرہ مند و فیض یاب ہو چکے ہیں۔

اب یہیں اس کے علاوہ اور دوسری ادبی انجمنیں، اُن کے تاریخی حالات راقم مضمون نے بڑی تلاش سے اب تک ہم پہنچائے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) ۱۲۵۳ھ کے دوران میں بعض استادانِ ادب مثلاً ہاشمیرازی، تاج الشعرا شہاب اصفہانی کی ہمت و کوشش سے ایک ”انجمن سیاری“ (گشتی) قائم ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے گہرے دوست، ہم عصر اور ہم صحبت تھے۔ بہت سے شعراے گرامی جیسے: مسکین، کیوان، سید محمد بقا اور دیگر شعراے عصر اس کے جلسوں میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ یہ انجمن اپنے ارکان میں سے کسی ایک رکن کے مکان پر ہفتے وار منعقد ہوتی تھی۔ ہندی شعرا بھی اپنے اشعار کی درستی و اصلاح اور اساتذہ انجمن سے کسب فیض کے لیے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اس طرح یہ انجمن کوئی دو سال تک جاری رہی۔ آخر ہاشمیرازی کے بیمار پڑ جانے کی وجہ سے بند ہو گئی۔

(۲) اس ”انجمن سیاری“ کے بعد ایک دوسری ”انجمن ثابت“ (غیر گشتی) مرحوم ملا محمد باقر گری کے دولت کدے میں قائم ہوئی۔ یہ بزرگ ابوالفقرا کے نام سے معروف تھے اور اصفہان کے خوش ذوق، صاحب دل، نیک سیرت بزرگوں میں شمار ہوتے تھے، فقرا کے ساتھ ان کی اعانت اور درویشوں کے حق میں ان کے حُسن سلوک کی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ غرض کہ اس انجمن میں بھی بہت سے اساتذہ وقت اور ہونہار نوجوان شاعر حاضر ہو کر فیض پہنچاتے اور پاتے رہے۔

ان انجمنوں کا طریقہ یا اصول کاغذیہ تھا کہ گزشتہ قدیم اساتذہ میں سے کسی استاد کا کوئی مصرع بطور



طرح کے دے دیا جاتا، ہونہار شاعر اس پر طبع آزمائی کر کے، غزلیں کہہ کر لاتے اور اساتذہ سخن ران ”نوکاروں“ کے کلام کی اصلاح فرماتے تھے۔ اس انجمن میں بہاؤد شہاب بہت کم جاتے تھے۔ کہیں کہ ”ذوبت شاعری“ اب ان سے گزر کر آگے بڑھ چکی تھی۔ اور ان کے ”باز ماندہ“ (خلف) تک پہنچ چکی تھی۔ مثلاً: بہاؤ کے بڑے فرزند عفا اور شہاب کے خلف الصدق ثاقب اب اس کے علم ہمدار تھے۔ اس ادبی انجمن کی ایک گراں بہا یادگار، جو خوش نصیبی اور اتفاقِ وقت سے باقی معنوں کو دستیاب ہوئی ہو، یہ چند غزلوں کا مجموعہ ہو، سب غزلیں ایک ہی وزن و قافیے میں ہیں، یعنی ہم طرح اور اسی دور کے شعرا کی کہی ہوئی ہیں۔ میرزا عبدالرحیم انصر نے سلسلہ میں اپنے ہاتھ سے مجموعے یا مغل دستے کی صورت میں خوش خط لکھی ہیں۔ انصر اپنے وقت کے اچھے شاعر اور مشہور و معروف خوش نویس تھے۔ اتفاق کہ یہ دہی سال ہو، جس سال اس انجمن کے بانی نے وفات پائی۔

مرحوم عفا سامانی نے ایک ”قصیدۂ انجمنیہ“ کہا ہو، اس میں انجمن کی خوبیاں بیان کی ہیں اور ان اساتذہ کے نام لیے ہیں جو انجمن میں شرکت فرماتے تھے۔

یہ اور اس کے علاوہ ایک ”قصیدۂ انجمنیہ“ ہمارے ہاتھ لگا ہو، جو مرحوم پرتو اصفہانی کا کہا ہوا ہو۔ یہ قصیدہ بھی اسی انجمن کے اوصاف میں ہو۔ انصر کے مرتبہ مجموعے سے چند ہم طرح غزلوں کا ایک ایک مطلع بطور نمونہ پیش ہو ۛ

دوش بر گردن من سلسلہ از موعے تو بود	دلم آشفته تر از موعے تو بروے تو بود۔ (از عبدالرحیم، انصر)
از ازل قبلہ صاحب نظراں روے تو بود	عارفاں را ہمہ محراب دل ابروے تو بود — آشفته
ماہ تو دوش نمایاں ز سبر کوے ”	لیکن امروز شنیدیم کہ ابروے ” — مسکین
کار امروز بس آشفته تر از موعے ”	در کفم دوش مگر حلقہ گیسوے ” — الفت
سرو نورستہ شبیب قد دل جوے ”	بر سرش ماہے اگر ہم چو مہ روے ” — انجم
اکر کہ آشفنگی ماہم از موعے ”	دل ماہود کہ زنجیری گیسوے ” — پرتو
سنبلی معش بہ آغوش گل روے ”	دل لگاں کرد کہ مشک است دلے موعے ” — بقا

ای خوش آن روز کہ منزلِ گمراہی تو بود دیدہ را روشنی از طلعتِ نیکوے تو بود ناصری  
با غزلِ گمراہ عمرِ چو من خوے ” ہم چو موم آہن و فولادِ بازوے ” اشتہا  
عنان سامانی کے قصیدے میں ۷۰ شعر ہیں۔ اس کے اعلیٰ معیارِ ادبی سے قطع کر کے دیکھا جائے  
تب بھی یہ اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہو۔ شعرا کے ناموں اور تعریفوں کے بعد امین الدیوب  
کی مدح پر ختم ہوتا ہو۔ جو محض شعرا کی حوصلہ افزائی اور ان کے شوق کو اُبھارنے کے لیے انجمن کے جلسوں  
میں کبھی کبھی تشریف لے آتے تھے۔ فارسی کا مذاق چوں کہ ہمارے ملک میں عام طور پر بہت کم ہو گیا ہو،  
اس لیے ہم اس قصیدے کے صرف پانچ شعر لکھتے ہیں ۷

دیگراں را شوقِ بتاں بر سر و سرود چمن      ماؤ زندانِ غزلِ خواں و فضاے انجمن  
ماہنر را اخترانیم انجمن مارا سپہر      ماسخن را بلبلانیم انجمن مارا چمن  
اندر آتا حوزہٴ بینی پُر از عقل و رواں      اندر آتا روضہٴ بینی پُر از سر و سخن  
محفل، آمادہٴ دروے، ہم محبت، ہم صفا      مجھے، آوارہٴ اذوکر ہم مختلف ہم مومن  
یک طرف گرمِ غزلِ خوانی حریفانِ جواں      یک طرف مستِ سخنِ دانی ظریفانِ کہن

عنان نے اپنے اس قصیدے میں، جو اخلاص و محبت کے جذبات سے سرشار ہو، جن گرامی قدر  
شعرا کا تذکرہ کیا اور اوصاف بیان کیے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: (۱) مسکین، (۲) پرتو، (۳) عنقا،  
(۴) افسر، (۵) بقا، (۶) سرگشتہ، انھی کا دوسرا تخلص اشتہا تھا۔ (۷) آشفہ، (۸) فرخ، (۹) ساغر،  
(۱۰) دہقان، (۱۱) شری، (۱۲) ہوزا، (۱۳) پردیس۔

(۳) مرحوم ابوالفقر کی وفات کے بعد، جو ۱۲۸۵ھ میں ہوئی، اس مفید و نامی انجمنِ ادبی کی  
رہنما بند ہو گئی۔ اور کچھ عرصے تک بند ہی رہی۔ آخر اُس دور کے شعرا اور اربابِ ذوق نے مرحوم ہا  
اور مرحوم تاج اشعرا شہاب میں خدمت میں حاضر ہو کر اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ انجمن دوبارہ جاری کی جائے۔

۷ ان سب اہلِ ادب و ذوق و سخن و دین کے حالاتِ زندگی، آقائے جلالِ ہماں نے اپنی کتاب ’تاریخِ مذاہنِ صہبان‘  
میں بڑی کاوش اور جوش سے بہم پہنچا کر تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ محو

ہاں اس وقت بہت بوڑھے جھڑوس ہو چکے تھے۔ اور مرحوم شہاب اس زمانے میں صاحب ثروت و دولت تھے، کیوں کہ امراے شہر اور حکام وقت سے ان کے مراسم بڑے ہوئے تھے اکثر و بیشتر ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض اور درجہ سے بھی انھوں نے اس مفید گزارش پر انتفاع نہ کیا، مرحوم ہاں، جیسا کہ ان کے معاصرین اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے، طبعاً ارباب حکومت سے الگ تھلگ رہتے، اور امرا کے ساتھ میل جول رکھنے سے دور بھاگتے تھے۔ وہ صرف ارباب ذوق کے ساتھ گھل مل کر رہنے کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسند کرتے تھے، خصوصاً علم و ادب کے ہونہار نوہادوں کی تربیت اور فیض رسانی ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا۔ اسی سبب سے وہ اپنی پیرائہ شکستہ حالی اور کمزوری کے باوجود اس انجمن کی تشکیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن اکثر و بیشتر مرحوم ہاں ہی کے مکان پر منعقد ہونے لگی۔ اصل میں یہ گشتی انجمن تو نہ تھی، مگر علم و ادب کا چمکا رکھنے والوں میں جو پابند اس کے امکان کو اپنے یہاں بلا سکتا تھا، دعوت بخوشی قبول کی جاتی اور انجمن اپنے میزبان کے گھر پر جمنی تھی۔

اس عہد کے بعض ریاض، اور امیر لوگ بھی اس قسم کی انجمنوں کو قوم و وطن کے لیے ایک طرح سے مفید اور فز و قیاز کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ اور وہ خود بھی کبھی کبھی دعوت دینے میں سبقت فرماتے تھے۔ مرحوم تاج الشرا شہاب، مرحوم ہاں میں، تین دوستانہ مراسم کے علاوہ ہمسائیگی کا رشتہ بھی تھا، اسی نظر سے وہ جب کبھی اصحابان میں موجود ہوتے اور انجمن کا جلسہ ہاں مرحوم کے دولت کدے پر ہوتا، تو بڑی خوش دلی کے ساتھ شریک ہوتے اور مبتدیوں کو فیض پہنچانے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس انجمن کی تاریخی یادگاروں میں چند قصائد انجمنیہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدے کا آغاز اس مطلع سے موزا ہے۔

”نوہار آمد، گھڑار بے نشوونما است      باو فردوہیں در طرف چمن نافہ کشا است

انجمن کا وصف کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے: ”براں محفل استاد سخن بنج ہوا است“ اس قصیدے میں کئی شعرا کا نام الگ الگ شعروں میں لیا ہے مثلاً (۱) مسکین، (۲) پرتو، (۳) بقا، (۴) سانو، (۵) عثمان،

(۶) الفت، (۷) عنقا، ان میں ہر ایک کے وصف میں جدا جدا دو دو تین تین شعر ہیں، تنہا عمان کی نسبت کہتا ہے۔

داں دگر عمان آں بجز فصاحت کہ بہ نظم خامہ اش گاہ گہر بخش و گئے گوہر زنا است  
طبع سرشارش دہیا و مضامینش گہر وین سخن بست مسلم کہ گہر از دریا است  
اور چند شاعروں کا اکٹھا ایک ہی شعر میں ذکر کر دیا ہے مثلاً۔

یک طرف نامی و آشفته و مفتون و شہاب یک طرف فرخ و دہقان و نیہا و جزا است

یہ قصیدہ اس موقع پر کہا اور پڑھا گیا ہے، جب کہ انجمن خود مرحوم ہما کے گھر پر ہوئی تھی اور مرحوم شہاب بھی اس میں تشریف فرما تھے۔ اس قسم کی دورنگی تقسیم کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ اگر درجہ اول کے شعرا کو الگ بیان کرنا مقصود تھا اور درجہ دوم کے سخن دروں کو الگ تو لازم تھا کہ مرحوم شہاب کا نام مفتون اور نامی کے بعد نہ دیا جاتا۔ اس لیے کہ یقیناً وہ اس انجمن بلکہ اس دور کے درجہ اول کے استاد میں ہیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ شہاب مرحوم انجمن کے مستقل ارکان میں نہ ہوں اور جسوں میں کم آتے ہوں۔ (؟)  
اس انجمن کی تاریخی یادگاروں میں ایک قصیدہ انجمنیہ اور ہے، اس کا مصنف حاجی محمد کاظم خاموش ہے، قصیدے کا آغاز حاجی خاموش نے حافظ شیراز کے ایک مطلع سے کیا ہے، اور براعت استہلال کے طور پر شعرا کے نام لایا ہے۔ مطلع اور چند شعر پیش ہیں۔

دلا تو تاج و بیو شہر بید امکاں باش بخواہ تاج ز قزہا و سلطاں باش  
بہ بزم منعم و مسکین چہ پرتوئے گلنی توزیرِ انسرِ زندانِ پاک داماں باش

سلحہ براعت استہلال، فن بدایع کی ایک صنعت کا نام ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ شاعر پانسی اپنی کتاب کے ابتدائی خطبے یا قصیدے وغیرہ میں ایسے الفاظ لائے جو موضوع تصنیف سے متعلق ہوں مگر یہاں بقیہ عبارت یا الفاظ کے ساتھ ظاہری مطلب کچھ اور ادا کرتے ہوں اور ساتھ ہی مصنف کے مطالب آئندہ و موضوع پر دلالت کرتے ہوں۔ مثلاً ان شعروں میں، ہما، منعم، مسکین، انسر، بے نقلا، اشار کے اور الفاظ سے بل کر ان اشار کا مطلب ظاہری بتاتے ہیں اور اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے اور آئندہ اشار میں شاعر ان سے متعلق کچھ بیان کرے والا ہو۔ محض

بے گزلیاں ہر دم زانوئے بخش برآر سر ز گریباں بہ فکر ساماں باش

جن الفاظ پر خط یہی شعرا کے تخلص ہیں، اسی ترکیب سے بہت سے دوسرے شعرا کے تخلص آئے ہیں۔  
 قصیدہ بڑی محنت و کاوش سے کہا ہو اور اس صفت کو بڑی خوبی سے نبھایا اور دکھایا ہو۔ جی تو چاہتا تھا کہ  
 دس پندرہ شعر پیش کیے جاتے لیکن طویل کلام کا خوف اور فارسی سے عام بے ذوقی مانع ہو۔ بہر حال اس میں  
 حسب ذیل نام آئے ہیں : (۱) بہا، (۲) مسکین، (۳) بے گزرا، (۴) منعم، (۵) پرتو، (۶) افسر، (۷) بقا،  
 (۸) ساغر، (۹) پردیس، (۱۰) آشفٹہ، (۱۱) پریشان، (۱۲) والد، (۱۳) مفتون، (۱۴) فرخ، (۱۵) جیو، (۱۶)  
 عثمان، (۱۷) سہا، (۱۸) عنقا، (۱۹) ناصری، (۲۰) سرگشتہ، (۲۱) مانی، (۲۲) حیران، (۲۳) شعلہ، (۲۴) ضیا،  
 (۲۵) انجم، (۲۶) ہمت، (۲۷) شہاب، (۲۸) ثاقب، (۲۹) ہلال، (۳۰) بیضا، (۳۱) بہا، (۳۲) رضوان،  
 (۳۳) بے دین، (۳۴) کافر، (۳۵) آصف، (۳۶) خاموش، (۳۷) شری، (۳۸) جونا، (۳۹) کیواں۔

۴۔ ۱۹۵۷ء میں اس دور کے بزرگ ترین شعرا میں سے دو استاد بہا اور شہاب انتقال فرما گئے،  
 اس کے علاوہ ۱۹۵۸ء میں سرزمینِ اصنہان میں ایسا شدید کال پڑا کہ خدا کی پناہ ! اس قحط نے اصنہان  
 میں رہنے والوں کو زخمہ درگور کر دیا۔ جینا عار اور جان بچانا دشوار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادبی انجمن بند ہو گئی  
 ان اربابِ نظم کا رشتہ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ آخر مدتِ مدید کے بعد مرحوم بہا کے سب سے بڑے فرزند  
 مرحوم میرزا محمد حسین عنقا نے پھر از سر نو اس انجمن کی تشکیل کے لیے کمر ہمت باندھی۔ اور ایک ”انجمن ثابت“

سلحہ ملا ہیں: میرزا حسن، جو پہلے بے گزرا تخلص کرتے تھے، پھر انھوں نے اپنا تخلص آتش رکھا، یہ بزرگ سائب  
 کلیم کی طرز میں بہت اچھا کہتے تھے۔

۵۔ یعنی جیو، اصنہانی، جو اصنہان کے کریمِ انساب سادات میں سے تھے۔ یہاں جیو، یزدی، معصوب، نک، دان  
 مراد نہیں ہیں۔

۶۔ یعنی مرزا محمد عبداللہ۔ ان کے دو تخلص تھے۔ ایک سرگشتہ، اور دوسرا اشتہا۔ یہ ابواسحاق رسلخ، المہر کی طرز پر  
 شعر کہتے تھے۔ اور اس طرز کے استاد میں شمار ہوتے تھے۔ کسی ہم عصر شاعر نے ان کی تاریخ کیا خوب کہا ہے: ”اگر  
 داسے کہ اشتہا نہ فاریم دگر تو بواہی المہر پر عالم گیر کے گزشتہ سالہ نمبر میں ہم معتقد اور معتدل معنوں کہ چکے ہیں۔ محوی  
 ۷۔ یہاں مراد ہیں: ملا ہادی جو بمصدق ”برعکس ہند نام دنگی کافر“ بے دین تخلص کرتے تھے لیکن اصنہان کے مشاہیر صاحب  
 عنقاں بزرگوں میں تھے۔

اپنے ہی مکان پر جاری کی۔ لوگ ان کی استادی کو مانتے اور مانتے ہی تھے، شاعری کے رموز و نکات معلوم کرنے کے لیے جہاں تک طلباء فن سے ہر کما اس میں حصہ لینے لگے اور شرکت سے زرا بھی غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس دور کے کئی اساتذہ مثلاً عثمان، مسکین، کیواں، پردتو وغیرہ بھی اس میں دل چسپی لیتے اور آمد و رفت رکھتے تھے، اور اس نیت و ارادے سے کہ شعرا کے حوصلے بڑھیں، ارباب ذوق کا شوق بگھنے نہ پائے، نیز اس خیال سے کہ ان کی دیکھ بھال، غور پر داشت، ذوق و ادب کا پسندیدہ شیوہ بلکہ واجبی فریضہ ہو، وہ پوری طرح سے اس کا ساتھ دیتے، ہر ہفتے حاضر جلسہ ہوتے اور خدمت بجا لاتے تھے۔ مرحوم عقدا خصوصاً نوجوان شعرا کا شوق بڑھانے کے علاوہ ان کو شاعری کی باریکیاں سمجھانے میں زرا بھی کمی نہ کرتے تھے، اور قواعد فنی سکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے، اور جس صورت سے بھی ہو سکتا وہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے عزم و ہمت کو اُبھارتے، ان کے دلوں کو اُکساتے رات دن اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ وہ ہر ہفتے سرکاری عہدہ داروں، شہر کے معزز و ممتاز رئیسوں اور حکام حکومت میں سے بھی کسی نہ کسی کو ہر جلسے میں بلاتے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی فطری رغبت یا زمانے کے اقتضا سے آتے اور انعام و اکرام سے شعرا کی مزید بہت افزائی و حوصلہ افزائی کا فرض ادا کرتے تھے۔ اس انجمن میں بہت سے اساتذہ وقت شرکت فرماتے رہے، مثلاً: عثمان، مسکین، پردتو، افسر، کیواں، شعشع، الفت، اختر، سہا وغیرہ بہت سے نوجوان تازہ بہ تازہ عوض ہنر کرتے تھے۔ مثلاً دزنی، بزی، ذوقی وغیرہ۔

اسی زمانے میں مرحوم نثار شیرازی نے اصفہان کا سفر کیا، انجمن عقدا میں بھی حاضر ہوئے اور ایک قصیدہ انجمنہ عقدا کی تعریف میں تیار کیا۔ جس میں اور کئی اساتذہ کا بھی نام لیا اور ذکر کیا جو۔

عقدا کی یہ ادبی انجمن مستلزم تک چلتی اور پھلتی پھلتی رہی۔ اسی سال عقدا بھار ہوئے، پیار بھی ایسے کہ بستر سے لگ گئے۔ اس وجہ سے پھر اس محفلِ آدب کا رشتہ نظم و درہم و برہم ہو گیا۔

ہاں یہاں یہ بھی بتادینا ہو کہ نہا اور عقدا کی انجمنوں کے درمیان میں جو خالی زمانہ گزرا ہو، اُس میں ایک چھوٹی سی انجمن چند ماہ تک مرحوم میرزا محمد علی مسکین کے گھر پر چلتی رہی، لیکن یہ ”دولت مستجبل“ تھی۔ عقدا کے بہترین کارناموں میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ شعراے انجمن کا سارا کلام خود اپنے خط سے

لکھ کر مُرتب اور محفوظ کرتے رہے، جس کا کچھ حصہ دست یاب ہوا ہو۔

مرحوم عفا کی وفات کے بعد مسئلہ نامہ مسئلہ کے درمیان میں یہ ادبی انجمن پھر بند ہوگئی اور ایک عرصے تک اپنی فیض رسانی سے محجور رہی۔ آخر کار مسئلہ کے اثنائیں مرحوم طرب نے جو ہا کے دوسرے بیٹے اور عفا کے چھوٹے بھائی تھے، پھر کوشش کی کہ جلد انجمن دوبارہ قائم و جاری ہو جائے اور طلبہ فن کو اپنی گزشتہ روایات کے بموجب فائدہ پہنچائے۔ ان کے دوسرے بھائی شہا اور کئی دوسرے اساتذہ وقت کی ہمت و اعانت اور وعدہ شرکت سے یہ سہی بار آور ہوئی۔ مثلاً عثمان، افسر، بیضا دینہ۔ اب اس کے ہفتے دار جلسے مرحوم طرب ہی کے گھر پر ہوتے تھے اساتذہ اور طلبا بہ کثرت شرکت کرتے تھے۔ یہ انجمن مدت تک جاری اور اپنا کام کرتی رہی۔

طرب کی انجمن کے ارکان کو پچاس شعرا سے زیادہ تھے۔ مذکورہ حضرات کے سوا حسب ذیل شعرا بھی حاضر انجمن ہوتے رہے۔

(۱) دہقان (۲) منعم (۳) بزیمی (۴) ذوقی (۵) ساکت (۶) آتش (۷) نجم (۸) ثاقب (۹) جلالی (۱۰)۔

شعخہ، وغیرہ

(۶) مرحوم طرب کو اپنی ضرورت سے اصفہان چھوڑ کر طہران جانا پڑا۔ اس سفر کی بدولت انجمن پھر بند ہوگئی۔ تھوڑے دنوں بعد، مرحوم میرزا سید علی نقی خاں ”کمان افسر“ نے، جو اصفہان کے ممتاز، ادب پرور اور دانش مند سرداروں میں تھے، ایک نئی انجمن قائم کی، تقریباً ۴ سال سے زیادہ یہ انجمن کامیابی کے ساتھ اُن کے دولت خانے میں منعقد ہوتی رہی۔ اس میں اصفہان کے شعرا عموماً جاتے اور حصہ لیتے رہے۔۔۔

(۷) میرزا علی نقی خاں کی انجمن کے بند ہونے پر، مرحوم سید محمد حقائق شیرازی نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی، یہ اپنے زمانے کے ایک روشن خیال فاضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اصفہان میں جدید طرز و اسلوب پر ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا، جس کا نام ”دبستان حقائق“ تھا۔ یہ انجمن ہر شب جمعہ کو برپا ہوتی تھی، اکثر ادبا اور شعرا تشریف لاتے اور شرکت فرماتے تھے۔

مرحوم فرست شیرازی ایک بار اصفہان آئے تھے، انھوں نے اپنے سفر میں اس انجمن کو بھی

دیکھا۔ اور اپنی تصنیف میں اس کے کئی اساتذہ مثلاً سہا، طرب، منعم اور بڑی کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔  
(۸) انجمن حقائق کے بعد اصفہان میں محنت تک کوئی ایسی انجمن قائم نہ ہو سکی، آخر رسالہ دانش کدہ  
اصفہان کے فاضل مدیر آقائے شیدا نے اس کمی کو محسوس کیا اور ۱۳۳۳ء کے دوران میں پھر ایک ایسی  
انجمن بنانے کے لیے سوچ بچار، دوڑ دھوپ اور صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ یہ بزرگ بھی ملک کے  
فضلا اور دانش مندوں میں شمار کیے جاتے ہیں، آخر انھوں نے اپنی رہنمائی اور حسن انتظام سے، ادب و  
شعر کے باقی ماندہ اساتذہ کو دعوت ادب دے کر پھر اکٹھا کیا۔ جیسے: آتش، منعم، شملگیں، ساکت، سینا،  
گلشن، ثاقب، باری، انصاری (آقائے میرزا موٹی)

خدا کے فضل اور آقائے شیدا کی سرگرمی و توجہ سے شمع ادب جلتی اور انجمن چلتی رہی، مبتدی نوجوان  
یکثرت اس انجمن سے بہرہ مند اور فیض یاب ہوتے رہے۔ آقائے جلال ہاشمی ”نامہ دانش مندان اصفہان“  
لکھتے ہیں کہ:-

”راقم بھی تقریباً اس انجمن کی زندگی بھر اس میں حاضر ہوتا اور فائدہ اٹھاتا رہا۔ حالت شوق یہ تھی کہ ہر  
روز سارے سارے دن جمعے کا منتظر رہتا تھا کہ کب یہ مبارک دن آئے اور استادان وقت کے  
سامنے حاضر ہو کر دانش اندوز ہوں۔“

اس انجمن میں اور بہت سے ہونہار نوآموز شاعراتے تھے جو رفتہ رفتہ اپنی محنت اور فیضِ اساتذہ  
سے درجہ کمال پر پہنچ گئے۔ آج بھی خدا کے فضل سے انجمن کے اکثر و بیشتر ارباب کمال زندہ و سلامت  
ہیں، اور اصفہان کی مائے ناز و فخر روزگار ہستیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(۸) آقائے شیدا کے مکان پر جو شمع ادب فروزاں تھی، افسوس کہ بعض ایسے وجوہ سے جن کا  
بیان کرنا مناسب نہیں، وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد پھر ایک نئی انجمن شعرا مہوم  
ادیب فرہمند کے دولت خانے پر وجود میں آئی۔ جلال ہاشمی موصوف نے اس کے اساتذہ سے بھی بہت  
کچھ فیض پایا ہے

۱۳۵۲ء ہجری میں میرزا عبدالحسین خاں ادیب فرہند دُنیا سے سدھارے اور یہ انجمن بھی ختم ہو گئی۔ اب



ہفتیاں خالی ہو، اس کے بعد سے اب تک وہاں کوئی ایسی انجمن موجود نہیں۔ لیکن امید ہو کہ پھر کسی صاحب ہمت، ذوق پرور، ادب نواز ہستی کی مدد اور ساعی سے یہ کمی پوری ہو جائے گی اور ذوق و ادب کی مشعل اس ذوق آفریں سرزمین میں ہمیشہ خاموش نہ رہے گی۔

# سر سید کے لکچر (یعنی تقریریں)

(مقالہ جناب سید رشید الحسن صاحب ایم اے عثمانیہ)

## (۱) تقریر کا موجودہ مفہوم

موجودہ زمانے میں تقریر نے اپنے گزشتہ مفہوم کو بھلا دیا ہے۔ اب تقریر وہی سمجھی جاتی ہے جس کے سامعین کی جماعت عامۃ الناس یعنی عوام و خواص پر مشتمل ہو۔ موضوعات بھی ایسے ہوں جو عام دھماں کو اُبلانے کے لیے یا ملک کے مسائل حاضرہ پر روشنی ڈال سکیں۔ تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر ہی میں اس قسم کی تقاریر کی دلغ بیل پڑ چکی تھی اور ان کی سرحد مذہبی موضوع کو چھوڑ کر علمی اور سیاسی عنوانات تک آچکی تھی۔ انہی آیام بلکہ ان سے کچھ عرصہ پہلے عرب اور ایران دنیوہ ہر جگہ علمی اور فلسفی مباحثوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ حاجی ٹُلف علی خاں آذر نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ تھے۔ سعدی شیرازی کے متعلق لکھا ہے کہ ”طالب علمی کے زمانے میں ان کے ہم عمر اور ہم سر لوگ ان کی خوش بانی اور سخن تقریر پر رشک کرتے تھے“

وہ ایک سچے ہوئے عالم اور محقق تھے۔ ان کو اکثر موضوعوں پر فقہاء اور قضاة کے محمول میں بحث و مناظرے

کا اتفاق ہوا ہے۔

جہاں تک کہ یونان و روم کا تعلق ہو بعثتِ مسیح سے قبل یہاں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے۔ ہر جگہ علمی مباحثوں سے محفلیں گرم رہتی تھیں۔ سیاسی تقریروں کا عام رواج تھا۔ بلوشارک کی مشہور کتاب مشاہیر یونان و روم میں اس کی مثالیں کثرت سے درج ہیں۔ چنانچہ جس زمانے میں ایتھنز اور اہل مکار میں بخیرہ سیلمن کی بابت مدتِ دراز سے جنگ جاری تھی اور ایتھنز کو بار بار شکستیں ہو رہی تھیں اس وقت ایتھنز کا مشہور مفقن سولن زندہ تھا۔ اس نے اپنی قوم کو غیرت دلانے کے لیے اپنا حال مجنوںوں کا سا بنالیا اور ایک بلندی پر جہاں اکثر فصحا منادی کیا کرتے تھے جاکر کھڑا ہوا اور اپنی عادت کے خلاف اشعار پڑھنے شروع کیے جس میں اپنے ملک کے باشندوں کو غنیم کے خلاف بہت اُکسایا۔ اس واقعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہو کہ ایتھنز (یونان) میں قدیم ہی سے ایک بلند جگہ مقرر تھی جس پر کھڑے ہو کر اکثر فصحا عوامِ اناس کو مخاطب کیا کرتے تھے اور تمام مجمع کے خیالات پر اپنی حکومت کرتے تھے۔

شیکسپیر کے ڈرامے جولیس سیزر میں دکھایا گیا ہو کہ اینٹونی روما کا ایک بڑا سیاست اور زبردست مقرر تھا۔ اس کی وہ تقریر جو اس نے سیزر کے قتل پر کی تھی آج تعلیم یافتہ طبقے کے زبان زد ہو۔ اس کی جادو بیانی کا وہ عالم بتلایا گیا ہو کہ آن کی آن میں سامعین اینٹونی کی تقریر کے سیلاب میں بہ گئے اور اس جوش میں سیزر کے قاتلوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔

عصرِ جدید میں بھی تقریرِ عامہ (Public Speaking) کا بہت رواج ہو اور اب اس کو فنی ذریعہ بھی دیا گیا ہو۔ خصوصاً لاسکی کی ایجاد سے تقریرِ عام کو اور اہمیت حاصل ہو گئی ہو۔ اس میں قابلِ قابلِ حضرات کی تقریریں آئے دن ہوا کرتی ہیں جن کو عالم گیر حیثیت حاصل ہو۔

### (۳) سر سید سے پہلے ہندوستان میں تقریر

تقریر کا وہ مفہوم جو دوسرے ممالک میں قدیم زمانے سے رائج تھا ہندوستان میں ہندوؤں

کے ہاں بالکل جداگانہ صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ ان کے ہاں تقریر کی صرف ایک صورت تھی اور وہ صرف مذہبی۔ لیکن اس کو تقریر کہنا تقریر کے مفہوم کو فوت کرنا ہے۔ ان کی تقریریں محض راماین یا مہابھارت کی تلامذت سے آگے نہیں بڑھتی تھیں اور ان کتابوں کے پڑھنے کا مدعا صرف یہ تھا کہ کوئی مذہبی یا اخلاقی نکتہ سامعین کے لیے نمایاں کیا جائے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کے ہاں بھجن کا بھی رواج تھا جس میں ساز بھی ساتھ رکھا جاتا تھا۔ یہ بھجن کسی کھلے میدان میں مقرر کیے جاتے۔ عوام اس کے سننے کے لیے جوق درجوق آتے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ بعض مخصوص لوگ راماین اور مہابھارت کے اشلوک مع ساز کے گاتے جاتے اور درمیان میں ٹھہر ٹھہر کر ایک شخص ان کی تشریح کیا کرتا۔ یہ مجلسیں بعض وقت ایک ایک ہفتے تک جاری رہتیں۔ بھجن ہوتے تو اشعار تھے لیکن ان میں جو نکات پائے جاتے تھے ان کی تشریح میں بھجن کے پڑھنے والے جن مطالب کو پیش کرتے تھے ان کا بیان تقریر سے کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان کے قدیم سادھو اور سنیاسی بھی اپنے چیلوں اور عوام کے سامنے ترکِ مٹیا، بے ثباتی، مٹیا اور ناپائیداری لذائذِ دوروزہ سے پرہیز کرنے کے بارے میں تقریریں کرتے رہتے تھے۔ یہ گاؤ گاؤ پھر کے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتے۔ اور سفر کی ہزار ہا مصیبتیں اور کلفتیں اٹھا کر اپنا بیان عوام کو سنایا کرتے تھے۔

قدیم ہندو راج دھانیوں میں بھاٹوں کے نام بھی سُنے گئے ہیں۔ یہ راجاؤں اور مہاراجاؤں کے درباروں میں خاندان درخاندان چلے آتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ یہ راجا مہاراجا یا والی ملک کا شجرہ نسب اور خاندانی کارنامے نہایت جوش و خروش کے ساتھ برسرِ محفل بیان کیا کرتے تھے۔

مسلمانوں کے ہاں تقریر کا رواج بہت قدیم سے ہے۔ عرب، ایران، ترکستان اور مصر تمام بلاؤ اسلامی

فل۔ لفظ بھاٹ سنسکرت کے لفظ بزد سے نکلا ہے اور یہی لفظ انگریزی میں (Bard) کی شکل میں موجود ہے۔ انگریزی کا (Bard) بھی ایک درباری شاعر کی حیثیت رکھتا تھا اور اپنی شاعری میں بادشاہ یا شہنشاہ وقت یا ان کے مشاہیر خاندان کے کارنامے نمایاں کو دیباڑوں اور محفلوں میں سناتا تھا۔

میں اس کا چرچا تھا۔ لیکن ہندستان میں تقریر عامہ کا حال کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ لے دے کے یہاں ایک وعظ تھا جو ملّا اور صوفیا کے ابتدائی زمانے سے اب تک چلا آتا ہو۔ یہ وعظ خالص مسلم اجتماعات میں موقع بہ موقع ہوا کرتے۔ کبھی جمعہ کی نماز کے بعد کبھی گھروں یا کسی کھلے مقام پر اور کبھی عورتوں کی محفل میں۔

جہاں تک مسلمان ہند کا تعلق ہو وعظ کی ہمیشہ ایک معین شکل رہی ہو جس میں علاوہ اخلاقی بیان کے مذہب اسلام کے چار بڑے ارکان نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فلسفے اور ان کے فوائد پر بحث ہوا کرتی۔ اسوا اس کے معاشری زندگی پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ مثلاً شادی بیاہ کے مسائل یا عام طرزِ بود و باش۔

### (۳) سرسید کے معاصرین کی تقاریر

انگریزوں کے دذّرِ حکومت کے کچھ عرصے بعد ملک میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہوئے جس سے ہندستان میں جا بجا مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ بنگال اس بیداری کا پہلا مرکز تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں بنگال برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام ہوا جو ڈاکٹر راجندر لال متر اور رام گوپال گھوش کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۸۸۷ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی گئی۔

ان انجمنوں میں تمام کارروائیاں اور مباحثے انگریزی زبان ہی میں ہوا کرتے تھے۔ ہندو ہمیشہ اپنے حاکموں کی زبان سیکھ کر عزت و جاہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کی حکومت کے قیام کے چند ہی روز میں انگریزی سیکھ لی تھی۔ جس طرح مسلمانوں کے دذّرِ حکومت میں انھوں نے بہت جلد فارسی اور عربی سیکھ لی اور ان زبانوں کے ماہر ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں دہلی اور آگرہ کالج کے قیام کے بعد بکثرت ہندو گریجویٹ بھلنے لگے۔ انھوں نے انگریزی کھنے پڑھنے کے علاوہ انگریزی گفتگو میں بھی مشق بہم پہنچائی تھی۔ سیاسی تحریکوں کے ساتھ ہندوؤں نے ایک قدم اور اٹھایا اور آن کی آن میں سارا ہندستان ان کی مذہبی تحریکوں سے گونجنے لگا۔ کیشب چندر سین نے ”برہم سماج“ کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح اندھومن بوس

کی قیادت میں "سادھارن برہو سماج" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی۔ ادھر پونا میں مشر ایم۔ جی۔ رائے کی رہنمائی میں "ہمارا سماج" اور شمال میں سوامی دیانند سرسوتی کی "آریا سماج" کی بنیاد پڑی۔

بالآخر دسمبر ۱۹۷۵ء میں انڈین ایسوسی ایشن نے ترقی کر کے انڈین نیشنل کانگریس کی شکل اختیار کی۔ جس کے صدر مشر ڈبلیو، پوزر جی منتخب ہوئے۔ بمبئی کے کانگریس کے پہلے اجلاس میں سر اہنیا آئر ہسٹرننڈ چارلہ تلک۔ دلوا بھائی نوروز جی، فریندر ناتھ سین، ڈبلیو، سی بینرجی، رنگا ناٹھو، فیروز شاہ مہتا، ڈی، ایس، دائٹ جیسے مشاہیر نے دھواں دھار تقریریں کیں اور یہ سب تقریریں سیاسیات سے متعلق تھیں۔ ان تمام ابتدائی سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کے متعلق تواریخ کانگریس میں الگ الگ لکھا ہے کہ یہ اپنے وقت تقریر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے دلائل صاف، پُر زور اور نکتہ چینی سے بالاتر ہوتے تھے۔

پنڈت من موہن مالویہ اور لوکمانیہ تلک ہندستان کے بڑے زبردست مقرر مانے جاتے تھے۔ لوکمانیہ تلک تو بلاشبہ مہاراشٹر کے بے تاج کے بادشاہ تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں بلا کی گرمی بھری ہوئی تھی۔ ان کی تقریر کی عام خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہایت سلیس اور سادہ ہوا کرتی۔ یہ اپنی تقریر سے ہزاروں آدمیوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھے۔

لالہ لاجپت رائے سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے چوتھے اجلاس میں نمودار ہوئے۔ لالہ جی ایک اچھے مقرر ہونے کے علاوہ ایک خاص نقطہ نظر کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنے میں کامیاب ہوا کرتے اس لیے کہ وہ آردو میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز بھی زوردار تھی وہ جس وقت بھی بولنے لگتے ہو جاتے ان کی آواز برابر ساتھ دیتی۔ ان کی آواز میں کھٹکا تھا۔ جو بات منہ سے نکلتی پُر اثر ہوتی۔

لالہ لاجپت رائے کے ذکر میں ایک اور واقعہ قلم بند کرنے کے لائق ہو۔ ان کے باپ کا قیام

فٹ۔ ان سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی نسبت تواریخ کانگریس سے مواد لیا گیا ہے۔

فٹ۔ تواریخ کانگریس۔

فٹ۔ تواریخ کانگریس ۱۹۷۱ء



کہ وہ اتنے بڑے اور عام مجمع میں ایٹینج پر آئے۔ ہمارے نزدیک ان کی اس مناجات میں بھی تقریر کے بعض عناصر موجود ہیں۔

اکتوبر ۱۸۶۳ء میں سرستید دوسری مرتبہ مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ کی تقریر گاہ پر کھڑے ہوئے مگر اس موقع پر مناجات شنائے کی بجائے وہ فارسی کی ایک تقریر لکھ کر لائے جسے انھوں نے مجلس کے رُو بہ رُو پڑھا۔ ۱۸۶۳ء میں وکٹوریہ اسکول کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت انھوں نے ایک تقریر غازی پور کے رُو سا اور عوام کی ایک کثیر تعداد کے رُو بہ رُو کی۔

مجموعہ لکچرز کے مولف مولوی امام الدین صاحب گجراتی نے اس تقریر کو سرستید کی پہلی تقریر قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں کسی قسم کا سقم نہیں پایا جاتا۔ تقریر کا سانچہ بتانا ہے کہ یہ کسی کہنہ مشق مقرر کی پیداوار ہے۔ شروں سے آخر تک صلیبی ہوئی اور شستہ ہے۔ بظاہر اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرستید قومی کاموں کی طرف اس وقت عملی طور پر نہیں بڑھے جب تک کہ انھوں نے اپنے میں وہ تمام قابلیتیں اور صلاحیتیں نہ دیکھ لیں جو ایک لیڈر اور رہنما قوم میں ہونی چاہئیں۔

## (۵) سرستید کی تقاریر پر عام رائے

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تقریر کی ضرورت آج کل دنیا میں بڑھتی جا رہی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کیا سیاست، کیا معاشرت، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت غرض ہر جگہ یہ ناگزیر سی ہو گئی ہے۔ مغربی ممالک نے فنِ تقریر میں بہت ترقی کی ہے۔ وہاں اس فن پر کتابیں کثیر تعداد میں لکھی جاتی ہیں۔ سرستید کی تقریر پر قبل اس کے کہ کوئی رائے قائم کریں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے مغربی ممالک کی تقریر اور مقرر کے معیارات کو بیان کریں اور اس کے بعد سرستید کی تقریر کو ان کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں۔

۱۔ مجموعہ لکچرز سرستید ص ۱۵

Effective Speeches by Dwight E. Watkins,

۲۔ اس موضوع پر تمام خیالات

Professor of California University.

۳۔ اس کتاب سے ماخوذ ہیں۔



(۱) ایک مقرر کے لیے سب سے پہلی اور ضروری چیز **مقرر کے لیے ضروری چیزیں** | مشاہدہ ہو۔ مشاہدے کے بغیر وہ حقائق کو محسوس طریقے

پر اپنے سامعین کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کو ایسی باریک نظر سے دیکھے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ اس چیز میں سے اس کی روح کو چارٹا ہو۔ مشاہدے سے انسان میں اُبھک پیدا ہوتی ہو۔

(۲) مشاہدے کے بعد مطالعے کی ضرورت بھی ایسی ہی شدید ہو۔ مطالعے کے بغیر خیالات کو مستند طریقے پر بیان کرنا ناممکن ہو۔ مطالعہ ہر قسم کا ہو سکتا ہو۔ ایک بہترین مقرر کے لیے ہر علم و فن سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنا از بس ضروری ہو۔ منطق تو تقریر کی جان ہو۔ وہ تقریر کو تازگی اور روح بخشی ہو۔ قانون، سے عمی، دانش ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آج کل حکومت قانون ہو، اور قانون حکومت۔ شہر اور اپنے وطن کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہو۔ اس کے علاوہ مقرر کو ہر قسم کے ادب کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہو۔ جدید اور قدیم ادب، دورِ حاضر کی تمام اچھی اور بُری کتابیں، اخبار رسالے، غرض ایک ڈیپ س کے لیے مطالعہ ہونا چاہیے۔

(۳) تیسری اور آخری اہم چیز مقرر کے لیے یہ ہو کہ اس کا دماغ ہمیشہ ہر قسم کے مواد سے بھر ہوا ہو۔ جب تک اس کے پیش نظر کوئی نہ کوئی ذہنی نقشہ نہ ہو، مقرر تقریر کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا اور یہ چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ تبادلہ خیالات، مطالعہ اور تفکر سے کام نہ لے۔ یہ تینوں چیزیں تقریر کا مواد فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ تبادلہ خیالات ہماری تمام غلط فہمیوں کو دور کرتا ہو۔ برسرِ خط کہ جس سے تبادلہ کیا جائے وہ منتخب، مستند اور بڑی شخصیت کا آدمی ہو۔ اور مطالعہ تو جیسا کہ کہا گیا ہو تقریری معلومات کا سنگِ بنیاد ہو۔ تفکر بھی آدمی کو صحیح راہ پر لا ڈالتا ہو۔ اس سے آدمی جس جہت پیدا ہوتی ہو۔ جب تک مطالعے میں تفکر نہ ہو وہ بے سود ہو۔ اگر کوئی شخص ہزار پان سو کتابیں بھی پڑھ لے اور تفکر سے کام نہ لے تو ایسا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہو۔

اب تک جو چیزیں بیان کی گئی ہیں وہ بیرونی لواحق ہیں جو ایک شخص کو بہترین مقرر بنانے میں مدد ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ چند داخلی صفات اور خوبیاں بھی ضروری ہیں جن سے انسان کامیاب مقرر

بن جاتا ہو۔

۱۔ اول آواز ہو۔ آواز ایسی بڑی ہو کہ سارے مجمع میں گونجنے لگاؤ۔ وہ مجمع کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ آدمی کے خیالات کتنے ہی بلند اور اچھے ہوں۔ لیکن اس کی آواز اس کے خیالات کا ساتھ نہ دے تو وہ سامعین کو اپنا پیام سننے سے قاصر رہتا ہو۔ آواز کی دوسری صفت یہ ہو کہ وہ یکساں ہو۔ بعض لوگوں کی آواز کبھی ہست ہوتی ہو اور کبھی بلند۔ مگر یہ بڑی خرابی ہو۔

۲۔ کامیاب مقرر کی ذات میں ایک اور چیز پوشیدہ ہوتی ہو وہ نہایت لطیف ہو یعنی وہ انسان کے اعلیٰ اخلاق۔ صاحب اخلاق آدمی نڈر رہتا ہو۔ اخلاق جسم اور آواز دونوں کو قوی تر بنا دیتا ہو۔ اس کو کہیں دبنے اور بھگکنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ شفیق دلیہر ہوتا ہو۔ اس کا لہجہ صاف، اس کی آواز میں دریا کی روانی، اس کا قول قبول مردوں، اس کی سچائی اس کے بیان میں خلوص پیدا کرتی ہو اور یہ خلوص لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا ہو۔

۳۔ اگر مقرر اعلیٰ درجے کا ہو تو اس کی شخصیت بھی اعلیٰ ہوتی ہو۔ مقرر کی شخصیت سامعین پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی۔ پس وجاہت ایسی ہو کہ اس کا رعب مجلس پر کافی طور پر چھا جائے۔ اس کی قامت بلند اور اس کا چہرہ بہرہ درست ہو۔ اس کے چہرے پر وقار، غفلت اور جاذبیت ہویدا ہونی چاہیے۔ چہرے کی بشاشت بھی شخصیت میں جاذبیت پیدا کرتی ہو اور یہی مقبولیت کا راز ہو۔

۴۔ مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہو کہ اپنے سامعین کے ساتھ پوری ہم دردی کا جذبہ رکھے۔ اس کو انہی کی طبیعت کے ساتھ ساتھ چل کر اپنے خیال کے موافق بنانا ہو۔ اس کو سامعین کے رنجوں اور خوشیوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔ وہ کبھی ان کے احساسات کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔ اس کو اس راہ میں احتیاط سے قدم اٹھانا پڑتا ہو۔ اسے چاہیے کہ چاہت اور نفرت میں فرق کرے نیز انفرادی اور اجتماعی حالتوں کو پہچان سکے۔ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو اس طرح بیان کرے کہ سامعین کے زاویہ نگاہ کے مطابق ہوں۔ ایک خشک مزاج مقرر بہت جلد اپنی دل چسپی کو سامعین کے دلوں سے کم ہٹاتا ہو۔ مزاج کی بھی گاہے گاہے ضرورت پڑ جاتی ہو۔ لیکن یہ اتنا ہی ہو جتنا کہ آٹے میں نمک۔ یہ اگر اپنی حد

سے بڑھ کر مذاق یا بد مذاقی تک پہنچ جائے تو بُرے نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

یہ تو وہی وہ حالت جس میں مقرر سامعین کے سامنے اکیلا کھڑا ہو جاتا ہو۔ لیکن مقرر کا موقف اس وقت نہایت نازک ہو جاتا ہے جب وہ بھرے مجمع میں ایک مخالف کے سامنے کھڑا ہوتا ہو۔ یہ اس کے لیے بہت زبردست امتحان گاہ ہو۔ لیکن یہاں بھی اگر وہ باہمت اور مستقل مزاج ہو، تو ایک آزمودہ کار جرنیل کی طرح خود پر ڈٹا رہتا ہو۔ سامعین کا رنگ غلاف ہو تو بھی وہ نہایت زیرکی سے اپنی دجاہت اور قوتِ لطف کو سام میں لاتا ہو۔ وہ مخالفت کی بات کہتا ہو لیکن خصمانہ انداز سے پرہیز کرتا ہو۔ اور بالآخر غالب آ جاتا ہو۔

سرئید کی تقاریر پر پدہ عام ہے۔ اسے | چنانچہ سرئید کی سوانح حیات اور بعض تقریروں میں خود

ان کی زبان سے مختلف داتا کہ سرئید کا مشاہدہ نہایت عمدہ تھا۔ قوم کی اصلاح کا کام شروع کرنے سے پہلے ایک عرصہ دراز تک، اس کی تباہی کے اسباب اور درستی کے ذرائع پر انھوں نے کامل غور اور مشاہدے سے کام لیا۔

پھر یہ دندہ دراز، سرئید کی تعلیم کے متعلق ایک اسکیم تیار کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ تربت جاوید میر، لکھنؤ، رائے نے، سرج یونیورسٹی کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام جہی و گلی حالات کو مشاہدہ کرتے ان پر فور کیا۔ اس طرف وہاں کے دوسرے اور حالات کا مشاہدہ کیا۔ پس یہی وجہ تھی کہ سرئید اپنی تقریر میں جو بات کہتے وہ عام طور پر مشاہدے اور عینی شہادت پر مبنی ہوتی تھی۔

محض مشاہدہ ہی ایک مقرر کے لیے ضروری نہیں ہے اس کے | ساتھ ساتھ مشاہدات سے متاثر ہونا بھی ضروری ہو۔ دُنیا

میں ہر شخص کی نظر سے کوئی نہ کوئی واقعہ گزرتا ہی رہتا ہو۔ ہر شخص ان واقعات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہی ہوتا ہے جس کی فطرت تجسس اور نتائج اخذ کرنے والی ہو۔ سرئید کا دل ملک و قوم کی پُر در پُر تباہیوں سے داغ دار ہو چکا تھا۔

”اُلی، واد آباد اور بمبور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی و بربادی دیکھ کر جس جوش کے ساتھ ہم دودی کی

لہران کے دل میں اُٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان عذر کی روغن میں آپکے اور جو خاندان بگڑ چکے ان کو مدد پہنچانی اب امکان سے خارج ہو مگر جو باقی ہیں اور جو ہندستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہو ان کو کسی طرح عذر کے آئندہ خوف ناک نتیجوں سے بچایا جائے گورنمنٹ تمام ہشمتان کے مسلمانوں سے بیگمان ہو گئی ہے۔“

دوسری چیز ایک مقرر کے لیے ہم نے مطالعہ بیان کیا سرستید کی تمام تقریریں کو دیکھنے سے ان کی وسیع معلومات اور مطالعے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے کثرت مطالعہ کی وجہ سے بہت زیادہ سادہ سادگی سے حیاتِ بادیہ میں حالی لکھتے ہیں کہ سرستید کے

”مطالعے کی عادت ابتدا سے ان کی رفیق رہی۔ سرستید کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع تھا۔ ان کی عبارت کا طوف اُٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ سب سے زیادہ خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔“

سرستید کی ہر قسم کی تقریروں مثلاً مذہبی، تعلیمی، تحقیقی و تنقیدی سب پر وسیع مطالعہ پایا جاتا اکثر جگہ وہ مختلف مصنفین کے اقتباسات لاتے ہیں۔ ان کی تقریروں میں ’سائنسکی اور تہذیب‘ اور ”رسم و رواج“ پر ہوں، اس قسم کی بیش تر مثالیں پائی جاتی ہیں جن کو ہم آہستہ آہستہ دیکھیں گے۔ سرستید نے گو تعلیم اعلیٰ پیمانے پر حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کے مطالعے نے ان کو تاریخ، فلسفہ، قدیم و جدید اور منطق وغیرہ سے اچھی واقفیت عطا کی تھی۔ چون کہ سرکاری ملازم تھے۔ منصفی کر چکے تھے اور کونسل کے ممبر بھی تھے اس لیے ان کو قانون اور سیاسیات سے بھی گہرا تعلق تھا۔ ادب قدیم و جدید کے متعلق وہ اعلیٰ قسم کی معلومات رکھتے تھے اس وجہ سے وہ اُردو زبان اور ادب کے سمارِ اول شمار کیے جاتے ہیں۔

ہماری بحثِ بالا میں تیسری چیز یہ تھی کہ مقرر کا دماغ ہر قسم کے مواد سے بھرا ہوا ہو۔ سرستید خود ایک بہت بڑے مفکر تھے۔ ان کے مطالعے نے ان میں ہمدردی پیدا کر دی۔ لوگ ان سے تبادلہٴ خیال کرتے۔ خود تصنیف و تالیف کی عادت نے بھی ان کے دماغ کو ہمہ قسم کے مواد سے پُر کر دیا تھا۔ یہ

کی مختلف قسم کی تقریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کس قدر ہمگیر واقع ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت ہر قسم کی تقریر کر سکتے تھے۔ ان کی اکثر تقریریں فی البدیہہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں نہایت جوش و خروش اور اصلیت پائی جاتی ہے۔ ان کے معلومات میں اتنی چٹنگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ خود تقریروں کو لکھ کر پڑھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اکثر فرمایا کرتے کہ لکھ کر پڑھنے سے طبیعت میں آمد باقی نہیں رہتی۔ وہ جس وقت جس قسم کی تقریر کرنے کھڑے ہوتے ان کے سامنے اس کا مواد فوراً آتا چلا جاتا تھا۔

بیرونی لوازمات کو بیان کرنے کے بعد سرسید کے ان داخلی صفات اور خوبیوں کو بیان کریں گے جو ان کو ایک بہترین مقرر بنانے میں ممدو معاون ثابت ہوئیں۔

سرسید کی سب سے بڑی صفت ان کی ضمیر کی باکی اور طبیعت کی نیکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود شدید مخالفتوں کے سرسید اپنے ہر مقصد میں کام یاب ہوئے۔ سرسید نے تقریباً ساٹھ برس پبلک زندگی میں بسر کیے۔ آخر زمانے میں ہر شخص ان کی عیب جوئی کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آجائے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے لیکن کسی کو ایسا موقع نہیں ملا جو ان کے کردار پر کوئی معقول گرفت کرتا، سوائے اس کے کہ ان کو کافرو ملحد کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا۔ اگر مقرر کا ضمیر صاف نہ ہو تو مجمع عام کے سامنے نہیں آسکتا۔ وہ شرمائے گا، جھجکے گا۔ مگر سرسید کی حالت یہ تھی کہ وہ مجمع کے سامنے ڈلے رہتے اور وہی چیز کہتے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی۔ گو مخالفین کی کثرت تھی لیکن مخالفت ان کے ضمیر کی طاقت کے مقابلے میں کم زور تھی۔ خود سرسید کا قول ہے۔

”ہر کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کرتے ہو یا کہتے ہو تمہارا دل اس کو سچ جانتا ہو یا نہیں۔

اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کائنات بلکہ خلاف ایمان داری کے کام کیا۔

بہ حیثیت مقرر سرسید کی آواز بھی نہایت موزوں تھی۔ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کی آواز سے سارے ہال گونج اٹھتا تھا اور ان کے جوش و خروش کے عالم کا کزل گریم نے یہ نقشہ دکھایا ہو :-

”جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی ہلکی تقریر مسٹر گلائیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہو۔ اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے

ہیں۔ آواز دردناک ہو جاتی ہو اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہو۔ اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔“

سرستید کی تمام تقریروں کا حال یہی تھا۔ بعض وقت خاص خاص تقریروں میں جوش و خروش اور آواز کی بلندی معمول سے زیادہ ہوا کرتی۔

”آواز کی گونج جس میں جوش کے وقت شیر کی سی گرج محسوس ہوتی تھی یہ دو بڑے معادن ان کے بیان کی تاثیر کے تھے۔“

جو حال ہم آج کل ہٹلر کے سامعین کا سنتے ہیں تقریباً یہی حالت مولانا حالی نے بھی ایک جگہ بیان کی ہے کہتے ہیں :-

”۲۹ دسمبر کو جو کچھ کہ سرستید نے راجا دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جہاں کئی ہزار کا مجمع تھا دیا اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکنتے کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو۔“

سرستید کے اخلاق بھی نہایت اعلیٰ و ارفع تھے۔ ان کے اخلاق کا اثر ہمیشہ ان کے ہم نشینوں اور مجلسوں پر پڑتا رہتا تھا۔ سرستید بڑے راست باز تھے۔ جب کبھی کوئی بات غلط سمجھائی ان کے کسی دوست سے سرزد ہوتی تو ان کو نہایت رنج ہوتا تھا۔ اور اکثر وہ اس کو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ہر کام خواہ قومی و مذہبی ہو یا سرکاری ملازمت کا ہو نہایت صداقت سے کیا کرتے اور زرا بھی جھوٹ اور عیار اور کو کسی معاملے میں پسند نہ کرتے۔ ان کا دل بھی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ عزیز و اقارب۔ رشتے دار، دوست یہاں تک کہ نوکروں سے بھی مہر و محبت سے پیش آتے۔ جس شخص کے قدم ان کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ ان سے جدا ہونا چاہتا تھا۔

”سیرجشی اور فرائض مولگی بھی سرستید کے خاص اوصاف میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا تو اپنی آسائش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کٹنے کی خبر گیری، مصحفوں کی لکھوائی۔

اولاد کی تعلیم ”مک۔ اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔“

سرستید میں انتقام کا بُرا جذبہ بھی نہ تھا۔ مخالفین نے انھیں خوب بُرا بھلا کہا مگر سید نے کبھی ان کی بُرائی کا بدلہ لینے کا خیال تک نہیں کیا۔

سرستید میں مذہبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام کو دُنیا کا سچا مذہب خیال کرتے تھے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان میں تعصب نام کو نہ تھا۔ وہ ہر قوم اور ہر فرقے اور ہر مذہب کے آدمی سے محبت اور خدمت سے پیش آتے تھے۔ وہ ہر وقت ہندو مسلمان کے اتحاد و خیر خواہی کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

سرستید کی شخصیت نہایت اعلیٰ قسم کی تھی۔ ان کے چہرے پر ایسا رعب و داب تھا کہ دہی تو دہی انگریزوں کو بھی ان کے سامنے آنے کا ہباؤ نہیں پڑتا تھا اور جب یہ لوگ انھیں دیکھتے تو نہایت ہیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے۔ حالی لکھتے ہیں :

”سرستید جب نیننی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ جس وقت جپان ہٹل میں بیٹا الگہ مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے ان کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سرستید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے ان کو برابر دیکھتے رہے۔“

کرنل گریم نے ان کے چہرے کو شیر بر سے مشابہ لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرستید طویل قامت اور قوی ہیکل آدمی تھے۔ ناک نقشہ درست اور جاذبِ نظر۔ وہ غفلت و وقار کی جتنی جاگتی تصویر تھے۔

”اگرچہ سرستید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عموں اور خداؤنا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریم غفلت کے وقت اس سے مسرت اور زندہ دل اور گرم جوشی ملکتی تھی۔“

سرستید کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرستید نے اپنی عمر میں کبھی کسی شخص کو رنجیدہ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کبھی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگائی۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق کے پرچوں میں انھوں نے جو بات لکھی نہایت نرمی اور سنجیدگی سے لکھی۔ انھوں نے اس دل آزار طریقے کو ترک کیا جو اس زمانے میں محادلوں اور مناظروں میں جاری تھا۔ ان کا روئے سخن

کسی شخص کی طرف نہیں ہوا کرتا۔ اس طرح وہ اپنی تمام تقریروں میں کسی وقت بھی لوگوں کے احساسات سے نہیں کھیلتے۔ وہ قوم کو اس کی بُری حالت پر بھی متنبہ کرتے تو دل سوزی کے پیرایے میں۔ ان کی باتیں اس قدر ہم دردانہ ہوا کرتیں کہ ہر فرقے اور ہر مذہب کا آدمی۔ کیا دوست کیا دشمن سب ہی کو اُن سے خلوص تھا۔ ظرافت اور خوش طبعی سر سید کی جبلت میں داخل تھی۔ تحریر تقریر یا بات چیت کسی وقت بھی کوئی لطیفہ یا شوخی سمجھ جاتی تو کہے بغیر نہیں رہتے تھے لیکن کوئی بات ایسی نہ کہتے جو تہذیب کی حد سے باہر ہو۔

## (۲) سر سید کی تقریروں کی عام زبان

اردو نثر کے جدید اسلوب کے بانی مبنی سر سید ہی تھے۔ قوم کی تعمیر و اصلاح میں جہاں انھوں نے اور بہت سے کام کیے وہاں قومی زبان کی درستی اور اس کو جدید طریقے پر استعمال کرنے کا سہرا بھی انھی کے سر ہے۔ ان کی شرکی قوت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ انیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سر حیس لائل نے لکھا ہے :-

”سر سید کی اردو جدید خیالات کی اشاعت کا آلہ ہے۔ اس سے انھوں نے اس وقت کام لیا جب کہ

نثر موجود نہ تھی اور اسے اس طرح بنایا اور نبھایا ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان کی تحریکات

نے اردو زبان میں نہایت اعلیٰ درجے کا لٹریچر پیدا کر دیا۔“

زبان کے متعلق وہ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے۔

خود سر سید کی گراں بہا تصانیف اور ان کا اسلوب بیان اردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ ہم

مولوی حالی کے اس خیال سے متفق ہیں کہ سر سید کو اگر فادر آف ای اردو لنیویج کہا جائے تو بہتر ہے۔

نیز وہ اردو کو ہندستان کی عام زبان قرار دیتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں :-

”میں نے جو ہر مقام پر ”اپنی زبان“ کے لفظ کا استعمال کیا ہے تو اپنی زبان سے میری مراد کیا ہے؟



میں ”اپنی زبان“ سے وہ مراد لیتا ہوں جو کسی ملک میں اس طرح پرستل ہو کہ ہر شخص اس کو سمجھتا ہو

اور وہ اس میں بات چیت کرتا ہو خواہ وہ اس ملک کی اصلی زبان ہو یا نہ ہو۔“

اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ اُردو زبان میں ہمہ قسم کے علوم و فنون منتقل ہوں۔ ان کی قائم کردہ ”سائنٹیفک سوسائٹی“ اس مقصد کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اُردو (دہند) اسی کی تئیں میں اس زمانے میں اشاعت اُردو کا کام کر رہے ہیں۔ اور اسی کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔

سرسید کو چل کہ ساری قوم کے سامنے اپنے نئے خیالات کا اظہار کر کے اس کو ہستی، جہالت اور نکتیت سے نکالنا تھا اس لیے انھوں نے پیرایہ بیان نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم اختیار کیا تھا۔ وہ جو کچھ بولتے وہی لکھتے اور جو کچھ لکھتے وہی بولتے تھے۔ اس لیے ہم کو ان کی تقریروں اور تحریروں کی زبان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ مولوی حالی فرماتے ہیں:-

”وہ (سرسید) ابتداً تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے۔“

سرسید کی زبان تصنع سے خالی اور عام فہم ہو۔ عالمانہ اور فلسفیانہ تعاریر میں بھی وہی سادگی اور پراکاری ہو۔ زبان کی روانی مثل ایک دریا کے ہو کہ کہیں نہیں ٹوکتی۔ بعض نقادوں کا خیال ہو کہ سرسید اس روانی میں الفاظ اور قواعد کی اتنی پابندی نہیں کرتے تھے لیکن یہ خیال غلط ہو۔ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہو۔ اگر کوئی شخص درست زبان اور درست الفاظ اور زبان کے قواعد نہ استعمال کرے تو اس کی تقریر روکی پچی کہلائے گی۔ سرسید کی تاثیر اور لذت گویائی کے کیا کہنے وہ اپنے جذبات اور خیالات کو صحیح زبان میں بلا روک ٹوک ظاہر کرتے تھے۔

گو سرسید سلیس اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن وہ ایسی نہیں کہ ہر جگہ روکی پچی ہو۔ کہیں کہیں ہلکی سی رنگ آمیزی بھی کر دیتے ہیں جو عجیب کلفت دیتی ہو وہ اکثر جگہ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ تشبیل اور اس کا طرز ادب و لولوں پر چوٹ کا کام کر جاتا ہو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”ہندستان ایک دولہن کے مانند ہو جس کی خوب صورت اور ریلی آنکھیں ہندو و مسلمان ہیں۔“

۲۔ ”میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے ادبنا اور سورج کی طرح چمکانا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج، چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جائیں۔“

ایک اور تمثیل اس طرح کی ملاحظہ ہو۔ خیال تو ایک ہی ہے لیکن زبان کا چٹخارا ایسا موجود ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

”میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصے کی جو نیلا نیلا سیاہ رُو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور مشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جس کے سبب سے اس سیاہ رُو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوب صورتی حاصل ہوئی ہو۔“ اس آخری ٹکڑے میں استعارہ بھی ہے تشبیہ بھی ہے اور رنگینی بھی۔ مگر موٹے اور منقطع الفاظ کہیں نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو سادگی یہی ہے۔

سرستید کی زبان بر محل اور بے ساختہ ہونے کے علاوہ بامحاورہ بھی ہے۔ زبان میں محاورے ہی سے جان پڑتی ہے۔ زبان کا صحیح ہونا اگ ہے اور بامحاورہ ہونا دوسری چیز ہے۔ ایک ہندوستانی بہتر سے بہتر اور صحیح انگریزی بولتا ہے لیکن پھر بھی ایک انگریز کی بامحاورہ زبان کو نہیں پاسکتا۔ زبان قاعدے و قواعد کے مطابق ہو لیکن اگر اس میں محاورہ نہ ہو تو وہ مادری زبان کس طرح کہلائے گی۔ غرض سرستید کی تقریروں کی زبان محاوروں کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم ان کے لکچروں سے جتنے مقامات نقل کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ سرستید زبان کو ٹھیک محاورے کے اسلوب پر استعمال کرتے تھے۔

۱۔ ”اے صاحبو! یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم بی۔ اے یا ایم۔ اے تک پڑھالیں گے اور وہ قابل بھی ہو جائیں گے۔ کھار کے آدے میں سے سب برتن پکے نہیں نکلتے۔“

۲۔ ”جو لوگ اپنی کوشش اعلیٰ درجے کی تعلیم پر متوجہ نہیں کرتے اور ادنیٰ درجے پر معروف کرتے ہیں وہ اعلیٰ لنگا بہاتے ہیں!“

۳۔ اس کلاس کے طالب علموں کی مثال بر لحاظ درجہ تعلیم کے اس بچے کے مانند ہو جس کے منہ سے ابھی دودھ کی بو نہ گئی ہو۔

۴۔ ”دہی مثل صادق آئی کہ ریت میں پانی ڈالا نہ آسمان کا رہا نہ زمین کا۔“

سرسید کی تقریروں میں کہیں کہیں مزاح اور اکثر جگہ طنز بھی پایا جاتا ہے۔ سرسید کے دل میں اتنا خلوص بھرا ہوا تھا کہ وہ کہہ تو جاتے تھے کڑوی بات لیکن لوگ اس کو امرت کی طرح قبول کرتے۔ ان کی خفگی میں دل سوزی پنہاں اور ان کی تنبیہ میں فائدہ مضمر تھا۔

”ہمارے مذہب کے ایک بوڑھے مولوی نے اپنی کتاب غلطان میں خوب کہا ہے ۵

حاجت بہ کلاہ برکی داشتقت نیست

درویش سفت باش و کلاہ تنزی دار۔“

”کیا اسلام ایسا ہے کہ ایک چیتھڑا چیر کر آگے ٹھکانے سے قائم رہتا ہو اور اگر اس میں ٹہن لگا دیے جائیں تو جاتا رہتا ہو۔“

”اس کی کھودی ہوئی بنیادیں قوم کا منہ نکلتی ہیں کہ کب ہمارا پیٹ بھر دیا جائے گا۔ اس کی ناتمام عمارتیں خدا سے دُعا کرتی ہیں کہ کب ہم کو پورا کرنے کی قوم کو توفیق دے گا۔ اس کے طالب علم چھتر میں اور درختوں کے سایے تلے نماز پڑھتے ہیں کہ ہماری قوم دنیا میں زندہ ہو یا خدا کے ہاں ہیں بی۔ وضو کے عوض منہ میں خاک بھری ہوئی ہو۔ قوم کا کوئی شخص اس کو پانی چلنے والا نہیں۔“

”رہیمہ فراہم کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کیوں کہ رُپڑ کی امداد کے بغیر اس کا پورا ہونا محالات سے تھا۔ اس لیے ہم نے دست گذاری ہر امیر و غریب کے سامنے دراز کیا اور اس عار کو اپنے پر گوارا کیا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ۵

بہ دست آہک تفتہ کردن خمیر بہ از دست در یوزہ پیش امیر

اے جناب صدر انجمن! ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپی گردن پر لیا۔ کالج کی تکمیل کے لیے .... نہیں نہیں۔ قوی ترقی کا سامان ہوتا کرنے کے لیے لائری ڈالی۔ جوا کھیلا اس پر بھی بس نہیں کیا اس شر پر عمل کیا ہے

ردِ سحر کی پیشہ کن و مطربی آموز

تا گنج زر از کبتر و ہتر بستانی

سوانگ بھرا، ایٹج پر کھڑے ہوئے۔ دوستوں نے فقیروں کا بھین بدلا۔ بدؤ بن کر اور میٹھا نفل میں داب کر خدا کے لیے مانگا۔ مگر قوم نے کچھ نہ سمجھا۔ اور مقصد پورا نہ ہوا۔“

غرض اس طرح کے بہت سے طنزیہ جملے یعنی امرت آمیز زہر کے گھوٹ ہر جگہ پلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں قوم کو ہر وقت ٹوکنے اور ہر انسان کی آنکھ کھولنے کی ضرورت تھی اس لیے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ الفاظ میں سرستید نے ہندی الفاظ سے جو اُردو زبان میں گھل مل چکے ہیں کبھی پرہیز نہیں کیا یہی رنگ مولانا حالی، نذیر احمد وغیرہ نے بھی اختیار کیا۔ عربی و فارسی الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ مگر ایسے نہیں کہ ادق اور ناقابلِ فہم ہوں۔ مذہبی اور خالص مسلمانوں کے جلسے میں عربی آیات اور مقولے کثرت سے لاتے ہیں۔ لودھیانہ میں ”قومی تعلیم ...“ اور جالندھر اور لاہور میں ”اسلام“ پر جو تقریریں انھوں نے کی ہیں ان میں آیاتِ قرآنی کی بھرمار ہے۔ گو ساتھ ان کے تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح سرستید فارسی اشعار بھی کبھی کبھی پڑھ جاتے ہیں۔ قرآن شریف کی آیات کا بار بار آجانا اس لیے فطری تھا کہ وہ ان دنوں قرآن کی تفسیر لکھ رہے تھے فارسی زبان کو بھی وہ نہایت عزیز رکھتے تھے اس کی شیرینی سے محفوظ ہوا کرتے تھے۔ اور یوں بھی ان کے زمانے میں فارسی اور عربی دانی ایک تعلیم یافتہ کے لیے لازم چیز تھی۔

بعض الفاظ یا الفاظ کی تذکیر و تائید کچھ ایسی ہے جو آج کل غالباً متروک ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

”بادِ جو کہ بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں لیکن عورات کی تعلیم کی

نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہمارے قدیم بزرگوں کے ہیں“

”اس وقت کی یادگاری ہیں“

معیار، غور اور اڈریس وغیرہ کو موثّق استعمال کیا ہو۔ اس کے علاوہ آدیں گے، جاویں گے، آؤں، جاؤں، مرجاؤے، کھا جاؤے اور بہت سے اس قسم کے الفاظ نظر آجاتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ فارسی عبارت اور قافیہ کسی قدر ثقیل طریقے پر لاتے ہیں مثلاً :-

”ان تمام واقعاتِ فاقی اور اموراتِ حالی اور حالاتِ وجدانی نے مجھ کو آمادہ کیا۔“

سرسید گو انگریزی زبان سے نادانق تھے لیکن وہ انگریزی الفاظ بے شمار استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی و علمی مصطلحات انگریزی بہت آئی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ ان الفاظ کے خیالات اہل ملک کے لیے انتہا درجہ جدید تھے اور ان کے ادا کرنے کے لیے جب تک کہ انگریزی الفاظ کو استعمال نہ کیا جاتا ان کا ادا ہونا نامکن معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں انگریزی کے الفاظ اگرچہ وہ نامائوس تھے مگر ان کے استعمال کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ورنہ اگر یہ مطالب ہماری زبان کے الفاظ کے ذریعے سے ادا ہو سکتے تو سرسید اور ان کا طبقہ سب سے پہلے اپنی زبان کے الفاظ استعمال کرتا۔ فرض کیجیے کہ ان کے لیے فارسی یا عربی کی اصطلاحات وضع کر کے استعمال کی جاتیں تو یہ طریقہ اس زمانے میں کارآمد نہ ہوتا۔ یہ لوگ حقیقت میں تنگ نظر بھی نہ تھے۔ چنانچہ سرسید کے معاصرین اور پیرو حالی، نذیر احمد وغیرہ انگریزی الفاظ اپنی تصانیف میں جا بے جا لکھ جاتے ہیں۔ آج کل لوگ سرسید یا حالی پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں انگریزی الفاظ کی افراط کو جائز رکھا ہو۔ اور اپنے اس اعتراض سے شاید یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں ان بزرگوں کے مقابلے میں اُردو زبان سے زیادہ محبت ہو لیکن حقیقت میں ایک دھوکا ہو جس میں یہ حضرات مبتلا ہو گئے ہیں۔ سرسید اور حالی سے زیادہ اُردو زبان اور اُس کے ادب سے کس کو محبت ہو سکتی ہو۔ ہم ذیل میں سرسید کے بعض ایسے اقتباسات درج کرتے ہیں جن میں انگریزی الفاظ کی بہتات ہو:-

”اس قوم کے آگے جو چیرمن کے آس پاس بیٹھی ہو اور جو بالکل سولینڈ اور جنٹلمین ہو“

”مگر ہندستان کے کالج اور ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل

نہیں کرتیں۔ ہم کو ہندستان کے کالجوں سے خواہ وہ گورنمنٹ کے کالج ہوں یا پرائیویٹ جو شکایت ہو وہ باقی ایجوکیشن کے نہ ہونے کی ہو۔“

”اُن کے خیالات ریڈیکل لوگوں کے سے تھے۔ اس وقت لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الکشن سے ممبر مقرر ہوں۔ اچھا، صاحبو! میں کنسر ویٹو نہیں ہوں میں بڑا لبرل ہوں۔“

ایک اور دل چسپ چیز یہ ہو کہ سرستید بعض وقت انگریزی اور اردو الفاظ کو باہم ترکیب دے کر استعمال کرتے ہیں مثلاً ”مکمل تعلیم، ذہن کاری گر، لٹری تعلیم، تین چیزیں، وغیرہ۔ ایک جگہ لفظ (Pronounce) سے اردو کے مرکب فعل کو بنایا ہو۔ مثلاً

”میں اس ریزولیوشن کو جس کو ہمارے معزز پریذیڈنٹ نے پروٹونس کیا ہو۔“

ایک اور دل چسپ مثال لیجیے :-

اول میں اپنے ملک کے یونیورسٹی کے طالب علموں کو گنوں گا کہ کس قدر طالب علم اے کورس میں تعلیم پاتے ہیں اور کس قدر بی کورس ہیں۔ اگر میرا اندازہ صحیح نہ ہو تو پانچ پرسنٹ سے زیادہ بی کورس میں پڑھنے والے نہ نکلیں گے اور اس کے مقابلے میں پچاڑے پرسنٹ اے کورس پڑھنے والے ہوں گے اور یہ نہایت روشن دلیل ہو کہ مکمل ایجوکیشن کی وائٹ ملک میں نہیں ہو۔“

انگریزی کے وہ الفاظ جو سرستید نے جا بجا اپنے کچھروں میں استعمال کیے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ایسے الفاظ تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اب استعمال نہیں ہوتے۔ دوسرے وہ جن کا اب ترجمہ ہو چکا ہو اور اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ان میں ہم ایسے طبقے کے الفاظ کو بھی رکھتے ہیں جن میں اصل اور ترجمہ دونوں یکساں طور پر مستعمل ہیں۔ تیسرے وہ جو بجنسہ بوسے جاتے ہیں اور اب تک ان کا ترجمہ نہیں ہوا ہو یا اگر ہوا ہو تو ابھی اتنا رائج نہیں ہوا ہو کہ اصل کی جگہ کام لینے لگیں۔ ذیل میں ہم تینوں قسم کے الفاظ درج کرتے ہیں :-

## (۱) متروک انگریزی الفاظ

(Vexation)	دیکسی نیشن	(Mutiny medal)	میوٹنی میڈل
(Mahommadan)	محمدن	(Self help)	سلف ہلپ
(English Language)	انگلش لینگویج	(Govt. aid.)	گورنمنٹ ایڈ
(Conscience)	کانشنس	(Polite old fashion)	پولائیٹ اولڈ فیشن
Word of God)	ورڈ آف گارڈ	Work of God)	ورک آف گاڈ
(Want)	وانٹ	(Unacquainted.)	ان اکوئینٹڈ
(Standing Committee)	اسٹانڈنگ کمیٹی	(Pronounce)	پرو نونس
(College expenses Fund)	کالج اکسپنڈز فنڈ	(Capital fund)	کیپٹل فنڈ
(Utility)	یوٹیلیٹی	(Endorsement)	انڈراسمنٹ
(Bone factor)	ہینی فیکٹر	(Cotton)	کائٹن
(European sense)	یورپین سینس	(Arithmetic)	اریتھمٹک
	(Lcgic)	لاجک	

## (۲) انگریزی الفاظ جن کی بجائے اب اُردو مرادف رائج ہو گئے ہیں

سولیزیشن، پریسیڈنٹ، جوڈیشل، پولیٹیکل، پبل کوڈ، ریمارک، ریزیزٹیشن، سوشل، لیمبیشن، مارل سائنس، ہائی ایجوکیشن، پرائیویٹ انسٹی ٹیوشن، کالج لائیف، کاپی رائٹ، سنزل، نیشنل، ایکٹ، ہیڈ کوارٹر، بلاگنگ، لیگل ایڈوائزر، ڈپارٹمنٹ، کلاسکل لینگویج، کلاسکس، لیٹن، گریک، آراین، اسٹاک، سیٹلک اسٹاک، سیکنڈ لینگویج، فیکٹری، گرامر، سبجکٹ، فیکٹری آف آرٹس، میٹنگ، فزکس، اسپشل سبجکٹ، پرسنٹ، سکشن، سلف رسپکٹ، میڈل، جانٹ سیکرٹری، پیٹرن -

## وہ انگریزی الفاظ جو اب تک مستعمل ہیں

ممبر، کمیٹی، پارلیمنٹ، گورنمنٹ، کلب، سوسائٹی، سینٹ ہاؤس، یونیورسٹی، کالج، پبلک، مشنری، آؤٹ، ایڈریس، مجسٹریٹ، مشنری اسکول، ہیڈ ماسٹر، فرنج، پالی، انٹرنس، کاليجیٹ، پرائمری، اپر پرائمری، ڈیوک، ارل، مائی لارڈ، کنزرویٹو، لبرل، ٹرسٹی، آرٹیکل، بجٹ، ٹیکس، فنڈ، بورڈنگ، یورے شیٹ، یوروپین پارٹی، یوروپین اسٹاف، لیڈز اینڈ جنٹلمین، ریسرچ، ڈکشنری، انجینئرنگ، فیکٹری، ڈرائنگ، فوٹو ٹائپ، فوٹو لیتھوگراف، فیننگ۔

## تفصیلی تبصرہ

”مجموعہ لکچرز سر سید“ جو ہمارے مقالے کا موضوع ہے اس کو ایک صاحب مولوی محمد امجد الدین گجراتی نے سر سید کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۱۷ء میں طبع کروایا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے سر سید مرحوم کے لکھنؤ کا صرف یہی ایک مجموعہ ایک ہی دفعہ شائع ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ مرتب نے ان لکھنؤ کو تاریخ دار ترتیب دیا ہے اور جیسا کہ کتاب کے سرورق پر درج ہے ان کا زمانہ ۱۸۶۳ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۸ء تک پہنچتا ہے۔

لکھنؤ کے مطالب پر بحث کرنے کی بنا پر ہم نے اپنے مقالے کے اوراق میں تاریخ کی ترتیب کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے ہم نے لکھنؤ کو ان کے عنوانوں کے لحاظ سے حصہ حصہ علیحدہ گروہ میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً سر سید نے تعلیم کے موضوع پر مختلف اوقات میں مختلف تقریریں کی ہیں۔ اس اعتبار سے اس ایک قسم کی تقاریر کی متعدد اور ایک دوسرے سے بعید تاریخیں ہیں مگر ہم نے تعلیم کے عنوان کے لکھنؤ کو ایک جگہ سمیٹ کر ان پر مسلسل بحث کی ہے۔ بڑی سہولت ہوگی کہ سر سید نے ایک ہی عنوان کے خیالات کو مختلف مواقع پر کس کس طرح پیش کیا ہے اور آیا وہ ہر جگہ اپنے نظریوں اور



لاویہ نگاہ پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ اگر قائم رہتے ہیں تو پھر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے اسے کہاں تک بھسایا ہو اور اگر قائم نہیں رہ سکے تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ غرض یہ طریقہ تقسیم سرستید کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ کو ایک ہی سلسلے میں جانچنے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

تقدیر کی یہ تقسیم محض ایک پیرایہ ہو جو سرستید کی قابلیتوں اور ان کے نقطہ خیال کے سمجھنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ درہ آن کی تمام تقریریں صرف ایک مقصد کی حامل ہیں وہ محض قوم کی بھلائی ہو۔ یہ قول مولوی حالی ’سرستید وفت کی ایک رائی کے سوا کوئی راگ نہیں جانتے تھے۔ اس مجموعے کی کوئی تقریر ایسی نہیں ہو جس میں انھوں نے قوم کے اذہار، قوم کی مغلسی، قوم کی چھاٹ اور تعلیمی پستی کا ذکر نہ کیا ہو۔ باوجود اس کے ہر تقریر اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو اور اپنے مطالبہ کے لحاظ سے اپنے عنوان کا اتباع کرتی ہو گو ان کی تقریر گوناگوں خیالات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتی تھی۔ ان کی تقریریں کالج کے فائز کی ان سفید تراشوں کی طرح ہیں جن کے ہلنے سے قوس قزح کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔

۱۔ ہماری اقسام کی تعداد سات ہو اور ہم نے ان میں سب سے پہلے سرستید کی قومی و مذہبی تقدیر کے مجموعے کو جگہ دی ہو۔ اس مجموعے میں اس بات کی تحقیق کریں گے کہ قومیت کا تخیل ان کے ذہن میں کیا تھا۔ قوم کے تعلق وہ کس قسم کے خیالات رکھتے تھے وغیرہ۔ قومی تقریروں میں مذہبی تقریروں کو ملا کر ایک کرنے کی یہ عرصہ یہ ہو کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہو سرستید نے قوم اور مذہب کو الگ الگ نہیں سمجھا تھا۔

۲۔ ہماری دوسری قسم تعلیمی ہو۔ قوم کی پستی اور منزل کا سب سے بڑا سبب سرستید نے قوم کی جہالت اور کم علمی گردانا تھا۔ پس اس ذلت سے قوم کو نکالنے کے لیے انھوں نے مسئلہ تعلیم پر زور دیا اور اس اہم موضوع پر تقدیر کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۳۔ قوم کی تعلیمی حالت سمجھنے کے بعد سرستید نے ان کی معاشری اور تمدنی حالت پر بھی نظر ڈالی اور اس کے اسقام رن کرنے کو اپنا فرض تصور کیا۔ چنانچہ قوم کی معاشرت پر بھی ان کی متعدد تقریریں موجود

۳۔ ہم نے ان کو ایک ضمن میں رکھا ہو اور یہ ہماری قسم ثالث ہو۔  
 ۴۔ تقاریر کا چوتھا گروہ علمی، تنقیدی اور تحقیقی مسائل سے متعلق ہو۔ سرستید نے قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان کی اصلاح کا فریضہ بھی اپنے دُستے لیا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع، ان کی تنقیدیں بڑی بلند پایہ اور ان کی تحقیق حیرت انگیز تھی۔  
 ۵۔ پانچویں قسم سیاسی تقریروں کی ہو۔ سرستید نے بہت کم سیاسی تقریریں کی ہیں۔ صرف دو تین تقریریں سیاسی ملتی ہیں جو محض شدید ضرورت کی بنا پر کی گئیں۔ دو ایک تو اس لیے کہ قوم کو ان کا سیاسی موقف بتلائیں اور اس کے سامنے ایک طریقہ کار پیش کریں۔ اور ایک آدھ تقریر کانگریس کی مخالفت میں ہو۔

۶۔ سیاسی تقاریر کے بعد ہی قانونی تقریروں کا نمبر آتا ہو۔ اور یہ تقریریں وہی ہیں جو انھوں نے کونسل میں کی تھیں۔

۷۔ سب سے آخر میں چند متفرق تقریریں درج ہیں۔ اس مجموعے میں خالص سرستید کی تقریریں نہیں ہیں بلکہ وہ ایڈریس بھی ہیں جنہیں اہل ملک نے سرستید کی خدمت میں پیش کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے جوابات بھی ہیں جو سرستید نے ادا کیے۔ ان ایڈریسوں میں قوم نے سرستید کی قومی خدمات کا اعتراف کیا ہو جس کو انھوں نے ہر جگہ قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی ہر وقت یہی کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہو وہ کسی ذاتی منفعت یا شہرت کی خاطر نہیں بلکہ صرف قوم کے فائدے کے لیے۔

## (۱) سرستید کی قومی و مذہبی تقریریں

قوم اور قومیت کے تخیل میں سرستید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہو ان سے قومیت کا تخیل یہ پایا جاتا ہو کہ اول تو انھوں نے تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم کے افراد شمار کیا ہو اور ”بنی آدم اعضاء یک دیگر اند“ کے قدیم مقولے کی تشریح کی

ہو۔ اس تخیل کے لیے ہمارے زمانے میں (Humanity) کا لفظ پایا جاتا ہو Humanity کی تعریف کو قوم کی تعریف کے برابر سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ سرستہ کی Humanity کی مثالیں درج ذیل ہیں :-

”ہندستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمانوں کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے لیے یہ قومیں اعضائے رئیسہ کے مانند ہیں۔ کسی نے کہا ہو کہ انسان کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کے دل کا خیال یعنی عقیدہ۔ یہ خدا کا حصہ ہو۔ دوسرا اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہم دلی یہ اس کے ابنائے جنس کا حصہ ہو۔ پس خدا کے حصے کو خدا پر چھوڑو اور جو تمہارا حصہ ہو اس سے مطلب رکھو“

”قوم سے میرا مطلب صرف مسلمان ہی نہیں ہو۔ میری رائے ہو کہ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں۔ اور میں قوم کی خصوصیات کے واسطے مذہب اور فرقے اور گروہ نہیں پسند کرتا۔ میں کالے سے کالے رنگ کے انسان اور گورے سے گورے رنگ کے انسان کو جو اعلیٰ درجے کی شائستگی میں زندگی گزار رہے ہیں اور وہ جو جنگلوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں سب کو اپنا بھائی اور ایک قوم تصور کرتا ہوں“

ہندستان کے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ سب ایک حقیقی قوم کے افراد ہیں اور یہ کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ کامل ہم دروی رکھنی چاہیے۔ اور ان کی فلاح و بہبود کا خواست گار ہونا چاہیے۔ انھوں نے (Pan-Islamism) (وحدتِ اسلامیہ) کی تشکیل کو پیش کیا ہو۔ اور اسلام کے اس قدیم خیال کو باہر جالائے ہیں جس کی بنا پر تمام دنیا کے مسلمان ایک واحد قوم کے تحت میں آتے ہیں۔ چنانچہ مثالیں ملاحظہ ہوں :-

”وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفرتِ قومی کو مٹایا، تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہو یا تاجیک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہو کہ عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہو یا مچین کا۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوا کہ ہندستان میں، وہ کالے رنگ کا ہو کہ گورے رنگ کا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ

## فصلہوا بین اخویکم وآلفی اللہ لعلکم ترحمٰن ۔

”ایک ایک شخص جو اسلام میں داخل ہو وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہو۔ جب تک کہ وہ اپنے عزیز مذہب کے پابند ہیں تب تک وہ قوم ہیں۔“

”اسلام کو قائم رکھنے سے ہماری قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا، وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔“

”اسلام کی رو سے قوم کا لفظ نسل کے متحد ہونے پر نہیں بولا جاتا بلکہ جس نے کلمہ پڑھا اور اسلام لایا گو وہ بہ اعتبار نسل کوئی ہو۔ سب ہمارے بھائی اور ہماری قوم میں داخل ہیں۔ اسلام کی رو سے اخوت اور اتحاد قومی صرف اسلام پر منحصر ہو۔“

سریتہ کے تخیل قومی کی تیسری شکل یہ ہو کہ وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ۱۰ ہندوؤں، ۱۰ مسلمان ہوں یا عیسائی سب کو ہندوستان کی ایک ہی قوم کے اجزا قرار دیتے ہیں مثلاً:-

”جس طرح ہندو آئے اسی طرح مسلمان بھی ہندوستان آئے اور آبلو ہوئے۔ ملک کی آب و ہوا کی وجہ سے دونوں کا خون ایک ہوا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوئیں، صورتیں ایک دوسرے کی مشابہ۔ مسلمانوں نے سیکڑوں ہندوؤں کی رسمیں لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی ہزاروں عادتیں لیں۔ یہ دونوں آپس میں بیٹیں یہاں تک کہ دونوں کے اختلاط کی وجہ سے ایک نئی زبان اُردو کا وجود عمل میں آیا۔“

”درحقیقت ہندوستان میں یہ دونوں بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔“

”تاریخوں میں دیکھا ہوگا کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہو۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں، ایران کے ایرانی، یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندو مسلمان ایک مذہبی لفظ ہو ورنہ ہندو، مسلمان، عیسائی اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔“

سریتہ کے قوم یا قومیت کے چوتھے تخیل کا تعلق خالص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں سے ہو۔ سریتہ کے زمانے میں بالخصوص ہندوستان کے مسلمان متعدد فرقوں میں منقسم تھے۔ اگرچہ فرستے آج کل بھی

موجود ہیں بلکہ آج کل تو ان کے زمانے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں جیسے فرقہ اہل قرآن یا قادیانی۔ مگر ان کے زمانے میں اس زمانے سے زیادہ فرقہ بندی کی گرفت مضبوط تھی۔ زرا زرا سی بات پر ایک دوسرے کی جان لینے تک میں دریغ نہ کرتے۔ ان کے زمانے میں فرقہ بندی کا بوجھ شدید احساس تھا اس نے مسلمانوں کو سخت گروہوں میں بانٹ رکھا تھا مثلاً مایوں کا فرقہ، حنفیوں کا اور سنہیوں میں درگاہ پرستوں کا اور اہل تشیع کی زبردست جماعت۔ غرض تمام تحریکات یک دوسرے کے خلاف بلند ہوا کرتی تھیں۔ سرستید ان تمام کو ایک دوسرے سے جکڑ دینا چاہتے تھے۔

**سرستید کا مذہبی تخیل** | سرستید مذہب پر یقین کامل رکھتے تھے وہ کہا کرتے کہ "مذہب انسان کے لیے بنایا گیا ہے اور اگر اس کو الٹ دو اور یوں کہو کہ

انسان مذہب کے لیے بنایا گیا ہے تو بھی متحد نتیجہ پیدا ہوتا ہے" مذہب کی سچائی کے متعلق وہ جس اصول کے پابند تھے وہ یہی تھا کہ مذہب سچا ہے جو فطرت کے موافق ہو۔ اسلام میں انھوں نے دیکھا "اسلام هو الفطرت والفطرت هو الاسلام" اور اس پر دل سے ایمان لائے۔ اسلام کی تعریف انھوں نے اس طرح کی کہ "خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا، نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین ہونا اسلام ہے اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے" یہی اسلام کا رکن اعظم ہے اور اسی کو توحید کہتے ہیں اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت تک یقین نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ذات و صفات اور اس کے مستحق عبادت پر پورا پورا یقین نہ ہو۔ وحدانیت کے بعد اعتراف نبوت اسلام کا دوسرا رکن ہے نبی جو خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اس پر ایمان لانا اور اس کو برحق جاننا بھی ضروری ہے کیوں کہ اس نے ہم کو توحید کی نعمت عطا کی ہے۔

وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے بعد نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ فرائض کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان فرائض کو سرستید اس حد تک قابل عمل سمجھتے تھے جہاں تک خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ "پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابع مادی کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے۔ جس کو نبی

شُرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں، ”گو سرستہ آئمہ اربعہ کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کے مقلدین نے ان کی تقلید میں اتنا جو غلو کیا اور جس کی وجہ سے اسلام میں تفریق پیدا ہو گئی ہو اور باہم عداوت، بغض اور کینے کی وسیع سیلج مائل ہو گئی اور اسلام کی قوت میں ضعف پیدا ہونے لگا تو سرستہ نے اسلامیان ہند کی اس خرابی اور کمزوری کو بخور دیکھا اور ان سے کہا وہ حقیقت میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گوؤں کہ بھائی سمجھنا ہی اسلام ہو۔“ مجتہدین اپنے عقلی اور نقلی دلائل سے خواہ کیسا ہی عمدہ نظریہ یا خیال پیش کریں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فطرت کے موافق ہو یا نہیں اس کے علاوہ ہمارے پاس قرآن ہو جو انسان کی سب سے اچھی رہبری کرتا ہو۔ سرستہ قرآن کا معجزہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی پیش کردہ ہدایتیں کا مقابلہ دنیا کی کوئی ہدایت نہیں کر سکتی۔ قرآن ہی ایک ایسا کلام ہو جس میں یہ صفت موجود ہو کہ ”ایک جاہل بدو یا مقلد مولوی اس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہو ویسا ہی ایک فلاسفر انہی الفاظ کے مقصود سے ایسی ہی ہدایت پاتا ہو اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفے سے برخلاف نہیں پاتا۔“

سرستہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مذہب کی انہی تقلید کرتے ہیں اور ایک مذہبی مسئلے کو اس لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی یا بڑے امام نے لکھا ہو۔ انھوں نے اسلام کے بڑے بڑے آئمہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں بعض کے اصول ایک دوسرے سے اس قدر متضاد تھے کہ ایک طرف کفر اور دوسری طرف اسلام تک پہنچاتے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں، ”ایک فرقہ خدا کی رویت کا قائل ہو۔ اہل سنت و الجماعت ہی کا ایک فرقہ خدا کے ہاتھ، پاؤ، آنکھ، ناک کا قائل ہو اور اس کے عرش پر متمکن ہونے کا یقین رکھتا ہو اور اس کو محسوس جانتا ہو۔ دوسرا گروہ اس کے برخلاف ہو اور اس کو کفر سمجھتا ہو۔ جب کہ قدیم سے اصولی مسائل میں قدیم علما نے اس قدر اختلاف کیا ہو تو میرا کیا گناہ ہو اگر میں ان قدیم علما کے مقرر کردہ مسائل سے اختلاف کروں۔ وہ بھی آخر انسان تھے اور معصوم اور محفوظ عن الخطا نہ تھے۔“ سرستہ قرآن کو دل سے معجزہ مانتے تھے اس لیے انھوں نے بغیر اس کا خیال کیے کہ وہ اگلوں کی مخالفت کر رہے ہیں یا علمائے زمانہ انھیں کفر کا فتویٰ دیں گے بے دھڑک ہو کر کہا کہ علما

کی فلسفیانہ کتابوں کو چھوڑو اور قرآن کو لو کیوں کہ قرآن اور اسلام دونوں یکساں انسان کی فطرت کے مطابق ہیں۔

۱۸۸۴ء میں ”اسلام کی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ حالت“ پر تقریر کرتے وقت سرستید نے اسلام کے شعلق جن سچے جذبات کو ظاہر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرستید کتنے سچے مسلمان تھے۔ کہتے ہیں کہ اسلام ”تمام دُنیا کے لیے روشنی تھا اور روشنی ہے اور روشنی رہے گا۔ ہر ایک مسلمان کے سینے میں دہی نور ہے۔ اس میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اختلاف فرق سے جو مذاہب اسلام میں دکھائی دیتے ہیں اس نور میں نقصان نہیں آتا۔ تھوڑی دیر کے لیے اسلام کے تمام فرقوں کا تصور کرو اور تمام باتوں یا مسلوں کو حذف کرتے جاؤ۔ حذف کرتے کرتے بہت کچھ رہ جائے گا۔ جس پر سب فرستے متحد ہوں گے پس دہی نور اسلام ہے جو باوصف اختلافات کے سب میں بلا نقصان کے منور ہے۔“

سرستید کہتے ہیں کہ جہاں تک نجاتِ عقبیٰ کا سوال ہے گزشتہ موجودہ اور آنے والے سب برابر ہیں لیکن جہاں تمدنی حالت پر غور کیا جاتا ہے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ موجودہ لوگ اپنے بزرگوں سے پیچھے ہیں۔ گزشتہ کے لوگوں نے اپنے تئیں مجسمِ نیکی بنا کر اسلام کو اس کی خوبیوں کو محترم کر دکھایا اور آج وہ ہماری قوم ہیں باعثِ افتخار ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے کے لوگ دنیاوی زندگی میں ذلیل و خوار ہو گئے ہیں جس سے اسلام کی بھی ذلت ہوتی ہے۔ غرض ہم کو دنیاوی حالت کے درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی دُنیا کو درست کرنا گویا دین کو درست کرنا ہے اور یہ جو کچھ کریں گے اپنے لیے نہیں بلکہ خدا اور اس کی رضا کے مطابق ہوگا۔ ”جو شخص خدا کی خوش نوازی چاہتا ہے، جو شخص ثوابِ آخرت کا طالب ہے۔ جو شخص بہشت میں اپنے لیے ایک موتی کا عمل بنانا چاہتا ہے۔ جو شخص قوم کے ساتھ ہم دردی کرنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ اپنی قوم کو اس ذلیل حالت سے نکلنے میں کوشش کرے۔“

سرستید نے انسان کے دو حصے قرار دیے ہیں۔ ایک حصہ خدا کا اور دوسرا اس کے اِنٹائے جنس کا۔ انسان کا دل اور اس کا اعتقاد خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ نہ بھائی اس میں شریک ہو نہ بیٹا۔ نہ دوست نہ آشنا۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر اس کی ذات تک محدود ہے کچھ تعلق نہ

رکھنا چاہیے۔ کسی شخص سے محض اس خیال کی بنا پر کہ وہ شیعہ ہو یا سنی، وہابی ہو یا بدعتی۔ کسی قسم کی عداوت اور دشمنی رکھنا عقل مندی کے خلاف ہو۔ بلکہ ہم کو چاہیے کہ ہم اس کو بھائی اور کھے کا شریک تصور کریں محض اس وجہ سے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کو برحق جانتا ہو اور ہم کو آپس میں خدا کا قائم کردہ وہ رشتہ اخوت برقرار رکھنا چاہیے جس میں اس نے ہم کو ہماری پیدائش کے وقت جوڑ دیا تھا۔

اس بیان سے سر سید کا مدعا صرف یہ تھا کہ عقائد کی دنیا سے علاوہ بھی ایک دنیا اور ہو۔ عقائد کو قائم رکھنا چاہیے یا اس میں ترمیم و اضافہ کیا جائے یہ ایک شخص کا شخصی فعل ہو۔ اور اس کا اثر اس کی ذات تک محدود رہتا ہو۔ لیکن اغراض قوی عقائد سے الگ چیز نہیں ہیں۔ ان میں اتحاد و اشتراک کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہو تاکہ پوری قوم ایک نطق پر جمع ہو کر قوی مقاصد اور بین الاسلامی فرائض کو انجام دے سکے۔ ہمارے نزدیک پان اسلام زم کا تخیل جو آج کل بہت کچھ روشن اور نمایاں ہو چکا ہو وہ سر سید کے ذہن میں بہت پہلے آچکا تھا اور یہ وہی مسئلہ ہو جسے قدیم اسلام میں لوگوں نے اخوت اسلامی سے تعبیر کیا تھا۔

## (۲) سر سید کی تعلیمی تقریریں

قومی تعلیم کا تخیل | اگر قومی تعلیم کچھ ہو سکتی ہو تو ایک قوم کے ادب اور تاریخ سے ہو سکتی ہو۔ ادب قوم کے معاشری حالات اور تمدنی کیفیات کو ظاہر کرتا ہو اور تاریخ اس کے اعمال کا صحیفہ ہو یعنی اس کے عروج و زوال کے وجوہات اور اس کے مد و جزر کے اسباب ظاہر کرتی ہو۔

قومی تعلیم کا تعلق قوم کے مذہب سے بھی بہت گہرا ہوتا ہو۔ مذہب ہی قوم میں ایک خاص قسم کی روح پھونکتا ہو۔ وہ اس کی تمام زندگی میں اس کی رہبری کرتا ہو۔ ہماری تاریخ یا کردار کے اوراق کا آغاز مذہبی تعلیم سے ہوتا ہو۔

سر سید کے نظریہ تعلیم میں یہ جملہ منظر موجود تھے مگر ان کو بڑی دشواری دہی تھی۔ وہ یہ کہ



ان کی قوم تعلیم کے نئے نظام سے آگاہ نہ تھی۔ اسکول اور کالج کا جدید نظام انگریزوں کے ساتھ ہندستان میں آیا اور یہاں کے لوگ ایک بیک اس کی ترکیب و شکل کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس کے علاوہ سرسید ہندستان کے اس قدیم تعلیمی تخیل کو مسلمانوں کے دماغ سے نکالنا چاہتے تھے جو ان کے انحطاط اور زوال کا باعث بن چکا تھا چنانچہ وہ خود ان زمانے کے تعلیمی حالات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

”امیروں کے لڑکوں کو پڑھنے لکھنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ بھی لکھنے پڑھنے کو کوئی عمدہ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ بجز سپاہی پیشہ ہونے کے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ معدودے چند تاجران تھے جن کے ہاں مثل اور پیشوں کے پڑھنے لکھنے کا پیشہ ہوتا آتا تھا۔ وہ لوگ محتاج حالبوں کو اپنے ہاں جمع کر کے پڑھاتے تھے اور امرا ان کو محتاج سمجھ کر ان کے مدرسے کو یا خانقاہوں میں جہاں یہ جمع ہوتے کچھ روپیہ بطور خیرات کے دے کر ثواب کا سامان کرتے۔ اس کے سوا ہمارے ہاں قومی تعلیم کا کبھی تخیل نہیں پیدا ہوا۔“

سرسید مسلمانوں کی پستی اور ناکبت کا بڑا سبب ان کی جہالت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک قوم زبورِ علم سے آراستہ اور پیادہ نہ ہو جائے وہ دنیا کی اور نرقی یافتہ قوموں کے صف بہ صف نہیں کھڑی ہو سکتی اور بہ حالتِ موجودہ قوم کو بجز تعلیمی ترقی کے کسی اور چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ غرض جب سرسید نے اس نکتے کو سمجھ لیا تو انھوں نے اپنی ساری زندگی تعلیم کے لیے وقف کر دی۔ قوم کی تعلیم کے عمدہ سامان مہیا کرنے کے لیے وہ سب سے پہلے یورپ گئے اور وہاں کے قومی اداروں کا بغور مطالعہ کر کے ہندستان کے لیے ایک خاکہ تیار کر کے لائے۔ سرسید نے اس خصوص میں زیادہ تر مغربی نظریہ تعلیم کو دلیل راہ بنایا کیوں کہ وہ انھی اصول اور نقوش پر چل کر اپنی قوم کو ان کے مقابل کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی کا جو نقشہ تعلیم ہو وہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کا چربہ ہو۔ یہاں تک کہ کالج کی عاریتیں بھی اسی نمونے پر تیار کی گئی ہیں۔ جب اس کی یہ قہی کہ سرسید کے لیے وہی ایک مکمل اور بنا بنایا نظام تعلیم تھا جو فوری ضرورت کے وقت ہاتھ آگیا۔

سرسید کے زمانے میں گو ہندستان میں سرکاری مدرسے اور اعلیٰ تعلیم گاہیں موجود تھیں لیکن سرسید سمجھتے

تھے کہ :-

”گورنمنٹ ہماری مذہبی تعلیم کی پوری طاقت کفیل نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ہندستان میں مختلف مذاہب رہتے

ہیں۔ ہر مذہب کے لیے خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ یہ واضح رہے کہ

اس کے علاوہ سرستہ کا یہ خیال تھا کہ

”گورنمنٹ کے مدرس اور کالجوں میں ہمارے پوسٹ کوٹ نہ بن سکے اور اسپرٹ کے مرپے کا اندیشہ ہو اس

سے ہم نے اپنے قومی مدرسوں کی ضرورت محسوس کی۔“

چنانچہ مغربی ممالک میں بھی جتنی قومی یونیورسٹیاں ہیں، دیکھی گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد یا کمک حاصل کرنا

پس نہ نہیں کرتیں کیوں کہ گورنمنٹ کی امداد ان کے تمام کر دینی ہو اور آزادی خیال اور آزادی عمل بانی

نہیں رہ سکتی۔

تعلیم کا تنجیل | قدامت کے پیش نظر علم کا منت پاب رہا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علم ایک شکر معنی

نہیں۔ اور حوالہ دیتے ہیں کہ اس سے نفس کو حظ اور روح کو تازگی پہنچتی ہے۔

مگر سرستہ نے یہ نہیں مانا۔ عاصیہ کا قبویم جہاں علم اور اصلی علم ان کے نزدیک نہ تھا۔ بلکہ

تجربے میں سے درس سنان۔ بلکہ کاموں میں رہا تھا۔

یہ نہ ہو کہ سرستہ علم کو جمع پونجی سمجھتا تھا۔ بلکہ علم کو ایک فن سمجھتا تھا۔

علم کے ہر حصے میں داخل ہو کر عذوب قومی صبر کرنا اور دنیا میں ممتاز رہیں۔ وہ ادنیٰ تعلیم ہی پر

اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کے ماننے تھے۔

”جب تک اعلیٰ درجے کی تعلیم ملک میں موجود نہیں ہو، تو درجے کی تعلیم کا پھینکا ناممکن ہو۔“

کے کسی حصہ ملک کی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ بدولت اعلیٰ درجے کی تعلیم کے شائع کیے ادنیٰ

درجے کی تعلیم پھیلی ہو۔ قدرت کا قاعدہ ہو کہ ”علیٰ علیٰ کی پیروی کرتا ہو کبھی اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی نہیں

کرتا۔“

ملک میں معدودے چند کا اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینا بہتر ہو بہ نسبت اس کے کہ گروہ درگروہ علم سے شذیب

واقف ہو جائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ قوم کے لیے معید اور اس کے لیے باسیب انتخاب ثابت ہوتے ہیں

اس لیے

”چھوٹے اسکول ادنیٰ تعلیم کے لیے قائم کرنا پیاسی اور بھوکی قوم کو صرف ردی دینی ہو۔ قوم کو نہایت ٹھنڈے پانی یعنی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہو جب اس کا بندوبست نہ کریں تو لازماً قوم پیاس کے مارے مر جائے گی۔“

انسان کی اعلیٰ تعلیمی حالت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور کسی ایک میں کامل ہو۔ اکثر لوگ اعلیٰ تعلیم کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ بی۔ اے یا ایم۔ اے پاس کر لیں اور نوکری کریں لیکن یہ غلط ہو۔ اعلیٰ تعلیم ہماری نظروں میں وسعت پیدا کرتی ہو۔ اعلیٰ تعلیم آج کل دُنیا کے ہر کام کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہو مثلاً تجارت فی زمانہ اعلیٰ تعلیم کے بغیر بے کار ہو۔ اسی کی بدولت تجارت کو آج وہ رُتبہ حاصل ہو گیا کہ اس کی حیثیت بین الاقوامی ہو گئی ہو۔ جہالت اور کم علمی کی وجہ سے ہندوستانوں نے تجارت کو محض اس قدر سمجھ رکھا ہو کہ کچھ مال خریدیں اور نفع سے بچیں۔ اسی طرح زراعت بھی اعلیٰ تعلیم کی محتاج ہو۔ زمانہ سلف کے لوگ اپنی قدیم دگر پر چل رہے ہیں لیکن علم کی دُنیا میں جدید آلات کی مدد سے غلے کی پیداوار اس قدر بڑھ گئی ہو کہ ہزاروں لاکھوں رُپے کا غلہ ایک ٹنک سے دوسرے ملک میں جاتا ہو اور اس طرح دُنیا کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہو۔

سرستید ہندوستان کے باشندوں کی ترقی کے لیے مشرقی علوم پر مغربی علوم کو ترجیح دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مغربی علوم اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ اب وہی تمدن کی ترقی کا ذریعہ ہو گئے ہیں۔ ہندوستانوں کو چاہیے کہ وہ تمام اجنبی قوموں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کر لیں۔ علم تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہو کہ اگلے زمانے کی قوموں نے بھی تحقیقات اور واقفیت کے لیے ترقی یافتہ اجنبی قوموں کے علوم کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔

قدیم یونانیوں نے فینیقیوں اور مصریوں سے علم حاصل کیا۔ مسلمانوں نے بہت سے علوم یونانی زبان سے اخذ کیے۔ خلیفہ منصور نے یونانی زبان کے مترجموں کو بڑے بڑے انعام دیے۔ خلیفہ مامون نے روم و یونان اور مصر سے یونانی کتابیں منگوا کر اپنی زبان میں ترجمہ کرائیں۔ اہل فرنگ گیارھویں صدی

میں اسپین گئے اور عربی سیکھ کر بہت سی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ روس میں ترقی علوم کے لیے سب سے پہلے پیٹر اعظم نے اجنبی مصنفوں کی عمدہ تصنیفات کے ترجمے کروا کے چھپوائے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہو کہ سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی انہی خیالات کی پیداوار تھی۔ انہوں نے بہت سی انگریزی کی بڑی بڑی اور عمدہ کتابیں ’اُردو‘ میں ترجمہ کرائیں۔ انگریزی علوم کو جو انہوں نے لائق ترجیح سمجھا اس کی وجوہات انہی کی زبان سے سنئے :-

” ترکی و عرب و فارس ہماری طرح ذلت و خواری میں پڑے ہوئے ہیں۔ افریقہ ہمیشہ دھنسی رہا۔ مصر اگلے زمانے میں سب سے پہلے نامور تھا اب وہ کچھ کر رہا ہو لیکن وہ ہماری دسترس سے باہر ہو۔ ہماری سرحد کی توہیں برما، بھوٹان اور افغانستان کی توہیں جاہلی محض ہیں۔ اب علم و مہر اور قومی شائستگی کی ترقی کا دار مدار یورپ اور امریکہ پر ہو۔ امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ انگلستان کے علم کے خزانوں پر ہماری دسترس ممکن ہو۔ اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

ہندستان میں انگریزی زبان کی اشاعت عام کا سہرا سرسید کے سر ہو۔ ورنہ سرسید سے پہلے ہندستان میں انگریزی زبان سے ہندو خاص کر بنگالی واقف ہوئے تھے۔ وہ انگریزی زبان کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ ہماری حاکم قوم کی زبان ہو۔ دنیا کی ہر حکومت میں سرکاری زبان دھج امتیاز رہتی ہو۔ خلافت بنی عباسیہ اور امیہ اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک عربی زبان دُنیلے اسلام میں عروج پذیر تھی۔ ترکوں اور مغلوں کے زمانے میں ہندستان میں فارسی زبان کی ترویج ہوئی کیوں کہ فارسی درباری زبان تھی۔ اور تمام کاروبار فارسی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ زمانہ موجودہ میں انگریز ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ تمام علوم و فنون انگریزی میں منتقل ہو گئے ہیں۔ سرکاری اور کاروباری زبان انگریزی قرار پائی ہو۔ ایسی صورت میں ہم کو انگریزی زبان کے سوا چارہ نہیں ہو۔

سرسید اپنی قوم کو انگریزی کے ساتھ ساتھ دُنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانیں، جرمن، فرانسیسی، عربی، فارسی وغیرہ کو حاصل کرنے کی بھی ہدایت کرتے ہیں کیوں کہ یہ زبانیں اعلیٰ قسم کے ادب کے علاوہ بے شمار علوم و فنون سے مالا مال ہیں۔ جرمن زبان اور فرانسیسی میں مغرب کے نئے علوم مدون ہو رہے ہیں۔ عربی زبان

قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی زبان سے ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کی زبان ہو اور یہ قطعاً علمی زبان کے دائرے سے خارج نہیں کی جاسکتی۔ اگر مذہبی خدمت کا بھی لحاظ ہو تو انگریزی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو۔ اسی طرح وہ کہا کرنے سے نہ

”فارسی کو بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے بس کا تعلق بہت کچھ مسلمانوں کی تربیت اور مذاق کے ساتھ ہو گیا ہو اور

وہ فی نفسہ خود بھی نہایت لطیف و با مذاق، زبان و ادب مسلمانوں کے علوم اور تواریح کا اس قدر سرمایہ

اس میں موجود ہے جس سے مسلمان قطع نظر نہیں کر سکتے۔

سریتہ نے مغربی علوم اور انگریزی زبان کو رائج کرنے کی کوشش میں اپنی ساری عمر صرف مذہبی تعلیم | کر دی۔ لیکن انھوں نے مذہبی تعلیم کو بھی خاموش نہیں کیا۔ نہ تھیوریوں، نہ اس خیال کو ظاہر کیا ہو کہ

”مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ درجے کی یا وسط درجے کی یا اعلیٰ درجے کی، ہم یہ فرض ہی کیوں کر

مختلف اقوام کو جس پرزے ایک بزم بنادیا ہے، وہ صرف اسلام ہو اگر ہم اس کی فکر نہ رکھیں تو قوت

نام نہیں رکھ سکتے۔ ہم سے ہم یہ کہ مسلمانوں کو ضروری عقائد مذہبی اور احکام مذہبی کی تعلیم دیں جس

کہ ہم نے ادنیٰ تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔“

سریتہ کو انگریزی خوان حضرات سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ دن بہ دن مذہب سے دُوری اختیار کرتے

جارہے ہیں اور اتحاد اور زندگی کی تاریک گھاٹوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وہ علما سے ہر وقت خطاب

کر کے کہا کرتے کہ جن طرح ہمارے بزرگوں نے خلافت عباسیہ اور امتیہ میں فلسفہ یونان کی ٹوڑ پر علم

کلام ایجاد کیا اسی عرب موبودہ علما کا بھی فرض ہو کہ وہ ان علوم جدیدہ کی روشنی میں جن سے مسلمان نوجوانوں

کے مذہبی عقائد خراب ہونے کا اندیشہ ہو کوئی ایسا علم ایجاد کریں۔ ان سے ان کی رہبری ہو اور مذہب کی

روگردانی سے بچیں اور دوسری طرف نوجوانوں میں سے ایسے شخص کے پیدا کرنے کی سعی کریں۔

”جو انگریزی لٹچر میں کامل ہو اور وہ ایسی کتابیں انگریزی میں تصنیف کرے جو باعتبار عمدگی ادب لٹچر

اور خوبی مضامین کے مدرسوں اور کالجوں کے درس میں داخل کرنے کے لائق ہوں۔ بالفعل ہم کو

بمجبوری دہی کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں جو انگریزوں نے لکھی ہیں جن کے مصنف متعصب و غیر متعصب سب قسم کے ہیں۔ باوجود اس کے کہ کورس کے انتخاب میں احتیاط برتی جاتی ہو کوئی نہ کوئی صوفی یا فخریہ ایسا نکل آتا ہو جس کو مسلمان مذہب اسلام کی نسبت حملے یا مذہب کی اہانت سمجھتے ہیں۔

مذہبی تعلیم کے انہی سخت طرف دار ہوئے۔ کے باوجود سرستید مذہبی ادیان اور تعصبات کو بھی مسلمانوں میں سے ڈنٹا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ مذہبی تعلیم کے ضمن میں انھوں نے ہر وقت اس بات کی کوشش کی کہ نئی نئی فوجد متعصب قسم کی نہ ہو بلکہ ایسی ہو کہ تحقیق و تفتیش سے کام لے۔ اچھی چیزوں کو اختیار کرے اور بُری چیزوں کو ترک۔

**تعلیم نسواں** | سرستید نے مردوں کو جہاں جدید علوم اور انگریزی طریقہ تعلیم کی طرف مائل کیا وہاں وہ عورتوں کی تعلیم کے لیے مغربی اصول ناپسند کرتے تھے اور تعلیم نسواں کے متعلق سرستید کے وہی خیالات تھے جو ہمارے قدیم بزرگوں کے چلے آتے ہیں۔ ان کو خیال نہ تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندستان کی موجودہ حالت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ سرستید کا عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مردوں کی تعلیم کو عورتوں کے مقابلے میں افضل سمجھتے تھے اور اپنے اس خیال کی تائید میں کہتے تھے کہ ”اس وقت ہم تمام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ سب مرد لائق ہو جاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں جب تک درجہ : ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔“

ان کے نزدیک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مردوں ہی کو عورتوں کا ذریعہ تعلیم تصور کرتے تھے یعنی یہ کہ عورتیں مردوں ہی کے ہاتھ سے تعلیم پاسکتیں اور استانیات بھی اسی صورت میں بہم پہنچ سکتی ہیں۔ جب خلائی عالم نے عورت اور مرد کو عالم وجود میں بھیجا تو اس نے ہر دو صنف کے مختلف کام تفویض کیے۔ مرد جنگ و جدال کرتا ہو۔ عورت امن و آشتی قائم کرتی ہو۔ مرد ملکوں کو فتح کرتا ہو اور اس پر حکومت کرنے کے لیے عورت اس کا ساتھ دیتی ہو۔ مرد خود کے لیے اور اس کے لیے

سماش پیدا کرنے گھر کے باہر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتا ہو اور عورت گھر میں اس کے جسم و روح کا آرام بہم پہنچاتی ہو۔ ان متغائر کاموں کی بنا پر یہ کیسے ممکن ہو کہ عورت کو وہی تعلیم دی جائے جو مرد کی ہو اور اس کے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے اور ایک ایسی تربیت دی جائے جو اس کی اپنی فطرت کے برخلاف ہو۔ سرستید فرماتے ہیں :-

”میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ سکھانے، الجبرا اور ٹرگنارٹری کے قواعد

بتانے اور احمد شاہ اور مرہٹوں اور روہیلوں کی لڑائیوں کے قصے پڑھانے سے کیا منجہ ہو“

اور یہ درست ہے۔ عورت کو یہ ضرور جاننا چاہیے کہ افریقہ اور امریکہ دنیا کے قطعہ ارضی ہیں لیکن اس کو یہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت کہ افریقہ اور امریکہ کے طول بلد اور عرض بلد کیا ہیں۔ بلاشبہ وہ الوالعزم بادشاہوں سے واقف رہے لیکن اس کو اس سے کیا مطلب کہ کون سی لڑائی کب لڑی گئی۔

عورت نیکی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی فطرت اور رجحان کا تقاضا یہی ہو کہ اس کو تعلیم وہی دی جائے جس سے اس کے

”دل میں نیکی اور خداترسی، رحم اور محبت اور اخلاق پیدا ہوں اور یہی تعلیم اس کے دین اور دنیا

دونوں کی بھلائی کے لیے کافی ہو“

اسی خیال کی بنا پر سرستید مسلمان عورتوں کے لیے اسی تعلیم اور تربیت کے قائل تھے جو ان کے خاندان کی عورتوں اور دلی میں عام طور پر رائج تھی۔ تعلیم نسواں پر لاہور میں جو تقریر انھوں نے کی تھی اس میں نہایت تفصیل سے بتایا ہو کہ کس طرح ان کے خاندان کی لڑکیاں کسی ایک آسودہ گھر میں جس ہوا کرتیں اور اس گھر کی بزرگ عورتیں خود یا ان کی نگرانی میں نوکر استائیاں ان لڑکیوں کو تعلیم دیا کرتیں۔ یہ بزرگ عورتیں : صرف ان کی ضرورت کے نائق تعلیم دیا کرتیں بلکہ ان کی تربیت کا ذمہ بھی لیتیں اور ان کو گھریلو زندگی اور سلیقے سے بھی اچھی طرح واقف کراتیں۔

سرستید عورتوں کی تعلیم کے لیے وہی کتابیں پسند کرتے تھے جو مذہب سے متعلق ہیں اور ان کا

خیال تھا کہ

”جو علوم اس زمانے میں عورتوں کے لیے مفید تھے وہی اس زمانے میں بھی مفید ہیں اور وہ علوم صرف دینیات اور اخلاق کے تھے۔ اس زمانے کی لڑکیاں قرآن شریف پڑھتی تھیں۔ اس کا ترجمہ پڑھتی تھیں۔ نماز روزے کے مسائل کی کتابیں پڑھتی تھیں۔ جس نے زیادہ تعلیم میں ترقی کی اور فارسی سیکھ لی اس کو قصص الانبیاء اور حکایات اولیاء اور اسی قسم کی اخلاق کی کتابیں اور بعض حکایات ثنوی مولانا روم کی پڑھائی جاتی تھیں۔

سرستید نے تعلیم کے ساتھ تربیت کو کبھی علاحدہ نہیں کیا۔ تربیت کے بغیر محض تعلیم

**تربیت** | کو ایک بے قاعدہ چیز خیال کرتے تھے۔

”یونیورسٹی کی تعلیم ایسی ہو کہ ایک ان گھڑ پتھر کو لے کر مورت کے ڈول میں بناوے مگر اس پر پالش یا چمک دمک چاہتے ہیں جس سے لوگ اس کو پسند کریں یا اس کے خواہاں ہوں تو وہ صرف تربیت سے ہوتی ہو۔“

سرستید کے پڑے تعلیمی کاموں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرستید نے مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا بیڑا اٹھایا تھا جہاں تک ذہنی اور دینی اصلاح۔ تلقینِ تہادہ علوم جدیدہ اور انگریزی تعلیم کو مناسب تصور کرتے تھے اور جہاں تک اخلاقی درستگی کی نسبت تھی وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان بچے گروہ درگروہ ایک جگہ جمع ہو کر قومی تعلیم حاصل کریں تاکہ ان میں قومی اسپرٹ پیدا ہو۔ مسلمانوں کی تربیت میں سرستید نے بہت سی چیزیں داخل کی تھیں۔ سب سے پہلے ان کا یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں میں قومیت قائم رہے جس کے لیے انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دینی چاہیے۔ عقائد مذہبی سکھائیں اور ممکنہ طور پر مذہب کا پابند بنائیں۔ مسلمانوں کو اخوتِ اسلامی کا درس دیں اور اس طرح ان سب کو ایک رشتے میں جوڑیں کہ ان میں قومی ہم دردی کا جذبہ پیدا کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہو جب کہ وہ ایک جگہ رہیں، ایک جگہ پڑھیں لکھیں اور ایک ہی جگہ کھیلیں کوادیں۔ تاکہ ان میں زندہ دلی قائم رہے اور ان کی امنگیں اور حوصلے بڑھیں۔ سب سے ضروری چیز مسلمان بچوں میں ان کے اخلاق کی درستگی ہو۔ تربیت اس قسم کی ہو کہ ان میں نیکی، راست بازی، سچائی اور انسانی ہم دردی



کا جذبہ پیدا ہو۔ سرسید بچوں کی تربیت کے لیے نصیحت سے زیادہ عمدہ ماحول کو پسند کرتے تھے چنانچہ ان کا قول ہے:-

”اس مقصد کے لیے ہم کو نصیحت سے زیادہ ان کے لیے ایسے اسباب پیدا کرنے ہیں اور ان کے لیے ایسے بزرگ و نیک بزرگوں کا جمع کرنا ہو جن کے سبب سے اور جن کی صحبت سے ان کی طبیعت نیک اور نیک دلی کی طرف مائل ہو اور گویا اخلاقِ حمیدہ ان کی طبیعتِ ثانی ہو جائے۔“

سرسید بچوں کے اس ادب کے مخالف تھے کہ

”لڑکا اپنے بزرگوں کے ڈر کے مارے سچی بات زبان سے نکال نہ سکے۔ ٹھک ٹھک کے ہلا ضرورتِ سلام پہ سلام کرے۔“

اس قسم کے ادب سے بچوں کا دلی جوش مرجاتا ہو۔ ان کی جرات، دلیری اور شرافت کھوجاتی ہو۔ تربیتِ بُری باتوں سے بچنے کی ہونی چاہیے نہ کہ اندرونی قوی کے مارنے کی۔

سرسید ہر وقت اس بات کی کوشش کرتے کہ بچوں میں سچی آزادی کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کھانے پینے، رہنے پہنے، لکھنے پڑھنے غرض ہر جگہ آزاد رہیں لیکن سرسید اس آزادی کے خلاف تھے جو کالج کے لڑکے حکومت کے خلاف بغاوت میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

”یہ نوجوان انگریزی زبان، ایک ہندی کی گرہ پا کر پٹاری ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ پائٹیکس کے اصول سے واقف ہیں اور نہ اس پر غور کیا ہو۔ نہ دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف ہیں نہ ان کو کبھی دیکھا ہو۔ اور بے سرد پابا توں اور گورنمنٹ کی نکتہ چینی میں سرگرم ہو گئے ہیں۔“

ہماری رائے میں سرسید کا یہ نظریہ ان کے زمانے میں بھی درست تھا اور اب بھی معقول ہو۔ سرسید کے زمانے میں ایک وجہ تو یہ تھی کہ سماجوں میں کوئی اعلیٰ قسم کی سیاسی جماعت نہ تھی جو اس وقت کے نوآموز و نوجوانوں کی صحیح رہبری کرتی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو بجائے اس کے کہ کسی سیاسی خلفشار میں مبتلا کیا جائے پہلے ان کو متحدہ کرنے کی ضرورت تھی۔

# ”اُردو کے نشوونما میں میرٹھ کا حصہ“

(از جناب حسن یحییٰ صاحب عندلیب ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی میگز)



غدر سے قبل شہر میرٹھ نے اُردو کے نشو و ارتقا میں کیا حصہ لیا اور اس سرزمین نے کیا کیا جواہر ریزے اُگلے مرورِ آیام نے آج ہماری نظروں سے اوجھل کر دیے ہیں۔ سرِ دست اس مضمون میں ہم غدر کے بعد کے عہد سے بحث کریں گے، لیکن اگر زمانے کی کشمکش نے فرصت دی تو کیا عجب ہو کہ یہ خاک سار وہ اُن مول موتی بھی پردہِ خفا سے باہر لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر سکے جن کی چمک دمک دیکھنے سے فی الحال ہم کئی طور پر قاصر ہیں۔

عیسائی مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا اور حکومتِ مدراس نے سلاسل میں ویبری ہانڈیچری مشن کو پریس کے استعمال کی اجازت دی۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھل گیا اور یہاں سے ڈاکٹر گل کرائسٹ اور اُن کے دوسرے رفقاء کار کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اس کے بعد ہندستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات نکھنے لگے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا اخبار علامہ آزاد کے والد ماجد مرزا محمد باقر کی ادارت میں دہلی سے سنہ ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا، اور پھر مختلف مقامات سے اُردو میں اخبارات شائع ہونے لگے۔ میرٹھ سے بھی پہلی مرتبہ ایک اخبار جامِ جہاں ناسخ ہونا شروع ہوا جس کا ذکر اخبار کوہ نور لاہور کی جلد سلسلہ میں حوالے کے طور پر موجود ہو۔

سلسلہ میں منشی محمد وجاہت علی خاں کے زیرِ ادارت ایک ہفتے وار اخبار عالم نکلا۔ اس زمانے

سلسلہ یہ مضمون انجمن ترقی اُردو (میرٹھ) کے جلسہ منعقدہ ہر اپریل سنہ ۱۹۷۷ء میں پڑھا گیا تھا۔

میں ایڈیٹر ہتمم کہلاتا تھا اور اکثر و پیش تر وہی مالک بھی ہوتا تھا۔ اخبار عالم کی خصوصیت یہ تھی کہ میرٹھ کی مقامی خبریں نظم میں درج ہوتی تھیں۔ مقامی خبروں کے علاوہ مختلف علمی، ادبی اور سماجی مباحث پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مثلاً ۱۹۶۵ء کی ایک اشاعت میں ”تعلیم عورت“ پر ایک مضمون درج ہو۔ نمونے کے طور پر ایک آدھ فقرہ اس مضمون سے اقتباس کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

”از روئے شرع شریف و دھرم شاستر کے پڑھنا لکھنا عورتوں کا جائز ہے بلکہ مذہب اسلام میں جیسا پڑھنا لکھنا مردوں پر فرض ہے اسی قدر عورتوں کو ہے۔“

یہ اخبار عرصہ دراز تک جاری رہا۔ عمدہ اور بڑے سائز کے کاغذ پر چھپتا تھا۔ منشی محمد وجاہت علی خاں کی وفات کے بعد سلیم مقرب حسین صاحب اس کو نکالتے رہے۔

تیسرا اخبار میرٹھ سے نجم الاخبار کے نام سے ۱۹۶۷ء میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی محمد حیات مرحوم تھے۔

۱۹۶۷ء میں سید جمیل الدین ہجر نے لارنس گزٹ جاری کیا۔ ہجر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑے لائق ایڈیٹروں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے یہ اخبار لارڈ لارنس کے نام پر جاری کیا تھا۔ نمونہ حسب ذیل ہے:-

”نوساری کی پاری درتوں میں دفعتاً شہرت ہوئی کہ بمبئی سے کن کا کتا ہوا سوت آیا ہے جس سے پاک ڈورا جینو کا پارسیوں کے لیے تیار ہوگا۔ یہ سُنتے ہی تمام عورتیں غضب ناک ہو کر اول برجورجی نوروزجی سردار قوم پاری کے پاس جا کر فریادی ہوئیں کہ سوت جو کل سے تیار ہو کر آیا ہے اس سے ہماری سواگری کو نقصان پہنچے گا۔“

لکھا ہے کہ جب سردار مذکور سے اور پاری دستور سے حسبِ مشا جواب نہ ملا تو وہ عورتیں زنانہ اسکول میں گھس آئیں جہاں انھوں نے استادوں اور شاگردوں کو ڈرایا۔ انجام کار رفع نزاع کی نظر سے وہ سوت جو اوصاف پونڈ تھا ان بجاہر عورتوں کے حوالے کر دیا جسے انھوں نے وہیں تار تار کر دیا اور اسکول سے اپنی

سے دستِ یہ قبسات وہ ہیں جو پندت برج مہن دتاریہ کیتی دہوی کے مضمون ”اردو اخبار“ شائع شدہ رسالہ ”اردو“ بابت اپریل ۱۹۷۷ء سے نقل کیے گئے ہیں۔

لوگوں کو جن کی تعداد تین تھی، اٹھا کر لے گئیں۔“ (مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۵۷ء)

۱۸۵۷ء میں مولوی احمد حسن شوکت (مجدد السنہ مشرقیہ) نے شمعہ ہند ایک ہفتے وار اخبار جاری کیا جو ۱۸۵۹ء تک برابر نکلتا رہا۔ اس میں علمی، ادبی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے اور مقامی و ملکی خبریں چھپتی تھیں۔

اسی زمانے میں حضرت بیان و یزدانی نے رسالہ لسان الملک نکالا۔ یہ رسالہ مامہوار شائع ہوتا تھا اور غزلوں کے علاوہ نثر کے مضامین جو ادبی اور سیاسی مباحث کے متعلق ہوتے تھے چھاپے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بیان مرحوم نے ایک ہفتے وار اخبار جاری کیا اور طوطی ہند اس کا نام رکھا جو ۱۸۹۴ء تک جاری رہا۔ اس میں علمی ادبی سیاسی سب طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ ملکی اور مقامی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ جناب بیان میرٹھ پہنچ کے نام سے بہ طور ضمیمے کے چند صفحات ہر ماہ اپنے اس اخبار میں شامل کرتے تھے جس میں اپنے معاصرین پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو گالی گلوچ تک لوبت پہنچ جاتی تھی۔ طوطی ہند میں وقتاً فوقتاً داغ، امیر، مولوی نذیر احمد اور دوسرے مشاہیر کی غزلیں اور نظمیں چھپتی رہتی تھیں۔ حضرت بیان کے بعد یہ اخبار سید سجاد حسین ریکانی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور آخر میں مولانا شوکت (مجدد السنہ مشرقیہ) نے اس کو خرید لیا اور وہ اسے نکالتے رہے۔ قریب قریب انہی دنوں ایک اخبار امیر ہند جاری ہوا۔ طوطی ہند کا نمونہ ذیل میں ہدیہ ناظرین ہو :-

## آنریبل سرسید بہ القابہ اور سفر پنجاب

”اس پیرائے سالی میں، اس گرمی کے زمانے میں، اس ضعیفی میں اور ایسے زمانے میں کہ پسر جان کا دلغ سرسید کے جگر پر بیٹھا ہوا ہو، آج کل میں آپ سفر پنجاب سے اپنے خالص احباب اور دوستوں اور حواریوں کے اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں :-

بہ سفر رفتنت مبارک باد بہ سلامت روی و باز آئی

پنجاب میں طبقہ اراکین و عمائدین میں آنریبل سرسید کا بڑا رونق ہو اور ان کی لیاقت اور عزت کا سکھ ان کے قلب پر جا ہوا ہو۔ ہر چند مخالف جوانب دکھائے جاتے ہیں جن میں چند سے کا دیا جانا زیادہ محمود ہو،

تاہم اُس قدرتی انفلوئنس سے جو کمزیل سرسید نے بر قلبِ خود زندہ دلائل پنجاب پر حاصل کیا ہو اس سفر کا نتیجہ کامیابی کی خبر دیتا ہو۔ سرسید ابالیاں پنجاب کے لیے زندہ دل کی صفت ضرور استعمال کرتے ہیں اگر کسی نے مصطلحات و درستہ یا بہارِ علم غشی ٹیک چند کو دیکھا ہو وہ اس کے معنی سمجھ سکتا ہو اور ہم کو کسی قدر حیرت ہو، اسنے کی ترقی، علوم مختلفہ کے رواج اور طبیعت کی آزادی اور تیزی نے باشندگان پنجاب کو اس لفظ کے معنی نہیں سمجھائے۔ کیا اور ممالک کے باشندے سب مردہ دل ہیں؟ کیا زندہ دلی یعنی تسخیر و حماقت و طرافت صرف اصحاب پنجاب ہی میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہو؟ کسی صحبت میں جب کہ تعریفوں کی بھرمار سے سرسید کو اس سفر نے ہمت نہ تو خوں تصویر خوشی بنا دیا ہو، اس زندہ دلی کے معنی بھی ان سے پوچھنے چاہیے۔ ہم کو حیرت ہو کیوں اس لفظ کا کمتر و سکرز استعمال کیا جاتا ہو۔ اگر حقیقتاً پنجاب دلسے اس سے خوش ہوتے ہیں ہم بھی سرسید کی تقلید میں اپنے اخبار کے خیرداران پنجاب کی ہر طباق پر زندہ دل لکھو، دیا کریں جس سے اُن کی طبیعت خوش ہو جایا کرے۔

زندگی زندہ دلی کا ہو نام مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

پنجاب کی آب و ہوا مٹھن کالج کے لیے موافق پائی جاتی ہو۔ وہاں کے طالب علم بھی کالج میں زیادہ ہیں۔ وہاں کے لوگ سرسید کے عقائد پر چنداں نکتہ چینی نہیں کرتے اور اگر کوئی بگڑا ہوا... نکتہ چینی کرتا ہو تو زمانہ اس کو خود مسل دیتا ہو۔ دراصل خود سرسید بھی تو پنجابی ہیں۔ اُن کے دعوے پنجاب پر، اور پنجاب کے اُن پر لاریب درست ہیں، یعنی کشمیر سرحد پنجاب اور دہلی انتہائے پنجاب داخل صوبہ پنجاب...۔۔۔۔۔ (ماخوذ از اخبار طوطی ہند مطبوعہ ۸ مارچ ۱۹۷۷ء)

ایک اور اقتباس طوطی ہند کی جلد ۱۹۷۷ء سے نقل کیا جاتا ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مرزا غالب کی سادہ نثر کے باوجود مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرزِ انشا ہی کو تقلید کے لیے نمونہ رکھا جاتا تھا:-

## ”علی گڑھ کی نمائش اور مسٹر ہرلین

منظور تھی یہ شکل مجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ کے ظہور کی علی گڑھ کی نمائش کیا ہو، عرض متبرک بیش بہا ہو۔ نمائش کی نمائش، تماشے کا تماشا۔ سمان اللہ صل علی و ماشا علی گڑھ کی نمائش ہو یا ظلم کدہ ناز فرط انبساط سے ہر غنچہ دل مثل گل باز۔ سامانِ طرب کو بہ کو۔ نغمہ سنجی مطربان جادو لود و حسن فروشان نازک ادا چارسو۔ رونق، شان، سامان، انظام

سب بے نظیر، بے مثل، بے انتہا۔ لاکھ نامائش ہو کہ سرسرمجودۂ انبساط و شادمانی۔ نہ کہیں حسرت نہ پیشانی۔ عالی شان رؤسا کے گرد غٹ غٹ۔ جو ارشاد کیجیے اس کی تعمیل جھٹ پٹ..... نمائش کیا ہو سامانِ بلا کا نمونہ اور رخسارِ عیش کا گل گوند۔ خال رخ عروسِ بہار۔ جمالِ پیمانِ گلِ حذر۔ آرزوئے عشاق، تماشا کے مشتاق..... وغیرہ“

۱۹۷۱ء میں احمد حسین صاحب نے ایک اخبار مذاق جاری کیا جس کی عبارت ظریفانہ ہوتی تھی گویا اخبار مذکور اسمِ باسمی تھا۔

۱۹۷۲ء میں شیخ حبیب احمد کے زیرِ ادا رت اخبارِ پولیس نیوز کا اجرا ہوا۔ اس میں محکمہ پولیس کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور پولیس کے ملازمین ہی زیادہ تر اس کو پڑھتے تھے۔

حضرت شوکت (مجددِ السنۃ مشرقیہ) نے ایک رسالہ پروانہ اسی زمانے کے قریب نکالا جو عرصے تک جاری رہا۔ اس میں فارسی اور اُردو کے مشکل اشعار کی شرح درج ہوتی تھی۔ کہیں کہیں حضرت مجددِ نامِ فارسی اور اُردو شعرا کے اشعار پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ چنانچہ خاقانی، نظیری، غنی، غالب، اور مومن جیسے اساتذہ بھی اُن کے سیفِ قلم کے زخم خوردہ ہیں۔

۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۴ء میں خواجہ غلام اشغلیں بی۔ اے، ایل ایل۔ بی دکیل میرٹھ نے ایک ماہواری رسالہ بہ نام عصرِ جدید نکالنا شروع کیا جو تقریباً ۴۴ صفحات کے حجم پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس کے اجرا کا مقصد اصلاحِ تمدن تھا۔ چنانچہ اکثر و بیش تر مضامین اسی موضوع پر نکلتے تھے۔ علمی اور ادبی مضامین بہت کم جگہ پاتے تھے۔ جس زمانے میں خواجہ صاحب مرحوم میرٹھ چھوڑ کر لکھنؤ میں وکالت کرنے لگے یہ رسالہ وہاں سے بھی بہ دستور شائع ہوتا رہا۔ اڈیٹر کی عبارت کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہو:-

ایک بدنامی مثال کے تحت میں لکھتے ہیں :-

”حال ہی میں ایک نہایت لائق اور نیک نفس قلعہ دارِ اودھ نے جو دیگر لحاظ سے امرا کے لیے نمونہ ہیں انھوں نے بھی اپنی غیر ضروری رہم گدی نشینی میں ایک لاکھ سے زیادہ اور دو لاکھ سے کم رُپے خرچ کر دیا۔ ہم کو یقین ہو کہ راجا صاحب معاف فرمائیں گے اگر ہم بہ ادب عرض کریں کہ مسلمانوں کی اس خستہ حالت میں، قحط کے زمانے میں، رؤسا کی مقروضی کی حالت میں یہ خرچ ذرا غیر ضروری تھا۔

جب اسے تعلیم یافتہ روشن فہم رؤسا قائم نہ کریں تو کس سے امید ہو سکتی ہو ۵  
ہر غنچہ بہ شگفتہ الا دل من اے والدی من ! اے والدی من

دوسری جگہ ”بے بھیگی کا الزام“ کے تحت میں رقم طراز ہیں :-

”بعض اخبار نویس بغیر واقعات کو تحقیق کیے الزام دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کج ہمارے پاس ریاض الاخبار مورخ یکم فروری ۱۹۵۷ء موصول ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ شمس العلماء مولانا حالی نے اپنے مسدس کا خیال نہ کیا اور درخواستیں دے کر شعرا کے زمرے میں حیدر آباد گئے۔ یہ خیال محض غلط ہے۔ مولانا کا تعلق حیدر آباد سے سترہ اٹھارہ برس سے ہے اور ان کو بہ ذریعے مراسلہ دتار، سرکاری طور پر طلب کیا گیا تھا۔ باوجود علالت محض اس وجہ سے کہ ریاست کے احسان ان پر ہیں وہ تشریف لے گئے۔ نہ انھوں نے درخواست دی، نہ شعرا میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ ان کے احباب نے زور دیا کہ حضور نظام کے جلسہ جولائی میں جانے سے پہلوتہی کسی طرح مناسب نہیں۔ مولانا نے اس کو منظور کیا۔ بھلا اس واقعہ اور ریاض الاخبار کے متذکرہ واقعے میں کتنا فرق ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ ہمارا معاصر اس بیان کی تردید کر دے گا۔“

غالباً ۱۹۱۵ء میں جناب شعیب احمد ندرت نے ایک ماہانہ رسالہ عندلیب نامی جاری کیا۔ اس رسالے میں علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ نظمیں اور غزلیں بھی درج کی جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں مولانا ندرت کے برادر بزرگ جناب عزیز احمد رفعت نے ایک پرچہ ناصر الاخبار نکالا۔ چوں کہ یہ پرچہ تصوف کے متعلق تھا اس لیے صوفیا کے حلقے میں کافی مقبول تھا۔ نگارہ بھی جو ایک ماہواری علمی و ادبی مجلہ تھا اسی عہد میں جاری ہوا۔ اس کے مالک عبد الحمید حمید تھے۔

۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں دو رسالے طالب دیدار اور جلوہ یار کے نام سے شائع ہوئے۔ اول الفکر کو شمس الدین شمس نکالتے تھے اور دوسرے کو شریف خاں صاحب، لیکن دونوں پرچوں کی حیثیت غزلوں کے گُل دستوں سے زیادہ نہیں تھی۔ غزلوں کے علاوہ نثر کے مضامین ان میں بالکل نہ پھپھتے تھے۔

مولوی ابو رحمت حسن نے النظیر کے نام سے ایک پرچہ ۱۹۱۵ء میں نکالا۔ اس میں صرف مذہبی

مناظروں کے متعلق مضامین درج ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں اخبار پھرتی کا اجرا ہوا جو آج سے دو تین سال پہلے تک میرٹھ سے برابر نکلتا رہا۔ یہ اخبار قوم چھتری کا تھا۔ چار پانچ برس بعد ۱۹۲۳ء میں مولانا جوہر بریلوی نے ملت نامی ایک اخبار جاری کیا۔ اسی زمانے میں بیرہندو کے نام سے ایک اخبار نکالا گیا لیکن یہ پرچہ آج کل کے اخبار پرتاپ لاہور کی طرح نہایت متعصب اور دریدہ دہن تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ گولٹ اور قوم اخبار جاری ہوا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ گولٹ ماہواری نکلتا تھا۔ اور اس میں محض ڈسٹرکٹ بورڈ کے جلسوں کی رویداد ہوتی تھی۔ قوم کے اڈیٹر آں جہانی پنڈت پیارے لال شرما ایم اے ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ میرٹھ و سابق وزیر تعلیم صوبہ متحدہ تھے۔ اس میں مقامی و ملکی سب خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ادارے میں جناب سید محمد یحییٰ میرٹھی، پنڈت گوپی ناتھ سنہا اور مولانا ندرت وغیرہ کام کر چکے ہیں۔ پنڈت پیارے لال شرما کے بعد کچھ عرصے ایک شخص سمنی انبا پرشاد متوطن مظفرنگر بھی قوم کو شائع کرتے رہے ہیں۔ بقول مولانا ندرت باعتبار زبان اور بہ لحاظ لب و لہجہ میرٹھ سے نکلنے والے اردو کے ہندو اخبارات میں یہ اخبار سب سے بہتر تھا۔

۱۹۲۳ء ہی میں مولانا ندرت نے اپنے اخبار آئینہ کا اجرا کیا۔ یہ اخبار آج تک جاری ہو اور اپنے مقررہ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ اس میں علاوہ ملکی و غیر ملکی اور میرٹھ کی مقامی خبروں کے مختلف انجمنوں کی رویدادیں شائع ہوتی ہیں۔ حضرت ندرت اور دوسرے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں تحلیل نامی ایک ہفتے وار اخبار یہاں سے نکلتا تھا۔ شروع میں یہ اخبار بجنور سے شائع ہوا تھا لیکن بعد میں اس کا دفتر میرٹھ منتقل کر دیا گیا۔ یہ اخبار باتصویر تھا۔ تحلیل کا قیام میرٹھ میں بہت تھوڑے عرصے رہا ہے۔ بعد میں یہ اخبار دہلی سے نکالا جائے لگا۔ قیام میرٹھ کے زمانے میں جناب حامد اللہ انسر میرٹھی بھی اس کے ادارے میں رہ چکے ہیں۔

۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں حور میرٹھی نے عورتوں کا ایک ماہ نامہ خاتون مشرق کے نام سے نکالا۔ اس میں زیادہ تر عورتوں کے مضامین چھپتے تھے۔ ۱۹۳۲ء سے قاضی محی الدین مینو اخبار چنچل نکال رہے ہیں۔ یہ باتصویر پرچہ ہے اور ہفتے وار شائع ہوتا ہے۔ اس میں مقامی خبریں، افسانے، ترجے اور سینما



کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے حالاتِ زندگی سب چھپتے رہتے ہیں۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں حضرت ساغر میرٹھ آئے اور ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ایک علمی، ادبی اور سیاسی ماہ نامہ ایشیا کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس کو سماہی کر دیا گیا لیکن ۱۹۳۷ء میں پھر ماہ داری کر دیا گیا۔ اپنے صوری اوصاف کے علاوہ باعتبار مضامین بھی یہ رسالہ ملک کے عمدہ پرچوں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ ایشیا کج تک بہ دستور جاری ہو لیکن حال ہی میں ساغر صاحب نے اس کو پونا سے نکلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایشیا کے ساتھ ہی ایک پرچہ پیانہ کے نام سے حضرت ساغر کی نگرانی میں ان کے چھوٹے بھائی اسدیار خاں نکالتے تھے۔ یہ چھوٹی تقطیع کا پرچہ تھا جس کی اشاعت پچھلے دو تین سال سے بند ہے۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں جناب پنڈت گوپی ناتھ سنہا بی۔ اے، ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ میرٹھ نے اپنا اخبار آفتاب نامی جاری کیا۔ اس ہفتے وار اخبار میں مقامی خبریں درج کی جاتی تھیں۔ میرٹھ میونسپل بورڈ کے اجلاس کی رودادیں وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں۔ سنہا صاحب مقامی کوائف پر نہایت عمدہ تبصرہ کرتے تھے۔ طرزِ تحریر ان کا کافی دل کش ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے پیشے کی مصروفیتوں اور دیگر چند وجوہ سے یہ اخبار جلد بند ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء ہی میں کام دار المدنی نے رفیق نامی ایک ادبی رسالہ شائع کیا لیکن اس کے دو تین نمبر ہی نکلے ہوں گے کہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں حامدیار خاں تبتم نظامی نے اپنے اخبار دورِ جدید کا دفتر جھانسی سے میرٹھ منتقل کیا اور یہاں سے اس پندرہ روزہ اخبار کو شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اخبار ہندوستان کی ریاستوں کی خبریں دیتا تھا۔ کبھی کوئی افسانہ یا ادبی مضمون بھی درج ہو جاتا تھا۔ شعرا کی نظمیں اور غزلیں بھی چھپتی تھیں۔

پچھلے چند برس سے انجمن اصلاح المسلمین میرٹھ اپنا ایک ماہ داری رسالہ اصلاح نامی شائع کر رہی ہے۔ اس رسالے کا مقصد سیاسیاتِ حاضرہ سے علیحدہ رہ کر مسلمانوں کی مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ چنانچہ بعض نہایت مفید اور اہم مضامین مختلف موضوع پر چھپتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دو ایک سال سے جناب عقیل ہمدانی ایک رسالہ عرفان شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ بھی پیش تر

نذہبی مضامین درج کرتا ہو۔ کبھی ایک آدھ نظم بھی شائع ہو جاتی ہو۔ اس کے علاوہ ایک اخبار خادم کے نام سے لال کرتی بازار سے شائع ہوتا ہو۔

یہاں تک اخبارات و رسائل کا ذکر کیا گیا لیکن میرٹھ کی سرزمین سے اُٹھنے والے شعرا کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ صنفِ نظم میں یہاں سے کافی بالکمال ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سرفہرست حکیم مولابخش قلیق کا نام نامی نظر آتا ہو۔ آپ حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور جیسا کہ ان کے دیوان کے دیباچہ نگار نے تحریر کیا ہو، ان پر حضرت مومن کی خاص توجہ تھی۔ قلیق نے رنگ مومن کچھ ایسا اپنا لیا ہو کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ شعر قلیق کا ہو، پڑھنے والا برابر مومن ہی کا سمجھتا رہے گا۔ اسی وجہ سے استاد اور شاگرد کے کلام میں امتیاز کرنا بہت دشوار ہو۔ ترکیبوں کی برجستگی، نازک خیالی، مضمون آفرینی، شوخی اور ندرت آپ کے کلام کا خاص وصف ہو۔ کلام مشکل نہیں لیکن بعض مقامات پر اشعار داغ پر زور دیے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ مولانا حالی اُن کے متعلق رقم طراز ہیں :-

”درد اندک فرصتِ سخن ایشان برنق خامہ استادِ خویش کمال پختگی پیدا کردہ ہر جا کہ بزمِ مشاعرہ انعقاد می یافت

با استادان دیگر ہم طرح شدہ داو غزل سرای می دادند و حاضرین تعجب بر تعجب و حیرت بالائے حیرت می افزودند۔“

چند شعر سنیں :-

(نازک خیالی) ناکامیوں سے رہتا ہو ناکام، کام یاب رکھتا ہو حسرتوں کو دل بے خبر عزیز  
(شوخی) ہر اک سے اب وہ کہتے ہیں کہ لوہم پر یہ مرنے ہیں جییں گے اس طرح کب تک کہ غیرت آہی جاتی ہو  
(غالب کے انداز میں) اے چہنخ! تو نے کیا نہ کیا پر نہیں کیا رُسوائے بزمِ ناز کسی نازنیں کے ساتھ  
نالہ کیا نہیں کہ وہ بے اختیار ہیں بے اعتباریوں کے بڑے اعتبار ہیں  
قلیق کے بعد ہماری نظر حکیم فصیح الدین رنج پر پڑتی ہو۔ حکیم صاحب موصوف کا شمار اہلبالے بالکمال میں ہو۔ طب کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی کافی ذوق رکھتے تھے۔ بہارستانِ ناز جو شاعرات کا تذکرہ ہو، آپ سے یادگار ہو۔ علاوہ ازیں اردو غزلوں کا ایک دیوان بھی شائع ہو چکا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ آپ خاصا اچھا شاعر کہہ لیتے تھے۔ اندازِ سخن وہی داغ کا ہو جو ہر شاعر پر اس زمانے میں چھایا ہوا تھا۔

ذیل کے چند شعر میرے اس دعوے کی دلیل ہیں ۔

لگائے رکھے گا پہلو سے رنج کو اپنے      کہ آشنا بھی ہو شاعر بھی ہو طبیب بھی ہو  
سر مرا کاٹ کے پچھتاوے گا !      جھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا ؟  
مجھ سے کہتے ہو کہ جا، جاتا ہوں      پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

اسی دور کی یادگار مولانا فرقانی تھے ۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں آپ کا کلام موجود ہو ۔ اُردو میں تخلص ”شاکئی“ تھا، فارسی میں فرقانی ۔ غزلوں کے علاوہ مولانا نے مرثی اور سلام بھی کہے ہیں ۔ دیوان آپ کا چھپ گیا ہو ۔

مولانا فرقانی کے شاگرد سید محمد تقی داغ دہیر کے ہم عصر تھے اور محلہ چار دروازے میں رہتے تھے ۔ اُردو میں بیان تخلص کرتے تھے اور فارسی میں یزدانی ۔ عربی فارسی کی عمدہ استعداد تھی ۔ سنہ ۱۳۰۵ء میں ۵۴ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ اُردو میں اُن کا کلام زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہو لیکن چند نظمیں بھی اُن کے قلم سے یادگار ہیں ۔ نہایت پُرگو شاعر تھے لیکن اکثر اچھا شعر کہتے تھے ۔ اسوس ہو کہ ان کا کلام آج تک طبع نہیں ہو سکا ۔

حضرت بیان علاوہ ممتاز شاعر ہونے کے ایک زبردست نثار بھی تھے ۔ چنانچہ اڈیٹر ادھ دھج اور اس کے رفقاءے کار کے مقابلے میں جو تحریرات اس زمانے میں شائع ہوئیں اس کا لطف کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے ان تحریرات کو دیکھا ہو ۔ ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہو کہ مرحوم کا قلم نہ صرف شاعری میں بلکہ نثر کے میدان میں بھی وہ وہ جولانیاں دکھاتا ہو کہ باید و شاہد ۔

مولوی احمد حسین شوکت اپنے زمانے کے بڑے عالم فاضل بزرگ تھے ۔ مولانا ندرت میرٹھی آپ ہی کے فرزند ارجمند ہیں ۔ شوکت مرحوم نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے جس کی بین دلیل ان کا اخبار ”شعنہ ہند“ ہو ۔ ”شعنہ ہند“ کے علاوہ دو ایک پرچے اور بھی آپ کی ادارت میں نکلے ہیں جن کا تذکرہ صفحات مابقی میں آچکا ہو ۔ شعر و سخن کا عمدہ ذائق رکھتے تھے اور خود بھی اچھا خاما شعر کہ پیتے تھے ۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہو ۔ طبیعت کسی قدر دُشوار پسند پائی تھی ۔ اُن کی علییت میں کوئی شبہ نہیں لیکن دُشوروں

کے کلام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے حدِ اعتدال سے گزر جاتے تھے۔

یہاں کے ایک اور بزرگ امداد حسین صاحب متخلص بہ ظہور تھے جو اپنے نغنیہ کلام کے لیے مشہور ہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور عرفانی تخلص کرتے تھے۔ فارسی اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہو کہ اندازِ گفتگو بالکل ایرانی ہو۔ افسوس ہو کہ ان کا دیوان شائع نہیں ہوا ہو۔ البتہ چند رسالہ جات انھوں نے چھپوائے تھے جن میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت مختلف بحروں اور زمینوں میں نہایت خوب لکھی ہو۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اُردو ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ ہر وہ بچہ جس نے ان کی اُردو ریڈریں پڑھی ہیں ان کے نام سے واقف ہو۔ مولوی صاحب نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ شعر گوئی کا شوق ابتدا سے تھا جو دُورِ رانِ ملازمت میں بھی ترک نہ ہو سکا۔ معتفِ گلِ رعنا کا خیال ہو کہ ”مولانا اُردو زبان کی نظم و نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو با تمدنی و اخلاقی و سیاسی ہو، قدیم و جدید ہر طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے۔“ مولانا نے داغ کا ہم عصر ہوتے ہوئے بھی داغ کا رنگ تفضیل اختیار نہیں کیا اور غالب و مومن کی تقلید کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ شنوی، خاص کر بچوں کی نظمیں لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہو۔ نظموں کا رنگ وہی ہو جو حالی کا ہو۔ نچرل شاعری کے علم برداروں میں اگر حالی کے ساتھ آزاد کا نام لیا جاسکتا ہو تو مولوی صاحب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل کے بعض لوجان اپنی کم علمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ نظم غیر مقفیٰ کا رواج موجودہ زمانے کی ایجاد ہو، حالانکہ ان لوگوں سے بہت پہلے مولوی صاحب چند غیر مقفیٰ نظمیں لکھ چکے تھے جو کافی مقبول ہوئیں۔ شاعر ہونے کے علاوہ مولوی صاحب کی اُردو نثر بھی سچی سچی تھی ہو۔ اُن کی جو کتابیں کورس میں داخل تھیں میری اس رائے پر شاہدِ عادل ہیں مولانا کے چند شعر دیہِ ناظرین کیجے جاتے ہیں:-

ہو یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں	بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
کیا حیا خیز ہو نظر دیکھو	فکرِ افشائے راز کیوں نہ کروں
یارب! کوئی فریفتہ رنگ و بو نہ ہو	مُبیل کے دل میں داغ و دابرِ بہار ہو

جس کوشن کر زہرِ سنگ آب ہو      آہ! وہ غم گیں فسانہ اور ہو  
تیرے سوا اُسے نظر آتا نہیں کوئی      حاصل جہان میں جسے عینِ یقین ہو  
تو اور عذیرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا      دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا  
مولوی عبدالکیم جوش مولوی محمد اسماعیل صاحب موصوف کے بڑے بھائی تھے۔ شعر کہتے تھے لیکن رنگ  
تغزل وہی پُرانا تھا، البتہ فنِ شعر کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی نظم بھی لکھ لیتے تھے۔ مولوی اسماعیل  
صاحب نے ان کی ایک آدھ نظم اپنی کسی ریڈر میں بھی انتخاب کی ہو۔ تاریخ بھی اچھی نکالتے تھے۔  
اسی زمانے میں نواب اشارت علی صدق موجود تھے جن کو تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ چناں چہ  
آپ کی بہت سی تاریخیں میرٹھ میں زبانِ زوِ خاص دعام ہیں۔ ہر دوار سے جب وہ نہر گنگ نکالی گئی جوڑو کی  
ضلع سہارن پور سے ہو کر گزرتی ہو تو مسٹر کاٹ لی اُس کے انجیر تھے۔ آپ نے تاریخ کبھی ج  
کاٹ لی صاحب نے گنگا کاٹ لی

سید محمد حسین صاحب شوقِ اصل میں سہارن پور کے رہنے والے تھے اور عہدہ ڈپٹی مجسٹریٹ نہر  
پر مامور تھے۔ ملازمت سے سبک دوش ہو جانے پر میرٹھ میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور اپنے  
صاحب زادے سید محمد مستن زیدی مرحوم بیرسٹریٹ لا میرٹھ کے ساتھ خیرنگر دروازے میں رہا کرتے تھے۔  
بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں یہیں انتقال فرمایا۔ مرحوم  
نے مدتِ مدید تک وقفِ منصبیہ میرٹھ کی تولیت کے فرائض انجام دیے۔ اس وقف کے متعلق ایک  
سالانہ رپورٹ شائع فرماتے تھے جو بہت دل چسپ ہوتی تھی۔ شعر کا نہایت پائیزہ مذاق رکھتے تھے اور خود  
بھی اچھا شعر کہ لیتے تھے۔ مثلاً چند شعر لکھتا ہوں

آستانِ بوس تھے جس در کے، وہ در چھوڑ دیا      بھادی پتھر تھا، فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا  
مرغِ گلشن سے یہ پر کاٹ کے بولا صیاد      لے، کیا رحم کہ لٹا ہوا پر چھوڑ دیا

اڑ بھاگے ہم صغیرِ قفس توڑ توڑ کر      میں ناخداں بلا میں گرفتار ہی رہا

تسکین ہوئی نہ کش کشِ غم سے چھوٹ کر      دل بتلاے لذتِ آزار ہی رہا

دوؤں نقد جاں بھی نذر، نہ وہ مرجا کہیں      دل کس حساب میں ہو، جگر کس شمار میں  
دیکھو شا کے شوق کو پھنساؤ گے بہت      شیدانہ اس سا ایک ملے گا ہزار میں  
مولانا شعیب احمد ندرت عصر حاضر کے مشہور شعرا میں ہیں اور خدا کے فضل سے بقیہ حیات ہیں۔  
مزاج بے حد سادہ اور خاک سارانہ ہو۔ خونِ نابِ دل کے نام سے آپ کا دیوان غزلیات تین چار برس ہوئے  
شائع ہو چکا ہو۔ فن شعرا اور الفاظ کے محل استعمال کے متعلق وسیع نظر رکھتے ہیں۔ کلام کا رنگ یہ ہو س  
گولے اس لیے منڈلا رہے ہیں میرے دفن پر      کہ یہ دھبہ بھی کیوں قتی رہے صبرا کے دامن پر  
نیمستی مغمومری ہستی کی بنیادوں میں تھی      یہ مری بربادیاں ہی حاصلِ تعمیر ہیں  
ہزاروں آرودیں دل میں بھردیں بھرنے والے نے      مزا یہ ہو کہ بھر گنجائش درو نہاں رکھ دی  
مولوی محمود علی گرامی پروفیسر میرٹھ کالج بھی یہاں کی ایک ممتاز ہستی تھے۔ شعر و سخن میں حضرت  
بیان سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے کلام کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن تیس برس کی محنت شاقہ  
کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا یہاں تک کہ خود اُن کے لیے بھی پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اکثر جلسوں میں نظمیں  
پڑھتے تھے۔ ضلع جگت کا بہت شوق تھا۔

ضیاء الاسلام عیاں یہاں کے فوجان شعرا میں تھے۔ انوس ہو کہ دستِ اجل نے ان کو ہم سے  
بہت جلد جدا کر دیا۔ حضرت بیان کے بھتیجے تھے اور وکالت کرتے تھے۔ شعر و سخن میں ان کا پایہ  
اعلیٰ درجے کا ہو۔ اندازِ بیان میں ایک بات ہوتی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خود ان کا اپنا تھا۔ انوس  
ہو کہ ان کا کلام ہنوز پردہ کتم میں ہو۔ دیکھیے کب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہو۔ بہر حال چند مشہور  
شعر لکھتا ہوں ۷

سلامت واپس آجانے کی غمگت اے معاذ اللہ!      پیٹے مٹھ پڑی ہیں کشتیاں دامانِ ساحل سے  
خدا جلنے وطن سے اس کو کیا اندازیں سہی تھیں      کہ جس نے چین پایا غربتِ شامِ غربیاں میں

تعتین کا جنوں دشمن، سلاسل مانع جنبش ! نہ رہ سکتا ہوں زنداں میں نہ جاسکتا ہوں زنداں سے  
 عنادل ! اس قدر کم زور بنیادِ مکاں کیوں ہو ؟ ہوا سے بھی ہلے جو شاخ اس پر آشیاں کیوں ہوں؟  
 ضبط ہم سے مشکل تھا، ہو گئی خطا آخر اس قدر حسین چہرہ، اس قدر قرب چہرہ  
 رونقِ خانہ دل آپ کے دم تک ہو حضور آگ اس گھر کو لگا لوں تو چلے جائیے گا

عالمہ اللہ افسر بی۔ اے محلہ مفتی داڑے کے رہنے والے ہیں۔ کج کل جوبلی کالج لکھنؤ میں پروفیسر ہیں۔  
 نظمیں اچھی لکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔ مرحوم آذیل ڈاکٹر سرشاہ محمد سلیمان  
 چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے آپ کے مجموعہ کلام پر دیباچہ تحریر فرمایا تھا۔ نثر میں بھی ایک کتاب  
 نقد الادب کے نام سے فن تنقید پر آپ کی تصنیف ہے۔

حضرت سائر اگرچہ علی گڑھ کے رہنے والے ہیں لیکن ۱۹۳۲ء سے برابر میرٹھ میں سکونت پزیر ہیں۔  
 شعر و شاعری میں جناب سیاب اکبر آبادی کے شاگرد رشید ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز سامعہ نواز ہے۔  
 کم از کم ۱۹۴۰ء سے ان کی شاعری میں نیا باب کھل گیا ہوا وہ ترقی پزیر ہے۔ غزلیں بھی کہتے ہیں لیکن اصل  
 رجحان طبیعت نظموں کی طرف ہے جو کافی جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ ایک مجموعہ کلام بادۂ مشرق کے نام سے  
 ۱۹۴۵ء میں چھپا تھا۔ دوسرا مجموعہ رنگِ محفل کے نام سے حال ہی میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے۔  
 پنڈت اندرجیت شرما اچھے ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ حضرت ندرت میرٹھی سے تلمذ ہے۔  
 نظمیں اچھی کہتے ہیں اور ملک کے مختلف رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے جو عام طور پر پسند  
 کیا جاتا ہے۔

ہشیار میرٹھی بھی اپنے کثیر التعداد تلامذہ کی وجہ سے قابل الذکر ہیں۔ مجموعہ نغز مصنف حکیم قدرت اللہ  
 قاسم دہلوی سے پایا جاتا ہے کہ میر اور ان کے قریب کے زمانے میں دہلی میں شعر و سخن کا بہت چرچا  
 تھا۔ چناں چہ انھوں نے اکثر ایسے شعرا کے نام شمار کرائے ہیں جن کے باعث عوام سے لے کر بڑے  
 بڑے نوابوں تک کوئی شخص اس شوق سے خالی نہیں رہا۔ اگر یہی بات میرٹھ میں دیکھی جائے تو ماننا  
 پڑے گا کہ محض حضرت ہشیار میرٹھی کی بدولت عوام میں اس کا شوق دائم و قائم ہے۔

جنابہ حور صاحبہ یہاں کے ایک کنبہ خاندان کی فرد ہیں۔ شعر گوئی سے اُن کو کافی شغف ہو۔ اُن کی بہن حیا صاحبہ بھی شعر کہتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے اب عنانِ توجہ شاعری کے میدان سے ہٹا کر نشاطانِ میرٹھ کی طرف مبذول فرمائی جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں کی سرزمین سے کیسے کیسے نامور ادیب پیدا ہوئے ہیں۔

سب سے پہلا نام جو اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہو وہ حکیم مقرب حسین کا ہو۔ جس زمانے میں آپ انجلہ عالم نکال رہے تھے، اسی کے قریب قریب آپ نے اپنی توجہ بوستانِ خیال کی پانچویں اور چھٹی جلد کے ترجمے کی طرف منطف کی۔ چنانچہ آپ نے ان دو جلدوں کا ترجمہ کیا۔ اگرچہ پرانا قصہ اور پرانی بات ہو لیکن اس ترجمے سے ظاہر ہوتا ہو کہ حکیم صاحب کی استعدادِ علمی عربی اور فارسی میں نہایت عمدہ تھی۔ عبارت میں رنگینی اور قافیہ بندی ضرور پائی جاتی ہو لیکن اس نالے کا طرزِ تحریر ہی یہ تھا۔

منشی ممتاز علی یہاں کے دوسرے علم دوست گزرے ہیں۔ معلوم ہوتا ہو کہ مرزا غالب سے ان کو کافی عقیدت تھی اور وہ غالب کے مباحثین میں سے تھے۔ چنانچہ رقتاتِ غالب کا مجموعہ عوہ ہندی کے نام سے پہلی بار یہیں چھپا اور منشی صاحب موصوف اُس کے ناشر تھے۔ خطاط جس محنت سے جمع کیے گئے تھے، اس سے اُن کی کاوش و جستجو اور اُردو نثر سے دل چسپی اور سخن شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہو۔

یہاں کی خاکِ پاک سے ایک صاحب مرزا رحیم بیگ نابینا بھی اُٹھے تھے۔ ان کی علمی استعداد میں کسی کو کوئی کلام نہیں لیکن انہوں نے وہ بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی محروم تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کی کتابِ لغتِ قاطعِ برہان کے جواب میں ساطعِ برہان شائع کی۔ غالباً مولوی امام بخش صہبائی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس لیے غالب نے جب مرزا رحیم بیگ صاحب مرحوم کو ایک رقم لکھا جو عوہ ہندی میں موجود ہو تو لکھا کہ

”..... یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المتقین خطاب دیا ہو، کتنے متقین نے آپ کو دینی

مولوی امام بخش کو، اپنا امام مان لیا ہو..... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بفتحِ قاف ثانی بیضہ

تشبیہ امام المتقین کہتے تو ایک ماموم (یعنی پیرِ امام) آپ اور نراین داس قبلی دوسرا ہوتا.....“



جناب حافظ محمد اکبر صاحب جو ہمارے لائق و محترم دوست مولوی محمد اسماعیل عینی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی اسسٹنٹ گورنمنٹ پبلیٹر میرٹھ کے ناما ہوتے تھے دیوان شاہ نصیر کی ترتیب کے باعث مشہور ہیں۔ گزری بازاری کے اس طرف جو ایک چھتہ ہو جس کا نام باب اعلیٰ ہو انھی کے بھائی کے نام سے موسوم کیا گیا ہو۔ اگرچہ شاہ نصیر کا مکمل دیوان نہیں ہو لیکن دو تین ہزار اشعار کا یہ مجموعہ بھی آج کل قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہو کیوں کہ شاہ نصیر کا کلام کم یاب بلکہ نایاب ہو۔ دیوان مذکور کی ترتیب سے اُن کا ذوق ادب ظاہر ہوتا ہو۔ ایک بزرگ مولوی زین العابدین فرجاد بھی یہاں کی خاکِ پاک سے اپنی بہار دکھا کر ہماری نظروں سے مستور ہو گئے ہیں۔ وہ فارسی نظم و نثر پر ایک وسیع نظر رکھتے تھے اور مولوی ابوالکلام آزاد جیسے ٹھہ عالم بھی اُن کے مداح و معترف ہیں۔ فارسی میں اشعار بڑی روانی کے ساتھ کہتے چلے جاتے تھے اور نثر مقفی و مستیع لکھتے تھے۔ ایک قواعدِ اُردو بھی اُن سے یادگار ہو۔ میرے حال پر عنایت بے غایت فرماتے تھے اور اسی سبب سے مجھے فارسی کے متعلق اُن سے امداد لینے کا افتخار حاصل ہو۔ اُن کے فرزند ابن رشید بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ممکن ہو کہ جوہر صاحب اُن کے فرزند ارجند کسی روز اپنی ادب سے طلوع ہو کر آفتاب نصف النہار بن جائیں۔

عصر حاضر کی وہ ہستی جو چار دانگ ہند میں مشہور ہو یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ کیوں کہ مولوی صاحب خاص میرٹھ میں نہ سہی نواحِ میرٹھ یعنی قصبہ ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے اور دکن میں آفتاب ہو کر چمکے۔ اُن کی سنی پیہم اور عقلی دست رس سے انجمن ترقی اُردو کا بول بالا ہو گیا۔ ان کی تحریرات سادہ، متین اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ طرزِ حالی کے مقلد ہیں اور اپنا خاص رنگ رکھتے ہیں۔ روانی اور صفائی بدرجہ اتم موجود ہو۔ اُن کی تصنیفات قواعدِ اُردو سے لے کر اُن کے مقالات تک سب دل کش ہیں۔ ان کا نام عصر حاضر کے ادیبوں اور مصنفین میں سرفہرست ہو۔

مولوی خلیل الرحمن کا وطن مالوٹ اور مولد قصبہ سراہہ ضلع میرٹھ ہو اگرچہ آپ کی بیشتر زندگی لاہور اور دوسرے مقامات پر گزری ہو۔ مولوی صاحب مرحوم کو مضمون نگاری کا شوق ۱۳۸۷ھ سے ہو گیا تھا۔ غالباً ۱۳۸۷ھ میں سید ممتاز علی صاحب کے بلانے پر لاہور تشریف لے گئے تھے۔ جہاں چیف کورٹ میں ملازم

تھے۔ لاہور میں علامہ آزاد سے فیضِ صحبت حاصل کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے شوقِ دلالت پر ترجمے کی طرف توجہ فرمائی۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلی مشق آپ کی مشہور کتاب عذرا ہو۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حافظ سیوطی کی کتاب تاریخ الخلفاء کا ترجمہ کیا۔ نفع الطیب کی تلخیص کی۔ لیکن مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اخبار الاندلس کا ترجمہ ہو جس پر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا اور پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۷۷ء میں لاہور سے پنشن پانے کے بعد اپنے صاحب زادے پروفیسر نسیم الرحمن صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے پاس رہنے لگے۔ پچھلے دو تین سال ہوئے غالباً الہ آباد ہی میں آپ نے وفات پائی۔ راقم الحروف کے والد ماجد مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے، ایل ایل بی کا دکن میرٹھ نہیں ہو لیکن نشوونما یہیں پائی ہو۔ بی۔ اے، ایل ایل بی کا امتحان میرٹھ کالج سے پاس کیا ہو۔ پچھلے نو دس سال سے غازی آباد کے بعد یہیں وکالت کرتے ہیں۔ اپنی متعدد تصنیفات کی وجہ سے دنیائے ادب میں کافی مشہور ہیں۔ سیر المصنفین دو جلدوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہو۔ تاریخ مغربی یورپ اور تاریخ امریکہ سے آپ کے ذوقِ تاریخ نویسی کا اظہار ہوتا ہو۔ شاعرانہ خیالات اور خیالاتِ ارونگ ادبی ذوق کا پتا دیتی ہیں۔ ایک تذکرۃ الشعراء جو ہزار بارہ سو صفحات کی کتاب ہو، مکمل کر چکے ہیں لیکن کاغذ کی نایابی سے ابھی تک چھپنے کی ذمت نہیں آئی۔ سیر المصنفین کی تیسری جلد بھی جس میں عصر حاضر کے ادبا و نقادان کا ذکر خیر ہو، زیرِ ترتیب ہو۔ شعر و سخن کا کافی ذوق رکھتے ہیں۔ زیادہ تر نظموں کی طرف میلان ہو۔ غزل گوئی کے خلاف ہیں۔ نمونہ ایک نظم پیش کی جاتی ہو۔

### ”الخلافت فی الارض“

آمد و شد سے ہر کی،	ارض و سما کو زیب ہو
چشمہ آفتاب سے،	پھول کھلے زمین پر
بحرِ عمیق سے اٹھا،	ابرِ سیاہِ مست گام
ابرِ سیاہ کی چال میں	مستی و سرخوشی وہ تھی
زنجِ شفق نے گردِ یا شام و سحر کو	لالہ زار
ہو گئیں سبز کھیتیاں،	بلغمیں آئے برگ و بار
چھا گیا آسمان پر	دویش صبا پہ ہو سوار
ہو گیا جھوم جھوم کر،	روسے زمیں پہ خود نثار

قوسِ قزح کو دیکھ کر اہل زمیں تھے دن میں خوش  
 ارض و سما و قلمزم و انجم و ماہ و آفتاب  
 اپنی روش پہ ہیں رواں، قدرتِ حق کے ہیں مطیع  
 عقل سے اپنی حکم راں ہو گیا کائنات پر  
 تازہ بہ تازہ نوبہ نواس کی تراش اور تراش  
 اس کا خلیفہ خدا ”روزِ ازل سے ہو خطاب  
 رات کو آسمان پر انجم و مہ کی تھی بہار  
 سبزہ و گل، شجر، صبا، وادی و دشت و کہل  
 ایک مگر یہ آدمی، دیکھنے میں نحیف و زار  
 اور خدا نے دے دیے اس کو بہت سے اختیار  
 کیوں نہ ہو؟ بات بات میں ایک اُچھ ہو آشکارا  
 کوئی ملک بھی آج تک پانہ سکا یہ اقتدار

صاحبِ فہم ہی مگر رکھتے ہیں امتیاز کچھ

دردِ بنی نوع میں سب کو نہیں یہ افتخار

شاید بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ ملک کے مشہور ناول نگار مسٹر ظفر عمر بی۔ اے بھی اسی سرزمین سے متعلق ہیں۔ ظفر عمر صاحب بڑے ضلع میرٹھ کے باشندے ہیں لیکن جب سے علی گڑھ میں انھوں نے اپنی کوٹھی نیلی پھتری بنائی ہو زیادہ تر علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ مسٹر ظفر عمر کی ادبی زندگی کا آغاز پرنسیر دیسری کی کتاب **WESTERN CULTURE IN EASTERN LANDS** کے ترجمے موسم بہ مستقبلِ اسلام سے ہوتا ہے جو غالباً ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد ناول بہرام کی گرفتاری نیلی پھتری، لال کشمور، چوروں کا کلب وغیرہ شائع ہوئے۔ نیلی پھتری خصوصیت کے ساتھ مقبول ہوئی اور معلوم ہوا ہے کہ ان کی کوٹھی نیلی پھتری کی تمام لاگت اسی کتاب کے زیرِ منفعت سے حاصل کی گئی ہے۔ جناب ظفر عمر صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ جاسوسی ناول نگاری کو اُردو میں انہی نے روشناس کرایا ہے۔

مولوی آفتاب عمر صاحب بی۔ اے، ایل ایل۔ بی وکیل میرٹھ ظفر عمر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔

غالباً ۱۹۱۷ء میں آپ نے رنج و راحت ایک ناول شائع کیا تھا جس میں غدر کے زمانے کا قلعہ ہے۔ کتاب کافی دل چسپ ہے لیکن اب بازار میں دستیاب نہیں ہوتی اور دوسرا ایڈیشن آج تک نہیں چھپا۔ آفتاب عمر صاحب کو اوائلِ عمر سے سائنس کے مضمون سے دل چسپی رہی ہے اور مختلف اوقات میں مختلف چیزوں کے متعلق اپنے گھر پر تجربات کرتے رہے ہیں۔ اسی دل چسپی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ نے ۱۹۱۷ء

میں دائرہ میں کے متعلق صدائے برق کے نام سے کتاب شائع کی۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نئی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس کتاب پر لائق مصنف کو مبلغ پان سو روپے انعام عطا فرمایا۔ مولوی صاحب موصوف نہایت سادگی پسند اور ذہین انسان ہیں۔ طبیعت بڑی بے نیاز واقع ہوئی ہو۔ بعض اوقات بڑی محبت اور تواضع سے پیش آتے ہیں لیکن دوسرے وقت اپنے انہماک کی وجہ سے انہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون چلا گیا۔ راقم آٹھ پر بڑا کرم فرماتے ہیں۔

مولوی عبدالباری اسی آدن ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں، اگرچہ آج کل لکھنؤ میں قیام پزیر ہیں۔ آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں۔ تذکرہ خندہ گل مولوی صاحب کی مشہور کتاب ہو جس میں اُردو اور فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات اور منتخب کلام درج ہو۔ اس قسم کا تذکرہ اُردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہو۔ مولوی صاحب موصوف کی دوسری کتاب تذکرہ معرکہ سخن بھی اسی قدر دل چسپ تصنیف ہو۔ اس میں شعرا کی باہم نوک جھونک، علمی مباحث، مختلف اساتذہ سخن کا انتخاب سب کچھ ملے گا۔ آپ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے ہیں لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر متذکرہ بالاتذکروں پر مبنی ہو۔

ماسٹر پیارے لال شاکر بھی ایک مشہور و معروف ہستی ہیں۔ نظموں کے علاوہ ان کے مضامین ہندوستان کے بہترین رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ایک زمزمہ میں رسالہ ادیب الہ آباد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔

قاضی منیر الدین احمد صاحب نے بھی ایک رسالہ فن خیاطی پر سلاسلہ میں تصنیف کیا تھا اور اسی عنوان پر ایک اور کتاب شائع کر چکے ہیں لیکن میری نظر سے نہیں گزری۔ اس فن کے متعلق غالباً قاضی صاحب کے علاوہ کوئی اور تصنیف اُردو میں مشکل سے ملے گی۔

مفتی شوکت علی بھی جو دنیاے ادب میں دین و دنیا دہی کے اوٹھ ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں اسی خاک پاک کے محل لوزس ہیں۔ اپنی مدد آپ کرنے کا مادہ ان میں پایا جاتا ہو اور یہ کچھ کم قابل تعریف نہیں ہو۔ اکتساب علم کا شوق جوانی میں پیدا ہوا اور اب کہ بڑھاپے کے قریب آتے جاتے ہیں ان کی عبارت میں نچنگی ترقی پزیر ہو۔

مولوی قاضی زین العابدین صاحب سجاد ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ایک زمانے میں ادبی دنیا لاہور کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں اور اگرچہ آج کل گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں استاد ہیں لیکن ذوقِ ادب برابر نشوونما پارہا ہے۔ چونکہ مولوی صاحب فاضل دیوبند ہیں اس لیے قدرِ ثناء آپ کو عربی ادب سے زیادہ لگاؤ ہو اور آپ کی برابر ہی کوشش رہتی ہو کہ عربی ادب میں جو کچھ عمدہ چیزیں ہیں کسی طرح اُردو میں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ آپ نے مصر کے مشہور ادیب سید مصطفیٰ لطفی المظلوٹی کے ان چند انسانوں کا ترجمہ ملک کے سامنے پیش کیا جو العبرات کے نام سے مشہور ہو اور مصنف کی نادر روزگار تصنیف بھی گئی ہو قاضی زین العابدین صاحب سجاد نے اپنے مترجمہ افسانوں کا نام ”مصری افسانے“ رکھا ہے۔ صحاح ستہ کے انتخاب اور اس کے ترجمے کے ذمے دار بھی قاضی صاحب موصوف ہیں۔ علاوہ ازیں منتخب العربیہ المعروف بہ کلام عربی بھی آپ کی تصنیف ہو جس میں عربی زبان سکھانے کا نہایت آسان طریقہ ہو اور جو مبتدیوں کے لیے بے حد مفید ہو۔ یہ کتاب مولوی صاحب موصوف نے مجھے اذرا و عنایت عطا فرمائی تھی اور میں نے اس سے کافی مدد لی۔

ایک صاحب سید منظر حسین بھی یہاں کے ان لوگوں میں تھے جو ادب کے شیدا کہے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن معنوں نگاری برابر کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مرض سرطان سے انتقال فرمایا۔

بھیا احسان الحق صاحب کا ذکر اگرچہ آخر میں کیا جا رہا ہے لیکن وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی دُور رس نگاہ ادب اُردو کا جائزہ کرتی رہتی ہو اور ان کے مختلف مضامین ان کی وسعتِ نظر کا پتا دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ بظاہر کسی کتاب کے مصنف نہیں ہیں لیکن خواجہ حسن نظامی کو اخبار لکھانے کے لیے آمادہ کر کے میرٹھ سے توحید نامی ایک اخبار ان سے انہی نے نکلوایا تھا۔

بعد ازاں یہ دہلی چلے گئے اور اب وہیں قیام پذیر ہیں۔ ادبی ذوق و شوق رکھتے ہیں اور اپنے محدود دائرے میں اپنے بعض دوستوں کی اس بارے میں مدد بھی کرتے رہتے ہیں خواجہ حسن نظامی ان کے بڑے مداح ہیں اور خواجہ صاحب کی کتاب آپ بیتی سے ان کے مشوروں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو۔

صوفی سید محمد یحییٰ صاحب بھی میرٹھ کے اچھے معنوں نگاروں میں ہیں اور کافی عمدہ ذوقِ ادب رکھتے ہیں مگر بہ قول ساغر صاحب ایک مضمون لکھنے کے لیے ساہلہ سال تک ضمیر کی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دوں گا کہ ہمارے شہر میرٹھ میں ایک جماعتِ کثیر نویس شعرا و ادبا کی پیدا ہوگئی ہو جن کے آئندہ کاموں سے پتا چلے گا کہ میرٹھ نے اپنا فرض جو اس پر قرب دہلی کی وجہ سے عائد ہوتا تھا بہت اچھی طرح سے ادا کیا ہو اور ادا کرتا رہے گا۔

# خطبہ صدارت گل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس، ناگ پور

(نواب صدیق یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شروانی صاحب)

حضرات! آپ نے مجھے اس ادبی و علمی مجلس کی صدارت کا جو اعزاز عطا فرمایا ہے اُس کے لیے میں دل سے آپ کا سپاس گزار ہوں۔ مجھ کو آغاز کار سے اب تک انجمن ترقی اُردو سے دلچسپی رہی ہے اور میں نے اُس کی خدمات انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

انجمن ترقی اُردو کس طرح وجود میں آئی؟ اس موقع پر اس کا مختصر تذکرہ غالباً بے موقع نہ ہوگا۔ چالیس برس سے بھی زیادہ زمانہ گزرا کہ ۱۹۵۷ء میں ملک منظم کی تاج پوشی کے سلسلے میں ایک شاندار تاریخی دربار دہلی میں منعقد ہوا، علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد خصوصاً صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے جو کانفرنس کے آئینہ سکرٹری تھے یہ مناسب سمجھا کہ اس تاریخی موقع پر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں منعقد کیا جائے، چنانچہ کانفرنس کا سولہواں اجلاس زیر صدارت ہنر ہائے نس سر آغا خاں بہنقاہ نہایت شان و شوکت سے دہلی میں منعقد ہوا، جس میں ہندوستان اور انگلستان کے بہت سے مشہور و نامور اصحاب اور بعض والیانِ ملک و ارکانِ حکومت نے شرکت فرمائی، اسی تاریخی اجلاس میں ایک رزلویشن کی بنا پر کانفرنس کا ایک لٹریری سکشن یا شعبہ ترقی اُردو قائم ہوا، اور اس شعبے کے مقصد اعزازی (آزیری سکرٹری) شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ یہ تھا آپ کی انجمن کا مبارک آغاز۔

یہ بھی ایک عجیب حُسن اتفاق ہے کہ شعبہ ترقی اُردو کا سبب بنیاد دہلی میں رکھا گیا جو اُردو کا مولد و مرکز مانا گیا ہے دوسرا حُسن اتفاق یہ ہے کہ یہ انجمن کم و بیش ایک تہائی صدی کے بعد اپنے دورِ عروج و شباب

میں بہت سے کارنامے انجام دینے اور خسرو دکن غلام شاہ کے الطاف شاہانہ سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد پھر اسی دہلی میں آگئی جہاں اس صدمہ کے آغاز میں اُسے حیاتِ اولیں حاصل ہوئی تھی۔

حضرات! شعبہ ترقی اُردو نے وجود میں آنے کے بعد باوجود ناسازگار حالات کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیا تھا، اور ایجوکیشنل کانفرنس بہ قدرِ گنجائش اس شعبے کی مالی امداد کر رہی تھی کہ شعبے کے مستند اعزازی مولانا شبلی نعمانی نے ۱۹۵۰ء تک کام کرنے کے بعد کثرتِ مشاغل کی وجہ سے استعفا دے دیا اور یہ خدمت کانفرنس کی طرف سے میرے سپرد کی گئی، اس کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے اس کام کو سنبھالا، مگر اُن کی افسوس ناک وفات نے ساری امیدوں کا جوان کی ذات سے وابستہ تھیں، خاتمہ کر دیا۔ آخر کار ۱۹۵۱ء میں قرعہٴ قال مولوی عبدالحق صاحب کے نام بھلا جو آپ کی انجمن کے چوتھے مستند اعزازی ہیں، انھوں نے اس شعبے کو ہاتھ میں لے کر بہ تدریج ایسے مرتبے پر پہنچایا کہ چار دانگ ہند میں اُسے شہرت حاصل ہو گئی اور وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی مالی سرپرستی سے بے نیاز ہو کر مہدستان کا ایک مشہور مستقل ادارہ بن گئی۔ حضرات! ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی محنت و کوشش سے انجمن ترقی اُردو کو جس درجے تک پہنچایا، اُس کا مجھے ابتدا ہی سے اعتراف ہو۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ایم اے ادکلج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا، میں نے بر حیثیت آئزیری سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس اس اجلاس میں جو رپورٹ پڑھی اس میں یہ عرض کیا تھا :-

”انجمن کی موجودہ ترقی و کامیابی نتیجہ ہے مولوی عبدالحق صاحب بی اے کی سعی و ہمت کا جو بڑے

مستقل مزاج، پختہ کار اور مسلسل کام کرنے والے شخص ہیں اور عملاً انھوں نے اپنی زندگی اُردو کی

خدمت کے لیے وقف کر دی ہو جس میں وہ خاموشی کے ساتھ ساہا سال سے مصروف ہیں۔“

اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر بھی میں نے اپنی رپورٹ میں کانفرنس کی ”تاریخِ ماضی“ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہو کہ کس طرح کانفرنس کے شعبہ ترقی اُردو نے ترقی کر کے موجودہ ”انجمن ترقی اُردو کی صورت اختیار کی جو آج ایک مستقل انجمن کی حیثیت سے اپنے مستند و قابل سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب کے زیرِ نگرانی علم و ادب کی ترقی میں مصروف ہو۔ حضرات! یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہو کہ باوجود ملک میں جدید تعلیم پھیل جانے کے ہمیں ایسے

لائق و بلند ہمت کارکن میسر نہیں آتے جو ہمارے قومی اداروں کو صحیح طریقے پر خوش اسلوبی سے چلا کر ملک و قوم کے لیے مفید و سودمند بنا سکیں۔ ان حالات میں یقیناً یہ انجمن کی خوش نصیبی ہو کہ اُسے ایک ایسا ممتاز اسکالرٹی میسر آگیا جو بغیر کسی معاوضے یا صلے کی توقع کے محض اپنے ذاتی ذوق و شوق سے ہماری زبان کی خدمت میں معروف ہو ایسی کارپرداز ہستی کی خدمات کا احترام ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

حضرات! آج اردو کانفرنس کے اجلاس ناگ پور میں زندگی کے جو آثار مجھے نظر آرہے ہیں میں اس پر اظہار مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیا بعید ہو کہ یہ اجلاس، انجمن کے لیے ایک جدید دور ترقی کے آغاز کا باعث ہو۔ یہ انجمن ظن اس لیے ہو کہ اب سے پہلے بھی ناگ پور کا ایک قومی اجتماع مسلمان ہند کی تعلیمی زندگی میں ایک جدید دور اد مبارک انقلاب کا باعث ہوا تھا۔

یہ اجتماع جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہو آل انڈیا مسلم ایکویشن کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا جو سال ۱۹۷۷ء میں ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے متعلق ایک رزلویشن منظور ہوا، اور اجلاس کے فوراً بعد اس تحریک کے متعلق عملی جدوجہد شروع ہوگئی جو آخر کار کامیاب ہو کر مسلم یونیورسٹی کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سرسید کی رحلت کے بعد ہی ملک کے سامنے آگئی تھی اور کانفرنس کے اجلاس میں سال بہ سال اس کے متعلق رزلویشن پاس ہوتا اور پُر زور تقریریں کی جاتی تھیں، لیکن یہ سواٹ ناگ پور ہی کے لیے مقدر تھی کہ یہاں جو رزلویشن سال ۱۹۷۷ء میں منظور ہوا، جنوری سال ۱۹۷۷ء سے نہایت سرگرمی سے اس کی تکمیل شروع ہوگئی۔

اس اجلاس میں ہندوستانی سرآغا خاں خاص اسی مقصد سے تشریف لائے تھے کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کریں۔ یہ واقعہ جو بظاہر کسی قدر غیر متعلق ہو اس لیے عرض کیا گیا کہ ناگ پور کا یہ ”کارنامہ“ ہمارے دلوں میں تازہ ہوجائے کہ اب سے پہلے بھی یہاں کا ایک اجتماع ہماری حیات قومی کے لیے نتیجہ خیز و بار آور ثابت ہو چکا ہے۔ یہ امر باعثِ صدمت ہے کہ اگرچہ سی پی میں اہل اردو کی آبادی نہایت قلیل ہو اور ان کی اقتصادی حالت بھی لائقِ اطمینان نہیں، لیکن اس پر بھی وہ اپنی مستقل ہستی قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے کاموں کو اولوالعزمی سے انجام دیتے ہیں، جس کا ایک زبردست ثبوت یہ اردو کانفرنس ہے جو نہایت شان و شوکت سے منعقد ہو رہی ہے۔

حضرات! صوبہ متوسط کے اربابِ ادب نے ناگ پور میں اردو کانفرنس کو دعوتِ تازہ دے کر درحقیقت اپنی علمی و ادبی خدمت کا ثبوت دیا ہے۔ ملکی و مادری زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشش



کرنا ہر محب وطن اور بلند نظر ہندوستانی کا اولین فرض ہو اس لیے کوئی شخص اُردو ادب کی خدمت والوں کو اس پر ملامت نہیں کر سکتا کہ وہ اُردو زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اُردو کو کسی قسم کی مذہبی عظمت حاصل نہیں ہو اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو کی جو حمایت کی جا رہی ہو اس میں کوئی مذہبی جذبہ کار فرما ہو۔ البتہ اُردو کو ایک خاص تاریخی عظمت ضرور حاصل ہو یعنی وہ اس عہدِ زریں کی یادگار ہو جب اس ملک کی پُر امن فضا میں ہندو مسلمان برادرانہ محبت کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف تھے، اور اُردو ہندی کا مسئلہ جو زمانہ حاضریہ کی زہریلی سیاست کی پیداوار ہو ملک میں موجود نہ تھا۔ یہی زبان جسے اب ہم ”اُردو“ کہتے ہیں ”ہندی“ کے نام سے موسوم تھی یعنی وہ اہل ہند کی ”مشترک ملکی زبان“ سمجھی جاتی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان! مغربی تعلیم کے اثرات نے ہماری ملکی و قومی خصوصیتوں کو ایک ایک کر کے ناکار کیا ہے، یہاں تک کہ ہم اپنی ہستی کو بھی بھول گئے۔ اب اگر اس شان دار ماضی کی کوئی زندہ یادگار اس ملک میں باقی رہ گئی ہو تو وہ یہی زبان ہو جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور کسی زمانے میں انگریز بھی اس کے سیکھنے اور سمجھنے بلکہ ترقی دینے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرات! اُردو کی ابتدائی تاریخ، تدریجی ترقی، اور نشو و نما کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں، لیکن اس قدر عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ جس شخص نے بھی اُردو زبان کی تاریخ ماضی کا مطالعہ کیا ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ اُردو کسی زمانے میں بھی کسی کی مخصوص زبان نہ تھی، یہی وجہ ہو کہ ہماری ادبی محبتوں اور مشاعروں میں ہندو مسلمان ایک سا ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جن اسباب نے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو نہ صرف خوش گوار بلکہ مستحکم و استوار بنادیا تھا ان میں اُردو ادب بھی تھا۔ ان ادبی محبتوں میں شریک ہو کر ہندو مسلمان دونوں یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کون ہیں، مشترک ذوق نے دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا تھا۔ جس کا اخلاقی اثر ہماری ساری زندگی پر پڑتا تھا، اگر ہندو مسلمان رواداری سے کام لیں تو آج بھی وہ زمانہ واپس آ سکتا ہو۔

حضرات! جب ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی اُردو کی ایک کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ تو میں نے اس موقع پر بھی اُردو زبان کی اس حیثیت کو واضح کیا تھا کہ وہ ہندو مسلمانوں کا ایک

مشترک سرمایہ ہو۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان خیالات کا اس موقع پر اعادہ کیا جائے۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہندستان میں مشترک قومی زبان کی اہمیت یوں اور مسلم ہو کہ ہماری تمدنی زندگی میں دوسرے مشترک عناصر کی کمی ہو۔ خوش قسمتی سے زبان کے معاملے میں ہمارے قوم کے دونوں اہم حصوں یعنی ہندو مسلمانوں نے صدیوں کے تعاون سے ایک زبان اور ایک ادب کی پرورش کی ہو جو ہرچند ابھی نوزید ہو تاہم اپنے امکانات ترقی کے اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں ہو اور یہ بات اس لیے اور زیادہ اہم ہو کہ اُس کے صلح اثرات سے دوسری کمیوں کی تلافی کی امید کی جاسکتی ہو۔ زبان کے الفاظ کا سرمایہ قوم کی ذہنی کیفیات اور تصورات کا خزانہ ہوتا ہو اس خزانے کے مشترک ہونے سے قوم کے رجحانات اور اُن کے عوام میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہو، اس لیے اس مشترک تمدنی قوت کو ترقی دینا ہر سچے ہندستانی کا فرض ہونا چاہیے اور وہ کوشش جو اس مشترک قومی سرمایے کو منتشر کرنا یا غیر موثر بنانا چاہے اس کا سدباب قومی فرض ہو۔

ہماری بھیبسی ہو کہ لوگ اس مشترک قومی سرمایے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں مجھے یقین ہو کہ آپ حضرات جو ملک کے نمائندے ہیں باہمی سمجھوتے سے ایسی تدابیر اختیار کریں گے جس سے تنگ نظری اور فرقہ پروری کا سدباب ہو جائے گا اور ہمارا یہ سرمایہ قومی بربادی سے محفوظ رہ جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ اس کے منفید اثرات کو تعلیم یافتہ لوگوں کے محدود حلقے سے نکال کر قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیں۔

حضرات! مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ملک میں ایک ایسی انجمن یا مستقل ادارے کا قیام ناگزیر تھا جو نہ صرف ہماری ملکی دامداری زبان کے تحفظ کی خدمت انجام دے بلکہ اُس کی ترقی اور حلقہ اثر کو وسعت دینے کے لیے بھی زبردست وسائل اختیار کرے، اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کرے کہ اردو کو ہندستان میں وہ درجہ حاصل ہو جائے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہو۔

یہ امر باعث مسرت ہو کہ انجمن ترقی اردو اس خدمت کو انجام دینے کی کوشش میں سرگرم ہو۔ اس لیے ہم سب کا یہ فرض ہو کہ اپنی مالی و اخلاقی امداد سے اس ادارے کی بنیادیں س قدر مستحکم و

استوار کر دیں کہ وہ زیادہ جرأت و حوصلہ مندی سے ہماری زبان کی خدمت انجام دے سکے ، اگرچہ اب تک مختلف طریقوں سے انجمن نے اُردو کی بہت کچھ خدمت کی ہے اور علمی و ادبی تالیفات و تراجم کے ذریعے سے ہماری زبان کے ذخیرہ علم و ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہے ، لیکن ابھی بہت کچھ کام کرنے کے لیے باقی ہے جو بہر صورت ہمیں انجام دینا ہے ، اُردو پر اب بھی زبردست حملے ہو رہے ہیں اور وہ گوناگوں خطرات میں گھری ہوئی ہے اس لیے ہماری زراستی بھی غفلت یا بے خبری اُردو کے لیے ہلک جہنگی ہوگی۔

گزشتہ بیس برس میں ملک میں نئی نئی تحریکات نیز مختلف سیاسی نظریات و افکار نے جو بے چینی پیدا کر دی ہے ، اس کے تیز و تند جھونکوں نے علمی زاویوں اور ادبی گوشوں میں بھی ہنگامہ پیدا کر دیا ہے۔ اسی مقام پر جہاں آج ہم اُردو زبان کے ساتھ اپنی شیفتگی اور وابستگی کا مظاہرہ کرنے اور اُس کی آئندہ ترقی و فلاح کے مسائل پر غور و بحث کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں چند ہی سال پہلے اُس کی مخالفت بلکہ ہلاکت کی وہ تجویز مرتب کی گئی تھی جس کی ہمہ گیری و فتنہ آفرینی کے مقابلے میں سرانٹونی میکڈانلڈ (سابق لفٹنٹ گورنر یوپی) کی ساری اُردو دشمنی بازیچہٴ اطفال معلوم ہوتی تھی۔

عملی زندگی میں ہر ملک میں زبان کا معاملہ زیادہ تر تعلیم و عدالت کے محکموں سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید سیاسی دستور میں یہ محکمے تمام تر صوبوں کی حکومت کے سپرد کر دیے گئے تھے اور پنجاب و بنگال کے علاوہ باقی صوبوں کی حکومتیں نیشنل کانگریس کے زیرِ اقتدار تھیں اور کانگریس کا سب سے بڑا رہنما ایک نئی مفروضہ زبان کو ملک میں رائج کرنے کا خواہاں تھا۔

ان حریفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اُردو یا ہندستانی کی ترقی تو ایک طرف خود اس کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ گئی تھی۔ یہ حالات تھے جنہوں نے مولوی عبدالحق صاحب جیسے زاویہ نشین کو میدان میں آکر مدافعتِ جدوجہد پر مجبور کیا اور اُن کی سعی و تدبیر سے جو کام انجام پایا وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔

حضرات! صوبہٴ متوسط اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس شہر ناگ پور نے مولوی صاحب

موصوف کی مدافعت جنگ میں جو حصہ لیا وہ زبان اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ کہا جاسکتا ہو کہ مولوی صاحب نے اردو کی حمایت میں جو کوشش کی وہ برحیثیت معتمد انجمن ترقی اردو اُن کا فرض تھا، لیکن سوال یہ ہو کہ ہماری قوم میں ایسے کتنے آدمی ہیں جنہیں اپنے فرض کا احساس ہو اور وہ اُسے انجام دینا چاہتے ہیں حالانکہ وقت کا شدید مطالبہ ہو کہ ہم سب اپنا فرض انجام دیں۔

بے شبہ یہ امر باعث مسرت ہو کہ ”انجمن ترقی اردو“ جو پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتی تھی اب ترقی کر کے ایک وسیع الاثر علمی و ادبی انجمن کے درجے پر پہنچ گئی لیکن یہ ترقی کی آخری حد نہیں ہو بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا ہو ابھی بہت سا کام ہمارے کرنے کے لیے موجود ہو، کیوں کہ اردو کی مخالفت ملک میں اب بھی جاری ہو بلکہ اس میں روز بہ روز شدت پیدا ہو رہی ہو اور اس ناکردہ گناہ زبان کے مٹانے کے لیے نئی نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں اس لیے ہمارا کام پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہو جو ہمیں بہر صورت انجام دینا ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہو کہ اس قسم کے کام وسیع الاثر قومی اداروں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں، لہذا اس کی شدید ضرورت ہو کہ انجمن کے دائرہ اثر کو وسعت دی جائے اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ انجمن کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو جائے۔ واقعہ یہ ہو کہ اب تک بھی خواہاں اردو نے انجمن کی کوئی قابل ذکر مالی امداد نہیں کی بلکہ جیسا کہ باخبر اصحاب کو معلوم ہو، اس وقت تک انجمن کے سب کام دولت آصفیہ کی مالی قیاضی یا مولوی عبدالحق صاحب اور اُن کے مخصوص احباب کی اعانت سے ہوتے رہے ہیں۔ قومی حیثیت سے ابھی تک انجمن کے لیے کوئی سرمایہ نہیں فراہم کیا گیا۔ دولت آصفیہ کی بروقت اور گراں قدر امداد شکریے سے بالاتر ہو بھی خواہاں اردو اس کا جس قدر احسان مانیں وہ کم ہو لیکن ظاہر ہو کہ باوجود اس شاہانہ اعانت کے خود قوم میں امداد کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے، اور اجتماعی قوت سے اپنے قومی اداروں کو چلانا چاہیے۔

اگر آپ اردو کو دنیا کی بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کی مانند ایک علمی و تعلیمی زبان بنانے کے آرزو مند ہیں امداد اس غرض سے انجمن ترقی اردو کے علمی مساعی کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں تو

لازمی طور پر آپ کو اُس کے مصارف کا بار برداشت کرنا چاہیے۔ یہ ممکن ہو کہ آئندہ انجمن کی مطبوعات کا کاروبار اس حد تک ترقی کر جائے کہ اُسے بیرونی امداد و عطایا سے بے نیاز کر دے لیکن بالفعل اُسے آپ کی مالی امداد کی سخت ضرورت ہو۔

حضرات! اس وقت انجمن کی سب سے بڑی ضرورت جو بلا تاخیر توجہ کی محتاج ہو یہ ہو کہ اس کے لیے ایک مستقل مکان و مستقر حسب ضرورت تعمیر کیا جائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ نئی دہلی میں ایک وسیع قطعہ زمین کا ملنا اب یقینی ہو گیا ہو اور انجمن کی مجوزہ عمارتوں کے لیے تین سال سے کچھ سرمایہ بھی جمع کیا جا رہا ہو لیکن ابھی مالی امداد کی رفتار بہت سست ہو اس کے علاوہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہو کہ اگر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی عمارتی سامان کی بچی گرانی رہی تو تعمیر کا پہلا سرسری تخمینہ جو دو لاکھ روپے کیا گیا تھا، ہرگز کافی نہ ہوگا۔ مجھے امید ہو کہ آنریری سکریٹری صاحب اس بارے میں آپ کو تفصیلی حالات بتائیں گے، میرا مقصد صرف یاد دلانا تھا کہ ایک مستقل و موزوں عمارت کی تعمیر انجمن کی سب سے مقدم و ناگزیر ضرورت ہو، جس کے لیے ابھی سے سرمایہ جمع ہونا چاہیے تاکہ مناسب وقت آنے اور حالات سازگار ہونے پر بلا تاخیر تعمیری کام شروع کر دیا جائے۔

حضرات! اب میں ایک اور مسئلے پر آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہو، وہ ’اُردو‘ کے تحفظِ حقوق کا مسئلہ ہو۔ واقعہ یہ ہو کہ موجودہ زمانے میں کوئی مسئلہ خواہ وہ خالص تعلیمی معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا زبان اور مذہب سے، ملکی سیاست سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو لیجیے جیسا کہ اس کے نام اور اساسی مقاصد سے ظاہر ہو وہ ایک خالص تعلیمی انجمن ہو اس لیے اس کے سالانہ اجلاس میں ہمیشہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مشکلات پر بحث کی جاتی ہو لیکن ان میں سے اکثر مسائل خصوصاً وہ جو حکومت کے تعلیمی احکام یا سرشتہ تعلیمات سے تعلق رکھتے ہیں کسی نہ کسی طرح سیاست کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ کانفرنس کے ہر سالانہ اجلاس میں جو رزلویشن پاس ہوتے ہیں اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہو کہ ان میں سے اکثر رزلویشن ایسے ہیں جو باوجود تعلیم سے متعلق ہونے کے

ملکی سیاست کے دائرے میں شامل ہیں۔

یہی کیفیت ان مسائل کی ہو جو اردو کے تحفظ و ترقی یا اردو ہندی کے قضیہ نامرضیہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ خالص لسانی و ادبی مباحث ہیں لیکن آپ روزمرہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے بہت سے ممتاز و مشہور سیاسی لیڈر جن میں اکثر غالباً فوقی ادب سے عاری ہیں ان لسانی مسائل سے کس قدر دل چسپی رکھتے ہیں ، ظاہر ہو کہ ان کی یہ دل چسپی محض سیاسی نقطہ نظر سے ہو۔

ان تصریحات سے میرا مقصد یہ ہو کہ چوں کہ بہ حالت موجودہ کوئی مسئلہ بھی یکسر سیاست سے جدا نہیں ہو سکتا لہذا زبان اردو کے تحفظ و ترقی کے سلسلے میں بھی ایسے مسائل پیش آ سکتے ہیں جو سیاسی نقطہ نظر سے بھی لائق بحث و گفتگو ہوں گے ، اور ان کے حل کرنے کے لیے آئینی جدوجہد یا ایجنڈیشن اور ملک کی عام رائے کو تیار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اب سوال یہ ہو کہ یہ جدوجہد کس جماعت یا قومی ادارے کا کام ہونا چاہیے ؟ میرا خیال ہو کہ یہ کام انجمن ترقی اردو کو انجام دینا چاہیے۔ یعنی جس طرح مسلمانان ہند کے تعلیمی معاملات کے متعلق آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس مسئلہ طور پر ایک ذمہ دار مرکزی جماعت ہو یا سیاسی معاملات کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ جدوجہد کرتی ہو، اسی طرح جو مسائل زبان اردو سے تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے انجمن ترقی اردو کو ایک مرکزی جماعت ہونا چاہیے جو اس سلسلے میں ذمہ دارانہ حیثیت سے ہر قسم کی جدوجہد کرتی رہے۔ اردو کے تحفظ و ترقی میں جو کام سیاسی نوعیت رکھتا ہو اس میں انجمن کی مرکزی حیثیت تسلیم کی جائے اور دوسرے علمی و ادبی ادارے جو زبان کی خدمت کر رہے ہیں اس معاملے میں انجمن سے تعاون کریں۔ اس تحریک کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو کہ ہندوستان کے دوسرے علمی یا ادبی ادارے جو اپنی اپنی جگہ مفید کام کر رہے ہیں ، انجمن ترقی اردو کے ماتحت ہو جائیں ، بلکہ مقصد یہ ہو کہ انجمن کی آواز کو علمی و لسانی اعتبار سے نہ سہی لیکن سیاسی اعتبار سے ہندوستان بھر کی اردو دنیا کی آواز تسلیم کیا جائے تاکہ انجمن قوم کی تائید و حمایت سے قوت حاصل کر کے زیادہ جرأت و استقامت سے اپنا فرض

انجام دے سکے۔ میں نے اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو، انجمن کے ابواب حل و عقد غور و بحث کے بعد تفصیلات طو کر سکتے ہیں۔ انجمن کو یہ حیثیت دینے کے لیے اگر اُس کے قانون اساسی اور ہیئت ترکیبی میں اصلاح یا ترمیم کی ضرورت پیش آئے تو اس میں بھی تاثر نہیں کرنا چاہیے۔ اُردو کانفرنس کے عام اجلاس میں بھی اس قسم کی تجاویز پیش کر کے اُن پر بحث کی جاسکتی ہو۔

بے شبہ تالیف و تصنیف کے ذریعے سے اُردو کے علمی و ادبی خزانے میں اضافہ کرنا بھی زبان کی ایک گراں قدر خدمت ہو لیکن اُردو جن خطرات میں گھری ہوئی ہو اُن کا تقاضا یہ ہو کہ اب اس دائرے کے باہر بھی قدم بڑھایا جائے اور ملک کے تمام علمی و ادبی اداروں کا تعاون حاصل کر کے اُردو کے تحفظ و ترقی کے لیے دوسری علمی تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔

اسی سلسلے میں یہ بھی ضروری ہو کہ آئندہ انجمن کو عام اُردو بولنے والوں کی انجمن بنایا جائے تاکہ عوام یہ محسوس کریں کہ وہ صرف علما یا مُصنّفین کی کوئی جماعت نہیں ہو۔ طریقہ عمل کی اس تبدیلی سے عوام کی دلچسپی انجمن کے ساتھ بڑھ جائے گی جو انجمن کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اس لیے یہ ضروری ہو کہ انجمن کی ممبری کے قواعد میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ ہر اُردو خواں کم از کم اُس کا معمولی ممبر بن سکے۔

انجمن کا صدر دفتر اگرچہ دہلی میں ہو لیکن انجمن کا دائرہ عمل چوں کہ دہلی تک محدود نہیں اس لیے انجمن کا یہ فرض ہو کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور بڑی ریاستوں میں اُردو کے سلسلے میں جو حالات پیش آئیں اُن سے باخبر رہے اور اُن کے متعلق ضروری تدابیر اختیار کرنے کی غرض سے ہر ایسے علاقے میں ایک نمائندہ انجمن یا جماعت قائم کر دے جو صوبے یا ریاست کے ایسے معاملات میں جو اُردو سے تعلق رکھتے ہیں مرکزی انجمن سے امداد و مشورہ حاصل کر کے حسب ضرورت کام کرتی رہے اور جو معاملات سارے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں مرکزی انجمن کی تائید و ہم آہنگی کا کام انجام دے البتہ اگر صوبوں یا ریاستوں میں کوئی نمائندہ جماعت قائم نہ ہو سکے تو مرکزی انجمن کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ہر صوبے یا بڑی ریاست کے صند مقام پر خود ہی کوئی اپنا نمائندہ مقرر کر دے

جو مختلف مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم کرنے کے علاوہ اُردو زبان کے متعلق ضروری معلومات انجمن کو فراہم کرتا ہے۔

حضرات! ہمارا ایک فرض یہ بھی ہے کہ ان سب ادبی اداروں کی خدمات کا اعتراف کریں جو کسی نہ کسی طور پر زبان اُردو کی خدمت میں مصروف ہیں، اسی سلسلے میں ہم سب کو خصوصیت کے ساتھ خسرو دکن د بار اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جن کی شاہانہ قیاضی و معارف نوازی کی بدولت جامعہ عثمانیہ وجود میں آئی اور جامعہ عثمانیہ کے لیے ”دارالترجمہ“ قائم ہوا جس کی وجہ سے مختلف علوم و فنون کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ علوم جدیدہ کے متعلق اعلیٰ تعلیم، مفید و بلند پایہ تصنیفات و تراجم کا اُردو زبان میں پیشینہا اضافہ ہو گیا۔

اسی طرح اعظم گڑھ کا مشہور و معروف علمی و ادبی ادارہ دارالمصنفین بھی ہمارے شکر لیے کا مستحق ہے جس نے اسلامی تاریخ اور ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی میاری کتابیں شائع کر کے ہمارے لٹریچر کا درجہ بہت بلند کر دیا ہے۔

ایم اے او کالج کے بانی سر سید مرحوم اور ان کے موفعا اور جانشینوں نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، آج بھی مسلم یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ قائم ہے جو مفید و لائق قدر خدمات ادبی انجام دے رہا ہے، اس شعبے کے صدر ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں شعبے کے دوسرے استاد بھی علاوہ اپنے تعلیمی فرائض انجام دینے کے تالیف و تصنیف کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

حضرات! اب آخر میں نکتہ زہن آپ سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صوبہ متوسط و بڑار کے حامیان اُردو کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کی حوصلہ مندی و ادولالعزیز کی وجہ سے اُردو کانفرنس کا یہ شان دار اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ اجلاس انجمن ترقی اُردو میں ایک حیات تازہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا اور اس کی عملی قوتوں کو تیز کر دے گا۔

میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے صبر کے ساتھ میری تقریر کو سنا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔



# سکرٹری کا بیان

—> ❦ <—

جناب صدر اور معزز حاضرین -

مجھے اس موقع پر انجمن کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو اصحاب یہاں تشریف رکھتے ہیں وہ کم و بیش اس کے حالات سے واقف ہیں۔ اس وقت صرف مختصر کیفیت اُس کارگزاری کی عرض کروں گا جو انجمن نے گزشتہ چند سال میں انجام دی ہو۔

آخر دسمبر ۱۹۳۵ء میں جب اول اول اس کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اردو زبان کے ادبی و علمی سرمے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی ۱۹۳۵ء تک پوری پوری پابندی کی گئی۔ انجمن اُس وقت تک کبھی کسی موقع پر اختلافی بحثوں میں نہیں پڑی تھی، حالانکہ اُس دوران مدت میں اردو پر بار بار سخت اور مُشد حملے ہوئے، اور باوجود اشتعال انگیز تحریروں، دل آزار تقریروں اور ناروا اور نازیبا پروپیگنڈے کے انجمن نے ہرگز اپنی حد سے قدم باہر نہ رکھا اور اپنی بساط کے مطابق جہاں تک سرمے نے مساعدت کی، کتابیں لکھنے لکھانے اور شایع کرنے میں لگی رہی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ انجمن کی زندگی میں یہ بڑا انقلاب تھا۔ یہ انقلاب اسی شور انگیز اور شور بخت سرزمین میں رونما ہوا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں اکل بھارتیہ سہیتیہ پرشد (نجمان اللہ کیا پیارا نام ہو) کے بھرے اجلاس میں جو ناگ پڈر یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا، گاندھی جی سے اردو ہندی کے متعلق گفتگو اور بحث ہوئی۔ اور اس کا جو انجام ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہو۔ پرشد کے فیصلے اور گاندھی جی اور ان کے رفقا کے

اس اعلان نے کہ وہ ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنا کر دیں گے، ہمیں خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ اُس وقت ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم سمجھے کہ کروں میں بیٹھ کر کاغذ سیاہ کرنے اور قلم لکھنے سے کیا حاصل، اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے اور کس کے لیے۔ آخر ہمیں انجمن کے اغراض و مقاصد میں ایک مقصد اور بڑھانا پڑا، اور وہ تھا ”اُردو زبان کی اشاعت و حفاظت“۔ انجمن اب میدان میں آئی۔ پہلی ہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے جاگ پور کا نام دیا کیوں کہ اسی نے ہمیں اور آپ کو جگایا تھا، ہم نے یہاں انجمن کی شاخ قائم کی، کانگریس گورنمنٹ کے وزیروں سے خط و کتابت کی، ملاقات کی، وفد لے کر گئے، اپنے مطالبے پیش کیے، اُردو کی حمایت میں چلے گئے۔ دُعا مندر کی اسکیم سے سب سے پہلے انجمن نے اختلاف کیا، اس بارے میں وزیرِ تعلیم سے ملاقات کی اور مراسلت بھی کی، گاندھی جی کو کھلی چٹھی لکھی۔ اس کے بعد یہ بحث کُجھ مسئلہ بن گئی۔ انجمن کے مستعد کارکن سید علی شہر نے اپنے رفیقوں کے ساتھ اس صوبے کا دورہ کیا اور شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں انجمن کے مقاصد کی تبلیغ کی اور انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ غرض جو جو تکرار طریقے ہو سکتے تھے عمل میں لائے گئے۔ اور اس کے بعض سرگرم ارکان خصوصاً حکیم اسرار احمد صاحب اور ابراہیم خاں صاحب، نواب صدیق علی خاں صاحب، نواب محی الدین خاں صاحب، مرزا اسماعیل بیگ صاحب نے جس جاں نشانی، بے جگری اور اشار سے کام کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب یہاں اُردو کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اُردو جسے یہاں کوئی مُتخہ نہیں لگاتا تھا آج گھروں میں، بازاروں اور جلسوں میں اسی کا بول بالا ہے۔ رخصتی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ یہاں کے کالجوں میں جہاں اُردو کی پُرسش نہ تھی اب اُردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر کالج میں بزمِ اُردو ہے اور ان کے علاوہ یونیورسٹی اُردو لٹریچر سوسائٹی الگ ہے جو اُردو کی خدمت انجام دیتی ہے۔ خاص کر خواتین نے اس بارے میں جو کام کیا ہے اور کر رہی ہیں وہ بہت قابلِ تحسین ہے۔ اس بنا پر اس صوبے کا انجمن پر اور انجمن کا اس صوبے پر بہت بڑا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے علی گڑھ اور دہلی کے بعد تیسری نکل ہند اُردو کانفرنس کا اجلاس یہاں منعقد کیا ہے۔ انجمن سے اس صوبے کا تعلق اتنا قوی ہو گیا ہے

کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

انجمن کے سکرٹری کی حیثیت سے یہاں تو خیر میں بار بار آیا لیکن ہندستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اسی غرض سے دُور سے کیے۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور)، جنوبی ہند میں مدراس، اندھرا، شمالی اکھاٹ، جنوبی اکھاٹ، ملیبار، ٹامل ناڈو، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جا کر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے ”کشمیر سے راس کماری تک“ کا فقو کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی ہو اور آپ کو یہ سن کر حیرت اور خوشی ہوگی کہ مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔ ان مقامات میں جگہ جگہ تقریریں کیں، اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اُردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، مدرسے کھولے۔ مترجمین کے جواب دیے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید۔ جہاں جہاں اُردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہو کر لڑے۔ کہیں کام یابی ہوئی کہیں ناکامی۔ کام یابی سے پھول کر عاقل نہ ہوئے اور ناکامی سے ہماری آس نہ ٹوٹی۔ ہم برابر کام میں لگے رہے اور یہی ہماری زندگی کا مشن ہو۔

اس جملے میں انجمن کی گزشتہ چند سالہ کارگزاریوں کا تفصیل سے تو کیا اجمال سے بھی بیان کر کے کا نہ تو کافی وقت ہو اور نہ سننے والوں میں اتنا صبر۔ لہذا نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند باتیں عرض کرتا ہوں یہ۔

(۱) پنجاب یونیورسٹی میں اُردو ادب کے امتحانات تو ہوتے ہیں لیکن ان کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اکثر طلبہ ناکام رہتے ہیں اور جو کام یاب ہو جاتے ہیں ان میں اُردو زبان و ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ امیدواروں کی عام خواہش اور ضرورت کی بنا پر انجمن نے اس غرض کے لیے دہلی میں اُردو کالج قائم کیا۔ جس میں ادیب، ادیبِ عالم، ادیبِ فاضل کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہو۔ اس کے نتائج نہایت اچھے رہے۔ اس میں پڑھانے والے سب عالم فاضل اور مخلص حضرات ہیں۔ علامہ پنڈت برج موہن دتاریہ کینی اس کے پرنسپل ہیں۔

اور تعریف کی بات یہ ہو کہ سب کے سب اعزازی طور پر کام کرتے ہیں۔

(۲) یورپین اور اینگلو انڈین جماعت میں ’اُردو‘ کو مقبول بنانے اور اُن کے مدارس میں ’اُردو‘ کی ترویج اور اصلاحِ نصاب کا مسئلہ بھی میرے زیرِ غور تھا۔ اس کے متعلق بعض یورپین مدارس کے پرنسپلوں سے مراسلت بھی کی۔ آخر اینگلو انڈین فرقے کے لیڈر سر ہنری گڈنی آں چانی سے مل کر اس بارے میں گفتگو کی۔ اُنھوں نے میرے اس خیال کی پُر زور تائید کی۔ میری اُن کی مراسلت شائع ہو چکی ہو۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوپی کے یورپین اور اینگلو انڈین اصحاب نے اپنی کمیٹی میں کافی غور اور بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اُن کے مدارس میں ’اُردو‘ دوسری لازمی زبان ہوگی اور اُس کا بدل کوئی دوسری ہندستانی زبان نہیں ہو سکتی۔ اور ہندی وہ اپنے مدارس میں نہیں پڑھائیں گے۔ علاوہ یوپی کے دوسرے صوبوں کے یورپین اور اینگلو انڈین مدارس میں بھی ’اُردو‘ پڑھائی جاتی ہو۔ تعلیمی امور کا فیصلہ اُن کی معتد اور با اثر مجلس بنام ”انٹر پرائونٹل بورڈ فار اینگلو انڈین اور یورپین ایجوکیشن“ میں ہوتا ہو۔ اس بورڈ میں مجھے اُنھوں نے اپنی لیگنویج کمیٹی کا ممبر بنا لیا ہو۔ اس کمیٹی کا ایک اجلاس گزشتہ سال دہلی میں ہوا اور دوسرا شملہ میں۔ مجلس کے فیصلے کے مطابق ان مدارس کے لیے ’اُردو‘ ریڈریس اور کتابیں مرتب کرائے کا کام میرے تفویض کیا گیا ہو۔

(۳) بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں ’اُردو‘ ایم۔ اے جماعتیں نہ تھیں۔ کئی بار تحریک ہوئی لیکن کسی ذمہ سے یہ معاملہ اتوا نہیں رہا۔ اب ان کالجوں میں ایم۔ اے کی جماعتیں کھُل گئی ہیں۔ اس میں انجمن کی کوشش اور امداد کو بھی دخل ہو۔

(۴) سب سے عجیب اور حیرت کی بات یہ ہو کہ دہلی یونیورسٹی میں سرے سے ’اُردو‘ تھی ہی نہیں۔ یہ کیسی ستم ظریفی کی بات ہو کہ مدارس اور ناگ پور کی یونیورسٹیوں میں تو ’اُردو‘ ہو اور نہ ہو تو دہلی یونیورسٹی میں۔ اس غرض سے انجمن کا ایک وفد دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم نے اپنے مطالبے پیش کیے اور دیر تک گفتگو رہی۔ ہمارے مطالبے قلم بند کر لیے گئے اور وعدہ کیا گیا کہ عنقریب یونیورسٹی کا نظامِ تعلیم تغیر و تبدل ہونے والا ہو اُس وقت ان امور کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

خدا خدا کر کے اب اُردو کو دہلی یونیورسٹی میں باریابی کا موقع ملا ہو۔

(۵) انجن نے سلسلہ میں ایک نئے کام کا آغاز کیا یعنی چھوٹا ناگ پور کے لیے رانچی میں اُردو مرکز قائم کیا۔ چھوٹا ناگ پور میں ہندستان کی سب سے قدیم اقوام آباد ہیں، آریوں اور دراوڑیوں سے بھی قدیم۔ وہاں رومن کیتھولک مشنریوں کا راج ہو، تاج سے نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے۔ پہلے تو مشنری ہم سے بدظن رہے لیکن جب انھیں اطمینان ہو گیا کہ ہم مذہب کی تبلیغ کرنے نہیں آئے تو بغرضی ہم سے تعاون کیا۔ اب ان کے تقریباً تمام مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہو۔ باوجود نامساعد حالات کے ہم اب تک کم و بیش ڈیڑھ ہزار اشخاص کو اُردو پڑھا چکے ہیں اور اس وقت تقریباً ۷۰۰ زیرِ تعلیم ہیں جن میں سے ساڑھے چار سو مختلف مشنوں کے عیسائی ہیں۔ دن کے مدرسوں کے ساتھ ہم نے مشینہ مدرسے بھی جاری کیے ہیں۔ اور رانچی کے علاوہ دیہات میں بھی مدرسے کھولے ہیں۔ دیہات کے یہ مدرسے پادریوں نے اپنی نگرانی میں لے لیے ہیں۔ سسٹان بچوں کے مدرسے الگ ہیں۔ مثلاً موضع اربا مسلمانوں کا گائو ہو وہاں ایک مدت سے لبریرائمری مدرسہ تھا لیکن لبریرائمری کے بعد ان بچوں کا تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ یا تو وہ اپرپرائمری میں جا کر ہندی پڑھتے یا تعلیم ترک کر دیتے تھے۔ موضع والوں نے ہمارے مرکز سے رجوع کیا اور مدرسہ انجن کی نگرانی میں دے دیا۔ اب یہ مدرسہ اپرپرائمری بنا دیا گیا ہو اور امید ہو کہ آئندہ مڈل تک پہنچ جائے گا۔ رومن کیتھولک مشنری بڑی مستعدی سے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنے اسکولوں میں ’رہ رائج کر رہے ہیں۔ ان کی ننین (Nuns) اور سسٹرس (Sisters) بڑے شوق سے اُردو پڑھ رہی ہیں۔ عجیب بات یہ ہو کہ عیسائی مردوں اور لڑکوں سے زیادہ عورتیں اور لڑکیاں شوق سے اُردو سیکھتی ہیں۔ ان کے املا کی کاپیاں میرے پاس آتی ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہو۔ چند مہینے میں وہ اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ جاتی ہیں اور خط تو ان کا ایسا اچھا ہو کہ ہمارے گریجویٹوں کو بھی رشک آئے۔ آخر سلسلہ میں ہم نے لارڈ بشپ رانچی کی خدمت میں ایک طویل خط لکھا جس میں اُردو زبان اور اس کی تعلیم کی اہمیت اور خصوصیت کے ساتھ عیسائی حلقوں میں اس کی ضرورت

کو بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ’اُردو‘ تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں ایک مختصر سی اسکیم بھی پیش کی گئی تھی۔ ہنگری نے ہمارے خیالات سے پورا اتفاق کیا، ہمارے مقصد سے ہم دردی ظاہر کی اور ہماری پیش کردہ اسکیم کو منظور کیا۔ یعنی روٹن کیتھولک کے دو ٹریننگ اسکولوں میں ’اُردو‘ کا جاری کرنا منظور فرمایا اور جنوری ۱۹۷۷ء سے ایک ٹریننگ اسکول میں جو آستانوں کا ہو ’اُردو‘ تعلیم شروع کر دی گئی۔

چنانچہ ۲۴ لڑکیاں اور وہاں کی مدر اور سسٹریں ’اُردو‘ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اُستادوں کے مدرسے میں فی الحال اس لیے انتظام نہ ہو سکا کہ جنگ کی وجہ سے رانچی سے مشن کے مختلف شعبے ایسے چھوٹے مقامات پر بھیج دیے گئے ہیں جہاں مدرس کے رہنے کے لیے جگہ نہیں مل سکی۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ دشواری کسی طرح رفع ہو تاکہ مردوں کے ٹریننگ اسکول میں بھی ’اُردو‘ تعلیم جاری ہو جائے۔ روٹن کیتھولک پادریوں میں ’اُردو‘ کا کافی شوق پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک جیسواٹ پادری فادر کرتوا نے خاص طور پر ’اُردو‘ زبان کی تحصیل کے لیے لکھنؤ اور دہلی کا سفر کیا۔ دہلی میں تقریباً دو ماہ تک وہ میرا مہمان رہا اور تمام وقت ’اُردو‘ زبان کے پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کرتا تھا۔ ایک دوسرا پادری (فادر فان اسکم) جس نے ہمارے مرکز میں ’اُردو‘ پڑھی لکھنی پہنچ گئے ہیں اور اب جلد دہلی آنے والے ہیں۔ اب ہماری نظر سنتھال پر گرنہ اور کریسٹنگ پر ہو اور اس بارے میں وہاں کے مشنریوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ کل ہی اطلاع پہنچی ہے کہ کریسٹنگ کے دس پادریوں نے ’اُردو‘ پڑھنی شروع کر دی ہے اور بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ چھوٹا ناگ پور ’اُردو‘ مرکز کے مہتمم سہیل عظیم آبادی صاحب نے جس غلوں اور سرگرمی سے کام کیا ہے وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ جمشید پور کا ’اُردو‘ کیریئم اسکول بھی ہمارے مرکز کی نگرانی میں آگیا ہے۔

(۶) کشمیر میں ہندی کو بڑی ہوشیاری اور عجیب ڈھنگ سے نصابِ تعلیم میں داخل کیا گیا ہے۔ ہندی نہ وہاں کی زبان ہے اور نہ اہل کشمیر کی طرف سے اس کا مطالبہ تھا لیکن بعض بیرونی اثرات کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا جس کے نتائج بہت ناگوار اور مضر ہوں گے۔ حکومت نے تعلیمی تنظیم کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اور اس کے ارکان بھی حکومت ہی نے انتخاب کیے تھے۔

کمیٹی نے کامل غور اور بحث کے بعد متفقہ طور پر یہ طو کیا تھا کہ جو طریقہ اس وقت رائج ہو وہی مناسب ہو۔ لیکن حکومت نے اس کی مطلق ہدایت کی۔ انجمن نے اس پر احتجاج کیا اور اپنے اخبار میں متعدد مضامین لکھے اور آخر کار میں خود وہاں گیا اور ڈیڑھ مہینے تک برابر کوشش کرتا رہا۔ چوں کہ اس کے تعلق کانفرنس میں رزلویشن پیش ہونے والا ہو لہذا یہاں تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۷) جو پور میں اُردو کے ساتھ جو نا انصافی برقی گئی ہو اس کا حال آپ سب صاحبوں کو معلوم ہو اور انجمن نے اس باب میں جو سعی و بلیغ کی وہ بھی آپ پر روشن ہو۔ اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہو۔ لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو پور کے مَدبرِ اعظم نے جس بے دردی اور بھونڈے پن سے اس کام کو کیا وہ نہایت قابلِ انوس ہو۔

(۸) آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ کابل کے ٹریننگ کالج میں اُردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ اس میں انجمن کی کوشش کو بھی دخل ہو۔ انجمن نے اس بارے میں افغانستان کے وزیرِ اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب سے مراسلت کی اور نواب صدیقار جنگ بہادر اور مولانا محمد سلیمان ندوی صاحب سے بھی وزیرِ اعظم کے نام خط لے کر بھجواے۔ شکر ہو کہ انجمن کی کوشش ٹھکانے لگی۔

(۹) ایک دوسری خوش خبری انجمن کی کامیابی کی تھی آپ کو یہ سناتا ہوں کہ اس مہینے کے شروع میں جنرل سکرٹری ادی باسی مہاسبا چھوٹا ناگ پور کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ سبھا نے اپنے اسکول میں اُردو کی پڑھائی لازمی کر دی ہو۔ ادی باسی سے مراد ہندستان کی قدیم ترین اقوام ہیں۔

(۱۰) لیکن اس نئے مقصد کے پیچھے ہم نے اپنے پہلے مقصد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ اس کے بعد سے ہماری مطبوعات کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو گئی اور ہم نے گزشتہ تین سال میں ۸۳ کتابیں طبع کر کے شائع کیں۔ انجمن نے اپنی تجویز کے مطابق جس کا خاکہ میں سال ہوے تیار کیا تھا، ایسے قدیم تذکرے جن کے نام کتابوں میں کہیں کہیں ملتے تھے مگر ان کا وجود ناپید تھا، بڑی جستجو اور صرف کثیر

سے بہم پہنچائے۔ ان میں سے بعض کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ تھا اور بعض کے دو ایک سے زیادہ نہ تھے۔ یہ تذکرے ہمارے قدیم شعرا کی سیرت، ان کے طرز خیال اور طرز بیان اور اُس زمانے کی معاشرت و تمدن کے سمجھنے اور صحیح تاریخ ادب لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انجمن نے ان سب کو صحت و احتیاط کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ نیز انجمن نے اُردو زبان کی قدیم کتابوں کی اشاعت یا ان پر تنقیدی تبصرے لکھ کر ملک کو اُردو سے قدیم سے روشناس کیا اور اُردو زبان کی تاریخ ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، جس سے یہ قول ایک فاضل نقاد کے اُردو کی عمر میں دو سو سال کا اضافہ ہو گیا۔ ان کتابوں سے ابتدائی زبان کی کیفیت اور ارتقائی نشوونما کی حالت معلوم ہوتی ہو اور زبان و ادب کے مؤرخ کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہو۔ ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ یہ کام انجمن نے کئی سال پہلے سے شروع کر رکھے تھے اور اب بھی جاری ہیں۔ انجمن نے مختلف قسم کی لغات کا سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تھا۔ جن میں سے بعض مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لغات، فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ تین جلدوں میں، فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ عربی اُردو اور ہندی اُردو کی لغات زیر ترتیب و تالیف ہیں۔

اس کے علاوہ دنیا کی متعدد اہم کتب کے ترجمے شائع کیے۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، سوانح، حفظانِ صحت، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ یہ ایک بیش بہا خزانہ ہو جو انجمن کی بدولت اُردو ادب کو حاصل ہوا ہو۔ کسی ادارے نے اُردو داں جلتے کے لیے علمی اور ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا۔

(۱۱) گزشتہ سال مولوی سید ہاشمی صاحب نے اصلاحِ رسم خط کے متعلق ایک تجویز پیش کی جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجی گئی۔ پھر ایک کمیٹی میں جس کے صدر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ہیں اس پر غور کیا گیا اور جو امور طے ہوئے اس کی رپورٹ ہماری زبان میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد مزید رائیں وصول ہوئیں۔ کل اصلاحِ رسم خط کی کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوگا۔ اور اس میں جو



اصلاحیں منظور ہوں گی ان پر عمل درآمد کی کوشش کی جائے گی۔

(۱۲) گزشتہ نمبر میں ہماری سائنس کمیٹی نے سائنس کی مختلف شاخوں پر کتابیں تالیف کرنے کا ایک سہ سالہ پروگرام بنایا۔ جس میں صراحت کے ساتھ یہ طو کر دیا ہو کہ ہر کتاب کا کیا موضوع ہوگا، کس قدر حجم ہوگا اور کون لکھے گا۔ اس سال سے کام شروع ہو گیا ہے۔ اس میں نیز رسالہ سائنس کی ترتیب میں جامعہ عثمانیہ کے سائنس کے پروفیسروں نے جو قابل قدر امداد دی ہو وہ بہت قابل شکر گزاری ہو۔

(۱۳) انجمن کے دو رسالے یعنی اردو اور سائنس پہلے سے جاری تھے دونوں سہ ماہی تھے۔

سائنس اب ماہانہ ہو گیا ہے۔ یہ رسالے جس پائے کے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور سائنس تو اپنی نظیر آپ ہو۔ ایک کمی تھی جو ہماری زبان کے اجرا سے پوری ہو گئی۔ یہ پندرہ روزہ اخبار بہت مقبول ہوتا جاتا ہو لیکن ضرورت اس امر کی ہو کہ اس کی اشاعت کثرت سے ہو تاکہ پڑھنے والے اپنی زبان کے موافق و مخالف حالات سے باخبر رہیں۔ باخبر رہنا زندگی کا لازمہ اور کام یابی کا پہلا قدم ہے۔ یہ پچھلے تین سال کی مختصر سی روداد ہو۔ ہندستان بھر میں انجمن ترقی اردو ہند ہی ایک ایسا ادارہ

ہو جو منظم طور پر تمام ہندستان میں اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہو اور مختلف مقامات پر اس کی شاخیں اسی اصول پر کام کر رہی ہیں۔ شاخوں کی اب ہم از سر نو تنظیم کر رہے ہیں۔ انجمن کی ترقی اور قوت باہمی تعاون اور یک جہتی پر ہو۔ اگر ہم نے اپنی کوتاہ اندیشی یا کم بینی یا کسی لالچ سے اس اتحاد میں رخصت پیدا کر دیا تو یاد رکھیے ہماری ساری قوت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اس کے بعد دوبارہ اس قوت کو واپس لانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس معاملے میں انجمن اشاعت اردو ناگ پورہ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہو کہ اس نے ملک کے حالات اور انجام پر نظر رکھ کر بڑے ایثار سے کام لیا اور اپنی سبھی کو انجمن ترقی اردو ہند میں ضم کر کے اتحاد و تعاون کی بے نظیر مثال پیش کی ہو۔ پھوٹ نے بہت سے گھر گھلے ہیں، عظیم الشان اور جلیل القدر سلطنتوں اور مہنہ دار اور باکار اداروں کو ان کی آن میں بٹھا دیا ہو۔ ہمیں اس سے خبردار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ حریف ہماری تاک میں ہو۔ اگر ہم نے باہمی اتحاد اور کامل جذبے سے یک دل و یک جان، یک رنگ و یک خیال ہو کر اس کام کی بنیادیں مضبوط کر دیں تو یقین جانیے ہندستان کی مشترکہ زبان اردو ہی ہو کے رہے گی۔

عبداللہ الحق

# اصلاح رسم الخط

(مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

— (۱۹۳۳ء) —

اس میں تو مطلق شبہ نہیں کہ ہندستان کے ہر حصے میں اُردو زبان نہ صرف سمجھی جاتی ہو بلکہ بولی بھی جاتی ہو اور ہندستان کے باہر جہاں کہیں اہل ہند کاروبار کی ضرورتوں سے جا کر بسے ہیں ، وہ اسی زبان سے کام لیتے ہیں ۔ لیکن تقریباً سے بڑھ کر اب زمانہ تحریر کا اور عام تعلیم کا آگیا ہو اور اس بات کی سخت ضرورت ہو کہ ہم اُردو کی تعلیم و تعلم اور اس کی طباعت میں ایسی آسانیاں پیدا کریں کہ غیر زبان والوں میں بھی اسے خوب دواج دیا جاسکے ۔ اُردو کے دوسرے ہی خواہوں کی طرح ، انجمن ترقی اُردو ان مسائل پر ایک مدت سے غور و بحث کرتی رہی ہو اور اس نے طرزِ تعلیم و تحریر میں بعض اصلاحات بھی کی ہیں جن کو عموماً پسند کیا گیا ۔ لیکن یہ جزئی اصلاحات ہیں اور جو حضرات ، اُردو کو لہجے کے ٹائپ میں چھاپنے کے شہ و مد سے حامی ہیں ، وہ ہمارے رسم خط میں اور زیادہ تبدیلیوں کا تقاضا کرتے رہتے ہیں ۔ انہی تقاضوں کی بنا پر کاتب الحروف نے گزشتہ سال چند تجاویز مرتب کی تھیں جن کو چھاپ کر خاص خاص اہل الرائے کی خدمت میں بھیجا گیا اور انجمن کے دفتر دہلی میں اسی مجلس ماہرین کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۳۳ء منعقد ہوا ۔ ذیل میں پہلے ابتدائی تجاویز کی نقل پھر مجلس کی روداد پیش کی جاتی ہو اور آخر میں وہ قراردادیں درج ہیں جو کل ہند اُردو کانفرنس ، لاہور میں مجلس اصلاح رسم خط نے منظور کیں ۔

ناظرین رسالہ اردو سے درخواست ہو کہ وہ اس تمام کارروائی کو بغور مطالعہ فرمائیں اور مناسب ہو تو اپنی رائے اور مشورے سے استفادے کا موقع دیں۔ یہ مسئلہ زبانِ اردو کی ترویج و اشاعت کے حق میں بڑی اہمیت رکھتا ہو۔ انجمن ترقی اردو چاہتی ہو کہ منظور شدہ اصلاحات کو اپنی مطبوعات میں اختیار کر لے اور ملک میں عام طور پر انھیں دواج دینے کی کوشش کرے۔

## ۱۔ ابتدائی تجاویز

### رسم خط کے متعلق چند تجاویز

(۱)

۱۔ ہماری تحریر میں بعض حروف منفصل اور بعض متصل ہیں۔ لہذا تحریر یکساں قاعدے کے تحت میں نہیں ہوتی۔ حرف منفصل کے بیچ میں آجانے سے لفظ لٹ جاتا ہو اور بعض صورتوں میں :-  
(۱) ایک رکن کے حرف اپنے اصلی جوڑے جدا بلکہ دوسرے رکن سے مل کر آتے ہیں، جیسے :-  
کریم، قرینہ، کھرچنا، کہ ان تینوں میں وسطی رکن کا ایک حرف ایک طرف، اور دوسرا دوسرے رکن کے ساتھ لکھا جاتا ہو۔

(۲) اس غلط بحث کی سب سے بدتر صورت وہاں پیدا ہوتی ہو جب کہ حروف منفصل مخلوط بھی ہوں یعنی

دھ، ڈھ، ٹھ اور الفاظ کے بیچ میں آئیں جیسے :- سدھنا، پڑھنا وغیرہ

جن میں دوپٹی ہ نہ صرف اپنے رکن بلکہ اصل حرف سے جدا لکھی جاتی ہو۔

۲۔ علامات مصدر، مفعول و مستقبل وغیرہ بلا کر لکھا جاتا ہو اور حروف متصل ہوں تو مرکب الفاظ

بھی بلا کر لکھ دیے جاتے ہیں جیسے :- جھینگنا، پیلنا، چھپلتا، سمجھیکا اور (ب)

ستوتی، رہبر، بیصبر، ہمعصر وغیرہ۔

۳۔ ہم آواز حروف عربی عام ہندی تلفظ میں ادا نہیں ہوتے اور ان کے لکھنے میں اکثر غلطیاں ہوتی ہیں۔

(ب) عربی کے بعض مرکب الفاظ خصوصاً حروفِ شمسی کا الف لام لکھا جاتا ہے مگر تلفظ میں نہیں آتا اور معمولی خواندہ لوگ ان کے پڑھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

(ج) 'ی' اور 'و' کی تین آوازیں آتی ہیں مگر ان کے اعراب ابھی مسلم نہیں ہوئے ہیں۔  
(د) بعض اور مخلوط حروف بھی زبان میں آتے ہیں جن کی تحریر کے لیے کوئی عام قاعدہ نہیں بنا ہے۔

### (۲)

صحیح تحریر نیز ٹائپ بنانے کی سہولت کے لحاظ سے میری تجویز یہ ہو کہ اڈل تو

(۱) خواندگی کی ابتدائی کتابوں میں لفظ کے ہر رکن کو علاحدہ لکھا جائے اور

(ب) دوسرے یہ ہو کہ حروفِ متصل کو بے قید تعداد بلا کر نہ لکھا جائے بلکہ اس عمل کو چار حروف تک محدود کر دیا جائے یعنی کسی ایک لفظ میں چار سے زیادہ حروف بلا کر نہ لکھے جائیں مگر مشدد اور غنت یا مخلوط ہائی آواز والے ایک حرف شمار ہوں گے

اس تجویز کے مطابق ابتدائی کتابوں میں مثلاً لفظ 'مصیبت' کی اِلا دُم صیبت

اور عام تحریر میں دُمصیبت ہوگی۔

(۲) دوسرا ایک ضروری قاعدہ یہ بنانا چاہیے کہ کسی رکن کا ایک حرف لفظ کے ایک جز میں

اور دوسرا جھگاندہ دوسرے جز میں بلا کر نہ لکھا جائے جیسے:۔ آجکل، گھر کنا، قرینہ وغیرہ

الفاظ میں بلادیا جاتا ہو۔ اگرچہ ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ بالکل بے اصولی

کی بات ہو اور مبتدی اور کم علم لوگوں کو اردو عبارت کے صحیح پڑھنے میں اس سے بڑی دشواری

پیش آتی ہو۔ میں تو یہاں تک سفارش کرتا کہ ایک رکن کے حروف کو دوسرے رکن کے ساتھ

بالکل نہ بلایا جائے لیکن چوں کہ ہم کسی بڑے تغیر سے بھی بچنا چاہتے ہیں لہذا اس تجویز پر قناعت

کی کہ ایک رکن کے حروف کو دو مختلف رکنوں کے ساتھ الگ الگ نہ ملایا جائے، صرف ایک اور رکن کے ساتھ ملا کر لکھنا جائز رکھا جائے یعنی گھر کنا اور قرینہ کو موجودہ اِطلا کی بجائے اس طرح لکھا جائے :- 'گھرکنا'، 'قری نہ'،

(ب) جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، مخلوط حروف ہا ہی وھ ، ڈھ ، ڈھ کے لکھنے میں اور بھی قباحت یہ پیش آتی ہے کہ خود حرف کا ایک جز (یعنی دوچپی ہ) اپنے اصل سے جدا لکھا جاتا ہے۔ لیکن دوچپی ہ سے مخلوط حروف بنانے کا طریقہ اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ اسے ترک کرنا دشوار ہو گا۔ البتہ میرے خیال میں یہ مناسب ہے کہ ہم ان تین مخلوط حروف کے لکھنے میں تھوڑی سی تبدیلی کر دیں اور ان حروف میں بھی دوچپی ہ کو اصل حرف سے بلا کر اس طرح تحریر کیا جائے :-  
ٹھ ، وھ ، ڈھ

خوش نویسی میں یہ صورت نئی نہیں ہے۔ دوسرے جب ہم نے مان لیا ہے کہ یہ جداگانہ مخلوط آواز کے حرف ہیں تو ان کی تحریر میں عربی فارسی قواعد کی پابندی لازمی نہیں سمجھنی چاہیے۔ ہم نے اپنی ضرورت سے ب ، پ سے بھ ، پچھ کی شکلیں ایجاد کر لی ہیں تو منفصل حروف مخلوط کی شکلوں میں بھی حسب ضرورت تصرف کر سکتے ہیں۔

۴۔ علامات مصدر وغیرہ ہر قسم کے لاحقے اور سابقے جو اصل مادے میں یعنی عموماً صیغہ امر پر اضافہ کیے جاتے ہیں ان کو بلا کر نہ لکھا جائے بلکہ جدا تحریر کیا جائے جیسے :- لکھنا ، سنبھلنا ، بیٹھ کر وغیرہ۔

(ب) مرکب الفاظ کے اجزائے ترکیبی کو لازماً علاحدہ علاحدہ لکھا جائے جیسے :-

بل و نت ، کن کٹا ، بے دل وغیرہ

ضروری تاکید | جب کہ ہم بعض صورتوں میں متصل حروف کو بھی الگ الگ لکھنے کی سفارش کر رہے ہیں، الفاظ کو جگہ چھوڑ کر لکھنا پہلے سے بھی زیادہ

ضروری ہو جائے گا۔ اس وقت بھی جو لوگ لفظوں کے درمیان کافی فصل نہیں چھوڑتے وہ

غلطی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے یہاں لفظ کے ختم ہونے کی کوئی علامت مروج نہیں ہو اور نہ اسے ایذا دہانے کی اب سفارش کی جاتی ہو۔ لیکن قلمی تحریر میں ہر لفظ کو دوسرے سے الگ کر کے لکھنا چاہیے اور پتھر کے چھاپے میں پنجاب کی درسیات یعنی چار خانے کا مسطر اور الفاظ کے درمیان لازماً ایک خانہ چھوڑنے کا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ ٹائپ میں ہر لفظ کو فصل دے کر لکھنا نسبتاً سہل ہو اور اس پر عموماً عمل بھی کیا جاتا ہو۔

۵ — ہم آواز عربی حروف کی پانچ قسمیں ہیں :-

۱ - ع

ت - ط

ث - س - ص

ح - ہ

ز - ذ - ض - ظ

ہندی لوگوں کا ان آوازوں کو الگ الگ ادا کرنا تکلف سے خالی نہیں۔ خصوصاً تیسری قسم کی تین اور آخری قسم کی چار آوازوں کا علاحدہ تلفظ کوئی نہیں کرتا اور ان کی اِلامیں بھی غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہو کہ ان حروف کے بکثرت الفاظ ہماری زبان میں رائج ہو چکے ہیں اور ان میں کوئی انقلابی اصلاح کی جائے تو ہمارے طلبہ کو پچھلی کتابوں سے استفادہ کرنا مشکل ہو جائے گا اور عربی فارسی تحریر سے دُوری بھی اہل اُردو خصوصاً مسلمانوں میں مقبول نہ ہوگی۔ ان تمام مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر میری تجویز یہ ہو کہ اُردو میں ان پانچ قسموں کے صرف دو دو حرف سے کام لینا جائز قرار دیا جائے اور حروف ص ، ز ، ض کو قاعدہ ابتدائی کے آخر میں بچوں کو پڑھا دیا جائے کہ وہ ان کی شکلوں سے نا آشنا نہ رہیں۔

دب ، اُردو کی اِلامیں ص ، ض اور ز کو ترک کر کے ص کی بجائے س اور ژ اور ض کی بجائے ذ اور ظ سے کام لیں ، ان کو مورد اعتراض نہ بنایا جائے۔

فل ہم نے ز کو ترک کرنا اس لیے جائز قرار دیا ہو کہ اس شکل کے اُردو میں چار حرف موجود ہیں اور ض کا صحیح تلفظ تو اُردو داں کیا عربی داں حضرات میں بھی محل مناقشہ بنا ہوا ہو۔ پھر، اگر ہم ض کو چھوڑیں تو اس کی بہن ص کی بجائے بھی س سے کام لے سکتے ہیں۔

فس اگرچہ صحیح مخرج کے اعتبار سے ز کی بجائے ظ اور ض کی بجائے ذ کا استعمال بہتر ہوتا۔ لیکن صورت کی مناسبت سے لوگ غالباً ز کو ذ اور ض کو ظ سے بدلنا پسند کریں گے۔  
فس واضح رہے کہ ہم اس تبدیلی کو صرف جائز قرار دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ لازم کر دینے پر مصر نہیں ہیں۔

۴ — عربی حروف شمسی و قمری کا اُردو میں فرق اُٹھا دیا جائے اور مرکب الفاظ میں جب پہلے لفظ کے آخر فتح ہو تو الف لام کو ساکت نہ کیا جائے بلکہ جس طرح وہ قمری حروف سے مل کر ادا ہوتا ہو، اسی طرح جملہ حروف سے مل کر ملفوظ ہو۔ یعنی جس طرح اہل القمر میں بولا جاتا ہو اسی طرح اہل الشمس، اہل الدین وغیرہ شمسی حروف سے ملا کر بھی بولا جائے۔ یعنی (قاعدہ عربی کے مطابق) ا، ل کو چھوڑ کر ملنے والے حرف کو مشدد نہ کیا جائے۔

اکثر مستشرقین یورپ اسی قاعدے پر عمل کرتے ہیں تاکہ جو حروف تحریر میں آئیں وہ زبان سے بھی ادا ہوں۔

(ب) جب پہلے ترکیبی لفظ کے آخر میں فتح یا کسر ہو اور اسے دوسرے جز کے لام سے ملا کر پڑھا جائے اور الف ساکت ہو جیسے:۔ ابن اللہ، بالفعل، بالکل، وغیرہ میں تو الف پر گول جزم بنا دیا جائے اور ایسے جزم کو ہر جگہ حرف کے غیر ملفوظ ہونے کی علامت قرار دیا جائے۔ واضح رہے کہ عربی تحریر میں حرف پر اعراب نہ ہونا اس کے ساکت ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہو لیکن اُردو میں بلا اعراب کا حرف مفتوح قرار دیا گیا ہو لہذا ہمیں ساکت حرف کے لیے الگ علامت بنانی چاہیے جیسا کہ اذہر تجویز کی گئی۔

۵ — و اور ی کی تین آوازوں کو ادا کرنے کی انجمن ترقی اُردو نے علامتیں تجویز کی ہیں۔ لیکن

میرے خیال میں ماقبل مفتوح اور معروف لکھنے کے جو قاعدے سری اور فارسی اور اُردو میں اب تک رائج رہے ان کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہو۔ البتہ ہمیں مجہول آواز کے لیے جو ہندی لب دہجے کی خصوصیت ہو، جداگانہ علامت بنالینی چاہیے۔ اس کے لیے ہم اُنٹا جزم مقرر کر سکتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوگا کہ یہاں یہ حرف اپنی پوری آواز نہیں دیتا۔ جیسے :- ہو، یو، کو۔ اور۔ لے، وئے وغیرہ میں۔ غالباً اس علامت کا مطلب ناواقف لوگ بھی آسانی سے سمجھ لیں گے۔

(ب) و اور ی مجہول کی یکساں علامت قرار دینے کے بعد ہم و کی طرح ی کی بھی صرف ایک شکل سے ہر جگہ کام لے سکیں گے۔ چھوٹی اور بڑی سے کا فرق کرنے اور پتوں کو الگ الگ پڑھانے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

۸۔ ا اور و کی مخلوط آواز جو فارسی اور انگریزی الفاظ میں اکثر آتی ہو۔ جیسے :- خواہر۔

Lord - Ball - Hall وغیرہ ہیں۔

(ب) ہندی الفاظ میں یاے مخلوط کی آواز جیسے :- کیا، پیار وغیرہ میں۔

(ج) ہندی یا غیر زبانوں میں دو حرفوں کی مخلوط آواز جیسے :- تسانگ۔ کرشن وغیرہ۔

ان سب صورتوں کے واسطے میرے خیال میں مخلوط حروف کے نیچے خط کھینچ دینے کا طریقہ عام طور پر مستعمل اور مروج کر لیا جائے، یا اور کوئی امتیازی علامت مقرر کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے رسم الخط کا امتیازی وصف حروف کو ہلا کر لکھنا ہو اور اس میں وقت اور جگہ دونوں کی کفایت ہوتی ہو لیکن اول تو حروف منفصل کی موجودگی سے یہ خصوصیت جملہ الفاظ میں قائم نہیں رہتی۔ دوسرے بڑے بڑے لفظ اور علمی اصطلاحات یا غیر زبانوں کے اعلام و اسما کا صحیح اعراب کے ساتھ لکھنا پڑھنا وقت سے خالی نہیں ہوتا۔ اب جب کہ ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہو رہا ہو اور وہ محض بول چال اور شعر شاعری ہی کی نہیں، بلکہ درسی اور علمی زبان بن گئی ہو، ہمیں صحیح تحریر اور پڑھنے پڑھانے کی سہولت نیز ٹائپ بنانے کی آسانیاں



دیکھ کر اتصالی حروف کے رواج کو محدود اور خاص خاص اصول کا پابند بنانا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ جو اصلاحی تجویزیں اس وقت پیش کی گئی ہیں ان میں یہ مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو کہ موجود رسم الخط میں کوئی انقلابی یا اساسی تغیر نہ کیا جائے جسے قبول کرنا لوگوں کو دشوار ہو یا جس سے ہماری طریقہ تحریر بالکل بدل جائے۔

۲۔ رُوداد مجلس منعقدہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء

## کمیٹی اصلاح رسم خط

(مرتبہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب مدینی)

{ اس رُوداد کی اشاعت کا مقصد یہ ہو کہ دوسرے حضرات بھی زیر بحث مسائل پر غور فرمائیں اور اگر چاہیں تو اپنی رائے یا کسی تجویز سے اطلاع دیں تاکہ انجمن کو آخری فیصلہ کرتے وقت زیادہ سے زیادہ آرا سے استفادے کا موقع ملے۔ ]

(سکرٹری انجمن ترقی اردو)

اردو رسم خط کو متعلق چند تجویزوں پر غور کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو (دہند) کو دفتر واقع دریا گنج، دہلی، میں کمیٹی کا اجلاس ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء کو ۱۱ بجے صبح منعقد ہوا جو اسی دن تیسرے پہر برخاست ہوا۔

حسب ذیل صاحبوں فی شرکت کی :-

- ۱۔ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔
- ۲۔ پنڈت برجہوہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی۔
- ۳۔ مولوی دہاج الدین صاحب کنٹوری۔
- ۴۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔

۵۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق (داعی)

حسب ذیل تجویزیں منظور کی گئیں :-

۱۔ سفارش کی جاتی ہو کہ اردو کی کتابت اور خاص کر چھاپی میں ان امور کی پابندی کی جائے۔

(۱) دو لفظوں کے درمیان واضح فاصلہ رکھا جائے اور یہ فاصلہ یکساں ہو نیز یہ فاصلہ اس فاصلے سے زیادہ ہو جو ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں رکھا جائے۔

دب) ایک لفظ کو اوپر دوسرا لفظ یا ایک حرف کو اوپر دوسرا حرف کسی حالت میں نہ لکھا جائے، یعنی ”سرفراز“ لکھا جائے نہ کہ ”سرفراز“، ”درد“ لکھا جائے، نہ کہ ”درد“، ”گھبراہٹ“ لکھا جائے نہ کہ ”گھبراہٹ“۔

(رج) مرکب لفظ، جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنی ہوں، آپس میں ملا کر نہ لکھی جاویں، بلکہ ہمیشہ الگ الگ لکھی جاویں، البتہ ان کے درمیان میں فاصلہ صرف اتنا ہو جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں، جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہوگا:- جیسو آج کل - بن مانس - پن ڈبئی - کل جنگ - کل منہا - کل دار - شاہ نامہ - شاہ جہاں آباد - شاہ جہاں پور - جڑ پور - اودھ پور - فرخ نگر - ناگ پور - کان پور - دل لگی - گل کاری - پھل کاری -

(د) بعضو مفروضہ دو طرح لکھ جاتی ہیں: بی بی اور بی بی، دل دل اور دل دل ان کی منفصل لکھاؤں اختیار کی جائے اس طرح :-

کھل جی - جھٹ پٹا - جھن جھنا - کُن کُنا - ہل پل - محل مَلا - رس مَلا - لس سا - کھٹ کھٹانا -  
کھٹ کھٹاہٹ - کمن کھٹانا - کمن کھٹاہٹ - دانٹا کِل کِل - جمن جھٹ -

(۷) ہمزه جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو بالکل جدا لکھا جائے ، اس طرح پر کہ اس کے لیے کوئی شوشہ نہ ہو اور نہ ہمزه کسی حرف کے اوپر لکھا جائے ، بلکہ یوں ہو :-

آہی آہی آہیں بھادی ناہی ملاہی بھلاہی بُراہی رُہی اُہی سُہی سُہیاں دھویں  
دُہیں دُہیاں آہی چاہی مٹاہی کھاہی ترش رُہی بدخوہی عیب جوہی یوسف زہی زاہل قاہل

طاوڑ ماول گھاوِل ساوِل زاءوِ قاءوِہ قائم داوم داوڑ ساوڑ لاطاوِل ضاءوِ شاءوِ جراءوِ  
وظاءوِ تاوِید ساوِیس رعوِیس عزراوِیل میکاوِیل [ خد عربی میں اِن لفظوں کی لکھاوٹ کو  
دیکھیو :- براءۃ قراءۃ سموٰل ]

(دو) فارسی لفظ بہ، نہ، چہ، کہ، بی وغیرہ جو خود فارسی میں بھی کبھی دوسری لفظ سے ملا کر اور کبھی  
الگ لکھو جاتی ہیں، اُردو عبارت میں الگ لکھو جائیں، جیسو  
برخوبی، بہر حال، بہ کمال شفقت، بہ دولت، نہ خورد، نہ گفت، چہ کنم، چہ می گوئی،  
چہ می گوئی ایاں، حال آں کہ، بل کہ، چون کہ، چناں چہ، غرض کہ، تا وقت کہ، بہ شرط کہ، بی شک، بی تحاشا  
بی محابا، وغیرہ۔

بسی سے کو جو خاص کر ٹاپ میں دقتیں پیدا کرتی ہو اور اکثر بہت بد نما ہوتی ہو، قطعاً ترک  
کر دینا چاہیو۔ اس کی جگہ آدھو داوڑی والی کو سے کام لیا جائو اور جب کو سے پہلو مفتوح حرف  
ہو، تو بھی کو آدھو داوڑی کی ہو مگر اس پر جزم ضرور ہو، جیسو جو شئی جو فی ہو۔  
دھ دھ دھ ٹھ لکھو میں دو دو حرف ہیں۔ حال آں کہ ایک ہی ایک آواز کو ادا کرتی  
ہیں۔ ان کو ملا کر لکھنا چاہیو اور منفصل حرف قرار دینا چاہیو، یعنی کسی حال میں اگلے حرف سے نہ  
ملیں۔ اس طرح ان کی شکلیں یہ قرار پاتی ہیں :-

دھ (یا دھ)، ڈھ (یا ڈھ)، ٹھ (یا ٹھ)

مثالیں :- دھن (بہ جای دھن) ادھورا (بہ جای ادھورا) اسی طرح دھان، دھرتی،

دھرم، دھوبی، ڈھولی، ڈھانپ، کاٹھنا، کلہ ائی، ڈیلہ وغیرہ۔

نون غمّہ ہمیشہ منفصل لکھا جائو اور شکل اس کی یہ ہو : ن۔

مثالیں : بانس، پھانس، پھنس، کھونس، ہنس، دھ یہ سن کر ہنس گا، سن گھاڑی کھان

بکتو ہیں ؟

۵۔ عربی لفظوں کی کتابت۔ کو متعلق سفارش کی جاتی ہو کہ

(د) ان، عن، من، فی (جو خود عربی میں الگ لکھی جاتی ہیں) اُدو میں بھی دوسری لفظ سے بلا کر نہ لکھی جائیں۔ بل کہ یوں لکھنا چاہیو: ان شاء اللہ، عن قریب، من جانب، فی صد، فی کس وغیرہ۔

البتہ جب ایسی کسی لفظ کے بعد عربی کی ضمیر آئے تو وہ بلا کر لکھی جائے جیسو عنہم، عنہ، منہ، منہم، فیہا۔

(ب) عربی کے حرف تعریف (آل) کی کتابت کے متعلق طے ہوا کہ :-

(۱) آل کے بعد کلا لفظ اگر قری حرف (یعنی ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ، ی میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہو، اور آل سے پہلے بھی کوئی لفظ آکر اُس سے مرکب ہوا ہو تو آل کی صرف الف پر گول جیم (بطور سکوت کی علامت کے) ہو؛ اس طرح: ہائل، بالغ، عبد الجبار، عبدالقادر

(۲) آل کے بعد کلا لفظ اگر شمی حرف (یعنی ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ل، ن، م میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہو تو آل کی ل پر سکوت کی علامت ہو۔ الف پر ضرورت نہیں؛ لیکن اگر آل سے پہلے کوئی عربی لفظ آکر اُس سے مرکب ہوا ہو، تو الف اور آل دونوں پر (اسی طرح سے: اُل) سکوت کی علامت ہو، جیسو "السلام علیکم"، "مگرہ علیکم السلام"۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہو کہ الف پر سکوت کی علامت ہو، ل خالی رہے مگر شمی حرف پر تشدید ضرور لگائی جائے۔ اس صورت میں سیکھنے والے کو یہ بتایا جائے کہ اگر ل کے بعد والے حرف پر تشدید ہو، تو ل تلفظ میں نہ آئے گا۔

(ج) وہ عربی لفظ (یا نام) جو خود عربی میں دو طرح لکھی جاتی ہیں اُن کی اُس لکھاؤ کو اختیار کرنا چاہیو جو اردو لکھاؤ کے مطابق یا اُس سے قریب ہو اور ان کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ فارسی والوں نے انہیں بلا کر لکھنے پر اصرار کیا مگر یہ سراسر بوجا اور غلط ہے۔

(۱) ابراہیم      ابراہیم  
 سلیمان      سلیمان  
 لقمن      لقمان  
 شیطن      شیطان

(۲) اسمعیل      اسماعیل  
 رحمن      رحمان

(۳) حیوۃ      حیاء  
 نجوۃ      نجاة  
 ربو      ربا  
 منوۃ      مناة

(۴) زکوۃ      زکاة  
 صلوۃ      صلاة  
 مشکوۃ      مشکاة

فائدہ۔ عربی میں ان لفظوں کی پہلی لکھاوٹ بہت پُرانی ہو اور جب قرآن کا متن پہلے پہل لکھا گیا تو یہ لکھاوٹ اختیار کی گئی۔ اس کے بعد اس کو بدلتا پسند نہیں کیا گیا اور اب تک ہر حرف اُسی پُرانی صورت اور ہیئت میں موجود ہے۔ مگر جب عربی میں کتابت کے اصول مقرر کیے گئے تو یہ لفظ پُوری الف سے لکھو گئے اور اسوا قرآن کے عربی کتابوں میں اکثر وہ بیش تر پوری الف والی لکھاوٹ پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ بڑی مستند کتابوں میں جب قرآن کی آیتیں نقل ہوئی ہیں اور ان میں ایسے لفظ آئے ہیں تو بھی پُوری الف سے لکھو گئے ہیں۔

(۵) عربی کی ؓ کو اُردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیو۔

وہ عربی لفظ، جن میں الف مقصورہ لکھنا غلط ہو دیگر لوگ نادانستہ ان میں بھی مقصور الف

لکھ دیجو ہیں جیسو استیعفی، ارتفعی، اجتبی، اصطفی، صبح طریقو سر لکھو جاییں یعنی یوں استعفا، ارتضا، اجتبا، اصطفی۔

دو، عربی میں جو لفظ الف مقصورہ سر لکھو جاتی ہیں اُردو میں وہ معمولی الف سر لکھو جاییں اور ان کی تفصیل یہ ہے :-

اعلیٰ، ادنیٰ، اذلیٰ، علیٰ حالہ، علیٰ جدہ، مؤلیٰ، مولانا، مُعلیٰ، مُصلیٰ، مُعفیٰ، مجلیٰ، مرثیٰ، مُعترِیٰ، مدعیٰ علیہ وغیرہ۔ ان میں بہت سو لفظ اُردو (اور فارسی) میں معمولی الف سر لکھو جاتی ہیں، جیسو مُربا، مُعرا، مُصلا، مُمتا، مُنتقا، تقاضا، تماشا، تمنا، تبرّا، تولّا۔ کچھ لفظ دونوں طرح لکھو جاتی ہیں، جیسو مولّا (یا مولیٰ) مولانا (یا مولینا)، مُعلّا، مدعا علیہ۔ کچھ ایسے ہیں کہ ایک زمانے میں سیدھی الف سر لکھو جاتی تھیں مگر لوگوں نے رجعت کی اور وہ پھر الف مقصورہ سر لکھو جانی لگو جیسو اعلا، ادنا، اذلا۔ ”علیٰ مدّۃ“ دو لفظ ہیں (اور عربی میں کبھی ہلا کر نہیں لکھو جاتی) مگر اُردو والی ان کو ہلا کر لکھتی ہیں ”علحدہ“ یا ”علحدہ“ بہتر ہے کہ ”علاحدہ“ لکھا جائے ان سب لفظوں کو یوں لکھنا چاہیو: ادنا، اعلا، اؤلا، اؤلا، مؤلا، مولانا، مدعا علیہ، متوقفا، مستثنا، صلّ علا، مجلّا، مُمتا، مُربّا، علاحدہ۔ ناموں کو بھی یوں لکھ سکتے ہیں: میسا، مؤسیٰ، مصطفیٰ، مرتضیٰ، کسرا، صغرا، کبرا وغیرہ۔

۶۔ فارسی اور عربی کے سوا کسی غیر زبان کا لفظ اُردو میں لکھا جائے تو اس کو صوتی ٹکڑوں کو، جہاں تک ہو سکے، الگ الگ کر کے لکھنا چاہیو؛ جیسو (انگریزی) :- ان فارل، انس پک ٹر، مس ٹر، ہم ستر، ڈاک ٹر، ک لک ٹر، ادورسی عر، سڑپو واء زر، انس ٹی ٹیوٹ، کانگ رس، کان فرس، یونی ورٹی، سوپر ان ٹن ڈنٹ، ٹولی فون، ری ڈیو، اس ڈیشن، ڈی پارٹ منٹ۔

کینیڈا کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ کسی غیر زبان کے لفظوں کو ٹھیک ٹھیک تلفظ کے مطابق ادا کرنے کے لیے یہ تدبیر ناکافی ہے اور لغت اور لسانیات وغیرہ کی کتابوں کے لیے ہر زبان کی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر

۷۔ خود عربی میں اس قسم کے لفظ بعضی حالتوں میں معمولی الف سر لکھو جاتی ہیں جیسو اعلاہم، ادناک، مولائی وغیرہ۔

زیادہ تفصیلی تجویزیں عمل میں لانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ کسی آئندہ موقع تک ملتوی رکھا جائے۔

۷۔ رسم خط کو زیادہ آسان بنانی کی غرض سے چند اور تحریکیں بھی پیش ہوئیں جن پر دیر تک بحث ہوئی کہ بعد ازاں یہ تعلیمی ضرورتوں خاص کر بالعموم کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ان امور کی سفارش کی جائے :-

(۱) مصدر یا کسی صیغہ کو آخر میں جو نا (نی، فی، تا، تی، قی، وغیرہ) آتی ہیں وہ (اضل یا مادی) کو جدا کر کے لکھو جابیں، جیسو، لانا، لانا، لاتی، لائیں، دونا، دونی، دونی، لکھنا، لکھتی، لکھتی، لکھتیں، سمجھنا، سمجھتی، سمجھتی، سمجھنا، سمجھنا، دل دانا وغیرہ

(ب) آ، ہی، دھل اور حروفِ علت آ اور و کی تفصیل حروف میں شامل کی جائے اور کتابت کی سورتیں، تلفظ کے مطابق، اس شکل سے ہوں :-

معروف	ما قبل مفتوح	مجهول
بی ن	بُن	بُر
پی ،	پُن	پُر
شہر	صُود	شُور
پنی ٹھ	پُنْٹھ	پُرْٹھ
کی لا	کُلاش	کُلا

(ج) خواندگی کی ابتدائی کتابوں میں لفظ کا ہر صوتی ٹکڑا (یا رکن) علاحدہ لکھا جائے اور نزدیک متعلق کسی حال میں چار سے زیادہ ملا کر نہ لکھو جابیں، مثلاً

بجلاو، ”مسیبیت“ کو ”مُصیبت“ بجلاو ”قرینہ“ کو ”قَرینہ“ بجلاو ”گھرکنا“ کو ”گھرکنا“ کینٹی کی نزدیک اس تجویز میں ایک ترمیم یہ کی جاسکتی ہے کہ لفظ کا پہلا حرف اگر ایک صوتی رکن ہو مگر متبصل حروف میں سے ہو تو وہ الگ لکھوئی سو الگ نہ کیا جائے نیز مشدّد حرف دوبارہ نہ

لکھا جاسی یعنی بجاوی ”ق ر ی نہ“ کی ”ق ر ی نہ“ اور بجاوی ”ع ز ت“ کی ”ع ز ت“ لکھا جاسی۔  
 اس امر کا آخری فیصلہ کہ ان دونوں میں سے کون سی صورت زیادہ مناسب ہوگی ان اصحاب کی راہ پر چھوڑنا چاہیو جن کو تعلیم اور خصوصاً بالغوں کی تعلیم سے تعلق ہے۔  
 فائدہ - ان تینوں تجویزوں کے متعلق یہ بات بھی بحث میں آئی کہ شاید اس تجویز پر یہ اعتراض ہو کہ اگر ابتدائی تعلیم میں اس طرح کی سہولت بہم پہنچائی گئی تو جن لوگوں نے اس ڈھنگ سے پڑھنا سیکھا ہوگا وہ معمولی چھپی ہوئی کتابوں کو نہ پڑھ سکیں گے۔ اس کی کمیٹی یہ بتا دینا چاہتی ہے کہ اس طریقہ سے تعلیم کے صرف ابتدائی مرحلوں میں کام لیا جائے گا اور جب پڑھنے والی ترقی کر لیں گے تو انہیں حرفوں کے مروج جوڑ توڑ بنا کر ان کی مشق کردادی جائے گی اور یہ ہرگز دشوار نہ ہوگا۔

## تجاویز اصلاح رسم خط

[منظور کردہ مجلس ذیلی گل ہند اردو کانفرنس، ناگ پور]

۲۱ جنوری ۱۹۳۷ء کو حسب اعلان رسم خط کی ذیلی مجلس کا، ناگ پور کانفرنس کے شاندار پنڈال میں اجلاس ہوا۔ قریب قریب چالیس حضرات نے شرکت فرمائی۔ انجمن کی رسم خط کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر عبدالشار صاحب مدنی کو شش کے باوجود، ریل کے بروقت آباد سے نہ چلنے کے باعث تشریف نہ لاسکے۔ عبدالرحمان صاحب مدنی ایم، اے، ال، اے (کلکتہ) نے جلسے کی صدارت فرمائی۔

انجمن کی کمیٹی نے اس باب میں جو تجاویز اپنے ۲۲ مارچ ۱۹۳۷ء کے اجلاس میں مرتب کی تھیں، وہ یکے بعد دیگرے پیش ہوئیں اور کافی غور و مباحثہ کے بعد خفیف ترمیم و اضافے کے ساتھ منظور کی گئیں۔ یہ تجاویز ۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کے اخبار ”ہماری زبان“ میں شائع ہو چکی



ہیں۔ مختصاً دوبارہ ذیل میں تحریر کی جاتی ہیں :-

۱۔ کتابت اور خاص کر چھاپے میں دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے۔ ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ نہ لکھا جائے۔ مرکب الفاظ کو بلا کر نہ لکھا جائے۔ جیسے :- آج کل۔ کل جگ۔ نکل کاری وغیرہ۔ اسی طرح ایسے مفرد الفاظ بھی جو دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، آئندہ منفصل ہی لکھے جائیں۔ جیسے : بی بی۔ کھل بلی۔ جھٹ پٹا۔ جھن جھناہٹ۔ ہل چل وغیرہ۔ اور فارسی حروف ب، ہ، ذ، چ وغیرہ کو بھی بلا کر نہ لکھا جائے بلکہ علاحدہ تحریر کیا جائے۔ جیسے : بہ خوبی۔ بہ ہر حال۔ چناں چہ۔

۲۔ ہمزہ جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جُدا کا نہ لکھا جائے اور اس کے لیے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے۔ جیسے : آءی۔ ناءِی۔ ساءِی۔ گھاءِی۔ وغیرہ۔

(ایک گروہ کی رائے میں جہاں آسانی سے ممکن ہو وہاں ہمزہ کی بجائے حرف الف ہی سے کام لیا جائے۔ جیسے : عزرائیل۔ سارایں وغیرہ)

۳۔ دھ۔ ڈھ۔ رھ۔ ٹھ، کو لکھنے میں ہائے مخلوط کو اصل حرف سے بلا کر لکھا جائے:

یعنی دھ۔ ٹھ۔ اور اصل حرف کی مثل انھیں بھی حرفِ مُنفصل قرار دیا جائے اور دوپٹی ہ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ہلانے کی بجائے حسبِ ذیل طریق پر لکھا جائے :-

مُھن (بجائے دھن) دھرتی (بجائے دھرتی) پٹھنا (بجائے پٹھنا)۔

[حرفِ ہی اور ذونِ غنہ کے متعلق کمیٹی کی پہلی تجاویز مسترد کر دی گئیں اور قرار پایا

کہ ان کی موجودہ کتابت جو انجمنِ ترقیِ اُردو نے اختیار کی ہو، برقرار رکھی جائے]

۴۔ عربی کے حرفِ اَن، اِن، وَاوِ وغیرہ علاحدہ لکھے جائیں، جیسے : اِن شاء اللہ، لیکن آگے

عربی ضمیر آنے کی صورت میں ملا کر تحریر ہوں۔ جیسے : عنہم۔ منہم۔

۵۔ عربی حرفِ تعریف آل کا الف یا لام جہاں ساکت ہوں وہاں اُن کے اوپر چھوٹا خط

بنادیا جائے۔ جیسے : التَّلام اور علیکم التَّلام وغیرہ۔

۶۔ عربی ناموں اور عام الفاظ میں الف مقصور کی بجائے پورا الف لکھا جائے جیسے: ابراہیم۔ سلیمان۔ حیات۔ ریا اور اعلا۔ ادنا۔ مولانا وغیرہ۔

۷۔ غیر زبان کے الفاظ کو الگ الگ ٹکڑوں میں لکھا جائے۔ جیسے: انس پاک ٹر۔ ڈاک ٹر۔ یونی ورٹی۔ انس ٹی ٹیوٹ۔ ڈپارٹ منٹ۔ وغیرہ۔ لیکن حروف متصل جب شروع میں آئیں تو ایک رکن ہونے کے باوجود انہیں جدا نہ لکھا جائے۔ (جیسے مسٹر کایم ہو)۔

۸۔ صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک کمیٹی نے یہ تجویز بھی قبول کی کہ علامات مصدر یا ماضی د حال، اصل مادے سے جدا لکھے جائیں، جیسے: بلکھنا۔ بلکھتے۔ سمجھنا وغیرہ۔

(ب) دوسرے یہ کہ ان ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رکن کو جدا کر کے لکھا جائے۔ لیکن شروع میں حرف متصل ہو تو اسے بلا کر ہی لکھا جائے گا۔ جیسے: بمعیت، قریٰ نہ۔ وغیرہ الفاظ ہیں۔

۹۔ ایک اہم تجویز یہ منظور ہوئی کہ اعرابی سی کو الف اور واو کی مثل حرف منفصل قرار دیا جائے اور اس کی مجہول، معروف اور ماقبل مفتوح شکلوں کی کتابت وہی رہے جو انجمن نے اختیار کر رکھی ہو۔ جیسے :-

بے (مشہور پھل) بی (بہ معنی بھائی) اور بڑ (بہ معنی مٹھنی)

۱۰۔ ایک اور اہم قرارداد یہ پیش کی گئی کہ اصل تجاویز (مرتبہ راقم الحروف) کی دفعہ ۵ کو از سر نو اسے کے لیے اخبار ہادی زبان میں شائع کیا جائے کیوں کہ کمیٹی کی رائے میں اس قسم کی اصلاح ضرور ہوتی جاتی ہو۔ یہ تجویز حسب ذیل ہو :-

عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں، ان کو اردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی :

ث۔ س۔ ص میں سے ص کو، اور ز۔ ذ۔ ض۔ ظ میں سے ظ اور ز

کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ ان کی بجائے س اور ذ، ظ

سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی تین قسمیں یعنی (ا۔ح۔ع،  
ت۔ط اور ح۔ہ) بہ دستور رہیں گی۔

اس آخری تجویز کی نسبت ہماری استدعا ہو کہ ناظرین اخبار اور دیگر اہل الرائے حضرات  
ہمیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

سید ہاشمی فرید آبادی



# سہ ماہی تبصرہ

## ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں اردو

(جناب حیات اللہ انصاری صاحب)

### رومن رسم الخط

اگر آج کل آپ ہمارے صوبے کے دہاتوں میں گشت کریں تو ایک انوکھی بات نظر آئے گی۔ فوج کے جو سپاہی پختی لے کر آئے ہیں وہ اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھٹیا ڈالے، دھوپ میں بیٹھے کوئی پرچہ یا کتاب پڑھ رہے ہیں۔ کتاب دیکھیے تو انگریزی میں ہو۔ شام کو جب دو چار تھکے ماندے لوگ الاؤ کے گرد اکٹھا ہو جاتے ہیں تو سپاہی اپنی کتب زور زور سے پڑھتا ہو۔ سب مہنتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں۔ کتاب کا رسم الخط تو انگریزی ہو، مگر زبان وہی جو ہم سب بولتے ہیں۔

کتاب کی زبان خاصی صاف ہوتی ہو۔ نہ تو اس میں سنسکرت کے نامانوس الفاظ ہیں۔ نہ انگریزی کی اجنبی اصطلاحات اور نہ دیسے عجیب و غریب الفاظ جیسے پھلی لڑائی میں چل نکلے تھے مثلاً حماد کے لیے دلام، اسی کتاب میں فارسی کے رنج الفاظ مثلاً میدان، کشتی، روشن وغیرہ وغیرہ قدم قدم پر ملتے ہیں۔

رومن رسم الخط میں اردو زبان کا چرچا فوج میں کئی برس سے ہو۔ اب تو بعض دفنوں کے

کاروبار بھی اسی میں ہوتے ہیں۔ انگریز افسر اسی زبان میں حکم لکھتے ہیں۔ ماتحت افسر فردی ہدایات دیتے ہیں۔ اطلاعات کی تختی پر اسی زبان میں اطلاع چسپاں کی جاتی ہو ان کو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پورب، پکچم، اتر اور دکھن سب جگہ کے باشندے پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

انگریز افسروں کو اپنی ترقی کے لیے یہ زبان سیکھنا پڑتی ہو۔ معمولی سپاہیوں کو بھی اس کی تعلیم دی جاتی ہو۔ فوج میں گشتی لائبریریاں ہیں جن میں اخبار، پرچے، کتابیں اسی خط اور اسی زبان میں چھپی ہوئی آتی ہیں۔ سپاہی ان کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ بعض بعض کتابوں کی چھو چھو کاپیاں ہیں اس پر بھی وہ لائبریری میں نظر نہیں آتی ہیں۔

رومن رسم الخط میں اُردو کا چھپنا کوئی نئی بات نہیں ہو۔ اب سے پچھتر برس پہلے ۱۸۶۹ء میں اُردو کی ۱۴ کتابیں چھپی تھیں جن میں سے چھ رومن میں تھیں۔ مشن والے جن کو عیسائی بناتے تھے ان کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ پڑھنے والوں کو رسم الخط آجاتا تھا۔ زبان نہیں آتی تھی اس لیے ان کے لیے رومن رسم الخط میں کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

رومن رسم الخط سے ایک طرح کا فائدہ ہی پہنچے گا۔ وہ یہ کہ کئی لاکھ ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ صرف ایک زبان ہو جس میں ہم سب ہندو مسلمان، سکھ عیسائی تباؤہ خیالات کر سکتے ہیں اور وہ اُردو۔

## صحافت

مالک متحدہ سے نکلنے والے اخباروں، پرچوں اور رسالوں کی تعداد حسب ذیل ہو :-

۱۴	(۶) سہ ماہی	۹	(۱) روزانہ
۴	(۷) چو ماہی	۷	(۲) سہ روزہ
۷	(۸) شش ماہی	۱۵۱	(۳) ہفتہ وار
۴	(۹) سالانہ	۱۲	(۴) پندرہ روزہ
۲۵۳	میزان	۴۵	(۵) ماہ وار

سب سے بڑی تعداد ہفتہ وار پرچوں کی ہو۔ سوائے سوری، ہرودار اور الموڑے ہفتہ وار کے کوئی قابل ذکر جگہ ایسی نہیں ہو جہاں سے کوئی پرچہ نہ نکلتا ہو۔ ان میں سے تین 'الحیات'، ٹانڈہ (فیض آباد)، 'المہدی'، سنہل (مراد آباد) اور 'پنج بہادر' سنہل (مراد آباد) قصبوں سے نکلتے ہیں۔ پندرہ مقامات ایسے ہیں جہاں سے ۴ سے زائد پرچے نکلتے ہیں۔ ان میں سے علی گڑھ، فیض آباد، گورکھ پور، میرٹھ، مظفرنگر، شاہ جہاں پور سے چھو چھو، لکھنؤ سے سات، آگرہ و بدائوں سے آٹھ آٹھ، بریلی سے نو اور کان پور سے چودہ نکلتے ہیں۔

کان پور سے سب سے زائد پرچے نکلتے ہیں، اور سب مقاموں سے زیادہ پابندی پابندی سے نکلتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جن ضلعوں سے ایک ایک یا دو دو پرچے نکلتے ہیں۔ ایسے پرچوں کی تعداد ۲۹ ہے۔ 'پیارا'، دیال بلخ (آگرہ)، 'پریم پرچارک'، (آگرہ)، 'کانفرنس گزٹ'، (علی گڑھ)، 'غنجہ'، (بجنور)، 'ذوالقرنین'، (بدایوں)، 'البشیر' (ٹانڈہ)، 'دہلی گزٹ'، (فیض آباد)، 'مستقبل'، (جن پور)، 'صدق'، (لکھنؤ) وغیرہ ۱۷-۱۸ پرچے ایسے ہیں جو بہت زمانے سے پابندی سے نکل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ جو پرچے ہیں وہ غیر پابندی کا شکار ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ ہفتے کا غوطہ مار جاتے ہیں۔ کبھی مہینوں کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جہاں سے تین یا چار یا اس سے زیادہ پرچے نکلتے ہیں اگر وہاں کا اوسط لیا جائے تو پچھتر فی صدی پرچے ضرور نکلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی سو فی صدی بھی ہو جاتے ہیں۔

کاغذ کی کمیابی نے ہفتہ وار پرچوں پر بہت ناگوار اثر ڈالا ہو۔ پرچوں کی بڑی کاغذ کی کمیابی | تعداد ایسی ہو جن کا کاغذ، سائز اور صفحات پہلے ہی اچھے نہ تھے۔ اب اس کمیابی نے تو ان کی کمر اور توڑ دی ہو۔ بعض پرچے تو ایسے ہیں جو گھٹ کر چھوٹے سائز کے صرف چار صفحات کے رہ گئے ہیں۔ جو اخبارات بہت پابندی سے نکلتے تھے کاغذ کی فراہمی کی دشواریوں کی وجہ سے وہ بھی کبھی کبھی غوطہ لگا جاتے ہیں۔

لکھائی چھپائی | جن پرچوں کے صفحات اور سائز بہت حقیر ہو گئے ہیں اگر وہ لکھائی اور چھپائی

میں ترقی کر لیتے تو بات نہج جاتی۔ لیکن اس میں جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ اگر پریس کی تعداد دیکھو تو اس صوبے میں بہت بڑی ہے۔ مگر کام کے لحاظ سے سب ناقص ہیں۔ اچھے کاتب اور اچھے پریس صرف الہ آباد اور لکھنؤ میں پائے جاتے ہیں۔ یا اب کچھ کان پور میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر وہ بھی بہت اعلیٰ پائے کے نہیں ہیں۔ لکھائی میں تمام حروف کی یکسانی اور چھپائی میں حروف کے خط و خال کا برقرار رہنا اور کاغذ کے سادے صفحے پر پرچھائیں نہ ڈالنا یہ چیزیں یہاں نایاب نہیں تو بہت کم یاب ضرور ہیں۔ محکمہ اطلاعات عامہ کے پمفلٹ اور انٹرن پریس کا رسالہ ’ہل‘ کاغذ اور لکھائی چھپائی کے اعتبار سے یہاں کی بہترین پیداوار ہیں۔ ہاں ایک جگہ ہے جو ان تمام نقائص سے بری ہے اور جہاں کا معیار بہت بلند ہے، وہ ہے دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ مگر وہ ایک جزیرے کی طرح ہے۔ جس کا یہاں کی آب و ہوا سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض عمدہ عمدہ پرچے اچھی لکھائی اور چھپائی کی نایابی کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ اگر اٹا دہ میں عمدہ لکھائی چھپائی ممکن ہوتی تو ’البشیر‘ کی اشاعت بہت زیادہ ہوتی۔

**آمدنی** اگر تے ہوں۔ صرف کان پور میں کچھ ایسے کارخانے ہیں۔ اس وجہ سے وہاں سے نکلنے والے پرچوں کی حالت اچھی ہے۔ باقی مقاموں سے نکلنے والے پرچوں کی آمدنی کا سہارا منہ ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ خریدار جن کو مقامی حالات سے دل چسپی ہوتی ہے۔

**حق تلفی** میرے سامنے اس وقت ’سرنومبر‘ کا ’لیڈر‘ ہے۔ اس میں اُردو کے سات سمن بہت بھدے ٹاپ میں چھپے ہوئے ہیں۔ کم و بیش اتنی ہی تعداد سمنوں کی اس میں نفاذ ہوتی ہے۔ ’پانیر‘ میں بھی اُردو کے سمن اتنے ہی نظر آتے ہیں۔ مدعا علیہ کے نام پیشہ اور سکونت دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عزیزوں اور دوستوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو ان انگریزی اخباروں سے دل چسپی ہو۔ اگر یہ سمن اُردو پرچوں کو جو ان کے جائز حق دار ہیں، ہل جائیں تو ان کا سال بھر کا کاغذ بھل آئے۔

## صحافت

بعض پرچوں کی صحافت کا معیار بلند ہو۔ جنگ کے چھڑ جانے سے لوگوں کو خبروں سے اور بین الاقوامی مسائل سے دل چسپی بڑھ گئی ہو۔ اس وقت کوئی ہفتہ وار پرچہ اٹھاکر دیکھیے اس میں فاس لازم اور ناسی ازم، جاپان کی جنگی حکومت، بحری و ہوائی طاقت، اٹلی اور روس کی سرحد کی میدان داریوں اور عراق، مصر، ترکی کی اسلامی حکومتوں پر، اور اس کے ساتھ ساتھ آب و دوز کشتیوں اور انتقال خون سے علاج پر اچھے اچھے مضامین نظر آئیں گے۔ چند سال ادھر سے اگر موازنہ کیجیے تو ان کی عبارت میں زیادہ روانی جتنی ہوگی اور بارڈر وار ملے گی۔

ان خوبیوں پر بھی یہ پرچے صحافی کم زوریوں سے مبتلا نہیں۔ سمن اور مقامی خریداروں کی مدد سے یہ خود کنیل ہو جاتے ہیں۔ یہی زمین کسی پرچے کی نشوونما کے لیے بہت اچھی ہونا چاہیے۔ لیکن اس پر بھی وہ اپنے ضلعوں میں گہری جگہ نہیں پیدا کر پاتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ مقامی لوگوں کے توقعات سے پیچھے رہتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ پڑھنے والوں کو اخبار کا چسکا کیسے لگا دیں اور جو لوگ خریدار بن سکتے ہیں ان کو کیسے راغب کر لیں۔ ایک ضلع کی مثال میرے سامنے ہو۔ وہاں ہوا ڈنگل۔ چوں کہ یہ جنگی فنڈ کے لیے تھا اس لیے ادنیٰ اعلیٰ سب نے اس میں دل چسپی لی۔ اب مقامی اخبار کا یہ کام تھا کہ وہ ڈنگل سے پہلے شریک ہونے والے پہلوانوں کی تھوڑی تھوڑی سوانح عمری دیتا۔ ہندستان میں اس فن کی ترقی یا تنزلی پر ایک مزے دار مضمون لکھتا۔ اس سلسلے میں دو ایک لطیفے کہاوتیں اور مشہور باتیں لکھتا۔ ڈنگل کے بعد کشتیوں پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کرتا۔ اس میں سے دو ایک چھوٹی موٹی باتیں چٹ پٹے انداز سے بیان کرتا۔ مگر اس طرح کہ واقعہ نہ بگڑنے پاتا۔ اس کے لیے کسی اکھاڑے میں جیس سائی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ واقف کاروں سے بات چیت اور گہرا مشاہدہ کافی ہوتا۔ لیکن مقامی پرچے میں انتظام کی تعریفوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر ہمارے پرچے ایسی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگیں تو مقامی زندگی کا جز بن جائیں

صحافت کے اعتبار سے صدق لکھنؤ بہت عمدہ پرچہ ہو۔ ہر بات میں لذت، باتوں باتوں میں گہری بات، حریف کے زبردست وار کو مسکرا کر خالی دے جانا، اس کے مضبوط پہلو کو بتا کر کم زور



پہلو پر ہاتھ مار دینا، سنجیدہ بحثوں میں لطیف متانت، یکسانیت ضرور ہوتی ہو مگر 'صدق' ایک قلمی پرچہ ہو اور یک قلمی پرچے میں یہ بات ہوتی ہی ہو۔ اس کی صحافی تکنیک کا مطالعہ بہت سے پرچوں کے لیے مفید ہو سکتا ہو۔

ان پرچوں میں کچھ مخصوص فنی یا صنعتی پرچے بھی ہیں۔ مثلاً **پہرچوں کی دوسری خصوصیتیں** | 'پیارا دیاں باغ' اور 'پریم پرپارک' ست سنگھیوں کا اخبار ہے جو صنعت و حرفت کی ترقی چاہتا ہو۔ 'مارکٹ رپورٹ' کان پور نیم کار و باری پرچہ ہو۔ 'پنجائیت' بارہ بنگلی، 'دوبھی گزٹ' فیض آباد دیہاتی زندگی اور کاشت کاری سے متعلق ہیں۔ 'کالیستھ ہتھکاری' فیض آباد، 'سائق' سلطان پور اور 'مودیارتھی' سلطان پور اپنی عبارت میں سنسکرت کی چاشنی دیتے ہیں۔ مگر ان کے ناموں الفاظ مابقی اور مابقی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ 'پنج بہادر' سنہل اور 'مذاق' مرزا پور مزاحیہ رنگ میں رہنا چاہتے ہیں۔ 'مستورات' مظفر نگر زنانہ پرچہ ہو۔ اسی طرح مختلف خصوصیتوں کے پرچے نکلتے ہیں۔

**روزنامے | روزنامے حسب ذیل ہیں :-**

(۱) اودھ اخبار	لکھنؤ	(۶) ڈیلی رپورٹ	علی گڑھ
(۲) حقیقت	"	(۷) دیپار ہاپرٹ	راہڑی میرٹھ
(۳) ہم دم	"	(۸) دیپار ساچار	"
(۴) سرفراز	"	(۹) عادل	راہ پور
(۵) حق	"		

ان میں سے کوئی اخبار ایسا نہیں ہو جو اپنے یہاں آنے والے یا نکلنے والے **خبریں اور وقت** | انگریزی اخبار کے ساتھ نکلتا ہو۔ اگر کوئی اخبار ایسا ہوتا تو وہ انگریزی اخباروں کے خریدار بٹالیتا اور بہت ترقی کر جاتا۔ دوسری کمزوری یہ ہو کہ ان کی چھپائی کا انتظام بہت خراب ہو اسی وجہ سے تصویریں یا کارٹون نہیں بن سکتے ہیں۔ کہیں کہیں چھپائی تو ایسی خراب ہوتی ہو کہ پڑھنا شکل ہو جاتا ہو۔

**آمدنی** اخبارات کی اصل آمدنی اشتہارات سے ہوتی ہو۔ جن مقاموں میں اشتہارات ملتے ہیں جیسے کہ کلکتہ، بمبئی یا لاہور وہاں اخبارات بہت جلد پنپ جاتے ہیں۔ ہمارے صوبے میں اشتہار دینے والے کارخانے بہت کم ہیں۔ انگریزی یا ہندی اخبار جن کے پاس سرمایہ کافی ہوتا ہو وہ بمبئی، کلکتہ اور لاہور میں اپنے مستقل ایجنٹ رکھتے ہیں جو ان کے لیے اشتہارات فراہم کرتے ہیں۔ اُردو اخباروں میں سے کسی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہو کہ ان کی آمدنی بہت کم ہو۔ وہ پریس کی بڑی چکر دار مشین بھی نہیں خرید سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اور بُرا ہوتا ہو۔ ان کی وجاہت کم ہو جاتی ہو۔ وقعت گھٹ جاتی ہو جس کا اثر خریداروں اور اشتہار دینے والوں پر پڑتا ہو۔ یہ بھی شکایت سُنے میں آئی ہو کہ یوپی کے بڑے کارخانوں کے اشتہارات کے مینجر فرقہ واری ذہنیت کے ہیں اور اُردو کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

**اودھ اخبار** اودھ اخبار ایک ایسا اخبار ہو جس کے پاس سرمائے کی کوئی کمی نہیں۔ یہ منشی نول کشور آں جہانی کا قائم کیا ہوا اخبار ہو۔ اور اُنھی کی وصیت کے مطابق جاری ہو۔ اسی اخبار نے منشی نول کشور کے پریس کو شہرت اور عزت بخشی تھی۔ یہ پریس آج بھی بہت بڑا پریس اور اشاعت گھر ہو۔ لیکن اس کا اخبار کیا خبروں میں، کیا معافیت میں اور کیا لکھائی چھپائی میں ہر چیز میں سب اخباروں سے پیچھے ہو۔

**صحافت** سب اخبار کسی نہ کسی سیاسی حلقے کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اس میں کافی صحافی خوبی دکھاتے ہیں۔ ’حقیقت‘، ’زرا وسیع المشرب‘ اخبار ہو۔ اس کی مخالفت میں بھی موافقت کا پہلو رہتا ہو۔ ’ہم دم‘، اپنی نوعیت کا ایک اخبار ہو۔ وہ عام لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے عامیانہ رنگ پر چلتا ہو، اور کامیاب ہوتا ہو۔ اس کے تمام قصور ایک طرف اور یہ خوبی ایک طرف کہ یہی اخبار ہو جس نے عام لوگوں کو ایک بار پھر اخبار پڑھنے کا چسکا لگا دیا۔ کاش کوئی اخبار ایسا ہوتا جو اس چمکے سکے ساتھ ساتھ سیاسی اور علمی چسکا بھی لگا دیتا ہو۔

آج کل ان اخباروں کا معیار پہلے سے کافی اونچا ہو گیا ہو۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نوٹ بین الاقوامی

سیاست پر ہوتا ہے۔ جس میں روانی، پُھرتی اور مضبوطی ہوتی ہے۔ اپنے سیاسی حلقوں کی زندگی کے اب وہ زیادہ رُخ دیکھنے لگے ہیں۔ بیج بیج میں تھکاوٹ آجاتی ہے مگر پھر جب سیاست میں کوئی تازہ شگوفہ کھلتا ہے تو چلت پھرت نظر آنے لگتی ہے۔ اگر کہیں ان اخباروں میں تنوع، بیان میں لذت، بحثوں میں چاشنی اور یٹھی ظرافت اور آجائے تو ان کا درجہ بہت بلند ہو جائے۔ ان کی خاص کم زوری یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک قریب قریب یک قلی ہے ہفتہ وار میں تو یہ بات بنھ جاتی ہے۔ لیکن روزانہ ایک شخص کے منہ سے ایک ہی لہجے اور ایک ہی انداز میں تمام خبریں اور رائے سُنا تھکا دیتا ہے۔ اگر یہ اپنی ان چند صحافی کم زوریوں کو دُور کر لیں، لکھائی و چھپائی کی طرف توجہ کریں، تصویروں اور کارٹونوں کو جگہ دیں اور انگریزی اخبار کے ساتھ لکالیں تو ہر ایک کی اشاعت کم از کم چوٹی ہو جائے۔

سہ روزہ اخبار حسب ذیل ہیں :-

**سہ روزہ اخبار** | ’المشرق‘، ’الآباد‘، ’شعل‘، ’بریلی‘، ’مدینہ‘، ’بکھور‘، ’حجیت‘، ’جون پور‘، ’مسیحہ دار‘، ’لکھنؤ‘، ’جدت‘، ’مراد آباد‘، ’پیام اسلام‘، ’لکھنؤ‘۔

ان میں سے قابل ذکر مدینہ ہے۔ اس میں سہ روزہ اخبار کی پوری شان ہے۔ گھڑی کی ایسی پابندی، عمدہ لکھائی و چھپائی، جیسا موقع دیسے مضامین، دل چسپ بحثیں، ظرافت کا کالم، دہلی کی قربت سے اشتہارات آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں اور آمدنی کی طرف سے وہ بے فکر ہے۔ مزید ترقی کی گنجائش ہر چیز میں ہوتی ہے، اس میں بھی ہے۔ زندگی کے ایسے شعبے بھی ہیں جہاں تک اس کا قلم نہیں پہنچتا ہے۔ سبابت کچھ لپٹے دار ہوتی ہے جس کا اب زمانہ نہیں رہا۔ ظرافت اگر دو ٹوک ہو تو اس پر باڑھ آجائے۔ اور اگر اشتہارات میں دواؤں کی تعریف کنایوں میں ہوا کرے تو اور بھی اچھا ہو۔

**پندرہ روزہ اخبار** | تعداد میں پندرہ ہیں۔ یہ اپنی شکل و صورت اور خصوصیات میں ہفتہ وار پندرہ روزہ اخباروں سے مختلف نہیں ہیں۔ ان میں کا کوری اخبار اپنی نوعیت کا ایک ہے۔ پندرہ برسوں سے نہایت پابندی سے بکھل رہا ہے۔ قصبے کے شرفاء کے حالات و خبریں چھاپتا

ہی اور صرف انہی کے چندے سے چلتا ہو۔

۲۹ ہیں۔ ان میں سے بیس اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔  
 سالانہ و شش ماہی  
 چھ ماہی و سہ ماہی رسالے  
 باقی میں سے دو سہ ماہی 'نيسان' الہ آباد اور 'مہارستان' آگرہ ادبی  
 رسالے ہیں، دو مذہبی ہیں۔ باقی آدھے ادبی اور آدھے کسی اداسے  
 کی رپوٹ۔ ان میں سب سے امید افزا 'نيسان' ہو۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ لیکن ابھی  
 اس کی رفتار دیکھیے۔

اسکولوں اور کالجوں کے میگزینوں میں سے سات ہندو کالجوں اور اسکولوں سے نکلتے ہیں۔  
 طالب علموں کے میگزین ہیں، اچھے ہوتے ہیں۔ ہم کو لکھنؤ یونیورسٹی والوں سے کچھ کہنا ہو۔ ان کا  
 میگزین کسی طرح لکھنؤ کے ادبی روایات کے شایان شان نہیں۔ مسلم یونیورسٹی والوں سے یہ شکایت  
 ہو کہ وہ جتنی توقع دلاتے ہیں اس کو نبھاتے کیوں نہیں؟

ان میں سے 'زمانہ'، 'معارف' اور 'نگار' بہت مشہور اور مکمل ہندو رسالے  
 ماہوار رسالے  
 ہیں۔ ہر ایک کی اپنی روایات ہیں اور اپنا مخصوص کردار۔ ہر ایک نے اپنے  
 اپنے انداز میں اردو کی بہت خدمتیں کی ہیں۔ 'زمانہ' بہت پُرانا رسالہ ہو اور بہت خلوص سے اردو  
 کی خدمت کرتا ہو۔ اچھا کاغذ اچھی لکھائی چھپائی۔ دو ایک تصویریں، شاید مضامین جن میں تنوع  
 اور ضرورت کا لحاظ، راسے میں احتیاط، پُرانے رنگ کے رہائے میں وضع داری، نئے چلنوں کو  
 نظر انداز کر جانا۔ 'معارف' کا کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ بہت سنجیدہ اور ثقہ پرچہ ہو۔  
 ہر بات میں عالمانہ شان، تنقیدوں میں علامہ شبلی کا انداز، علم و ادب کو مذہب کی کسوٹی پر نزاکت  
 سے پرکھنا، اگر آگے نہ بڑھنا تو پیچھے بھی نہ ہٹنا۔ 'نگار' ادبی پرچہ ہو۔ اردو، فارسی اور کبھی  
 کبھی عربی شعرا پر نیم معلوماتی اور نیم تنقیدی سیر حاصل بحثیں۔ انداز دل چسپ، ترتیب مزے دار،  
 ادارے کا انداز اور بالکل چمکا لگا دینے والا۔ وہ موضوع جن پر ابھی تک اردو میں بہت کم  
 لکھا گیا ہو، ڈھونڈ نکالنا اور اس پر اچھا مضمون دے دینا۔ یہ تینوں رسالے ایسے ہیں جن کے

بارے میں صرف اتنا کہ دینا کافی ہو کہ ہمارے مؤلف کی بہترین پیداوار ہیں۔

’ہل‘ الہ آباد وضع قطع چوٹی کے رسالوں کی ہوتی ہو۔ مضمون کے بیچ بیچ میں تصویریں، بہت عمدہ سرورق، وہاں سدھار کے ہر ممکن پہلو کو گرفت میں لانا ہو، ساتھ ساتھ ضروری معلومات بھی۔ بیچ، ہل، آلا سے لے کر ٹینک اور گیس کی لڑائی تک ہر چیز پر مضمون ہوتے ہیں۔ لکھنے والے متعدد ہیں اس لیے تنوع بھی ہوتا ہو۔ اگر زرا ادبیت اور بڑھ جائے تو بہت پائے کا رسالہ بن جائے۔ ’منزل‘ لکھنؤ ایک نیا رسالہ نکلا ہو۔ پہلے دو نمبروں سے تو نہیں، ہاں تیسرے نمبر سے ’نیا ادب‘ کی جانشینی کر رہا ہو۔ یعنی یہ قول اس کے افتتاحیے کے اس اصول پر ادب کو لے جانا چاہتا ہو۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیراز جاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ  
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہو۔ مقام میدان جنگ میں نہ طلب کر نواے جنگ  
خون دل و جگر سے ہو سرمایہ حیات فطرت لہو ترنگ ہو غافل نہ جل ترنگ (اقبال،  
خوش آمدید! مضامین اور انداز بیان کی جتنی وسعت ہو اتنی ہی زبان کی وسعت ہوگی۔  
ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد بہت پابندی سے نکلتا ہو۔ بنیادی تعلیم دینے والے مدرسوں کی رہنمائی  
کرتا ہو۔ زبان آسان اور مضامین پُر مغز ہوتے ہیں۔

دو رسالے ’ہمیو پتھک لیڈر‘ لکھنؤ اور ’ہمیو پتھک جرنل‘

### مختلف خصوصیتوں کے رسالے

کان پور ہمیو پتھک کے اچھے رسالے ہیں۔ زبان اچھی ہوتی ہو لیکن اصطلاحیں اکثر انگریزی ہی کی رہتی ہیں۔ ’اُردو‘ لا رپوٹ ٹھیٹھ قانونی رسالہ ہو۔ ’حریم‘ لکھنؤ اور ’ضیا‘ لکھنؤ زنانے رسالے ہیں۔ ’چتر گپتا سنڈیش‘ علی گڑھ، ’مان سرور‘ الہ آباد، ’سکسینہ ساچار‘ بریلی، ’انگم کایستھ پتیکا‘ کان پور۔ ’قنچ ساچار‘، ’بھٹناگر ساچار‘ میرٹھ ہندی کی خواہ رکھتے ہیں۔ ’دلفستان‘ لکھنؤ حال ہی میں ایک فلمی رسالہ لکھنؤ سے نکلا ہو۔ مذہبی رسالے بھی متعدد ہیں جیسے کہ ’الفرقان‘ بریلی، ’شہناے شریعت‘ کان پور، ’روحانی عالم‘ مراد آباد، ’المبغ‘ مظفر نگر، ’النور‘ مظفر نگر۔



ایک اڈیٹر عیسائی بھی ہو۔ عیسائیوں کی تعداد دیکھتے ہوئے یہ غیبت ناکافی نہیں ہو۔

**خبروں کی ایجنسیاں** صحافت کے سلسلے میں ایک چیز اور قابل ذکر ہو۔ خبروں کی دو ایجنسیاں بھی ہیں جو اُردو میں اخباروں کو خبریں فراہم کرتی ہیں۔ ان ڈی پٹن ڈنٹ نیوز سروس لکھنؤ (ا۔ ن۔ س لکھنؤ) اور مسلم نیوز سروس لکھنؤ (م۔ ن۔ س لکھنؤ) پہلی اپنی خبروں میں ممتاز ہو اور دوسری زبان اور بیان میں۔

## اشاعت گھر

دو تین سال ادھر کی بات ہو کہ ہندی کے پرستاروں کی یہ آوازیں سننے میں آرہی تھیں کہ دو چار سال اور گزرنے دو پھر یوپی سے اُردو کا جنازہ بکھل جائے گا۔ ایسی پیشین گوئی کی جرات یوں پڑی کہ یوپی میں اُردو کتابوں کا چھپنا کم کم ہوتے ہوتے برائے نام رہ گیا۔ وہ سمجھے کہ یہ نتیجہ ہو ہماری ہندی تحریک کا۔ پھر تو نئے حملوں کے نقشے بننے لگے۔ پڑرب کے اضلاع میں تو ہندی بولی ہی جاتی ہو۔ اگر کچھ دنوں ہم ہندی کی عام پسند کتابیں سستے داموں فروخت کرتے رہیں۔ اور ہندی پڑھنے میں سہولتیں ہتیا کرتے رہیں تو ادھر سو فی صدی ہندی زبان اور خط کا رواج ہو جائے گا۔ یہی حال ہوگا یوپی کے پچھم کے اور دسلی اضلاع کا۔ یہ صرف چند سال کی بات ہو۔ پھر تو اُردو صرف لکھنؤ، وغیرہ چند شہروں میں رہ جائے گی۔

یہ نقشے جن لوگوں نے بنائے تھے انھوں نے عملی تدابیر کیا اختیار کیں یہ تو معلوم نہیں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ گیتا پریس گورکھ پور اور ساسا ہتھ پریس الہ آباد کئی سال سے ردی کے بھاؤ عمدہ جملہ کتابیں فروخت کر رہے ہیں۔ اور بعض ہندی کی انجمنوں نے مشنری اسپرٹ سے دہاتوں میں ہندی چلانے کی فہم ایک کوششیں کیں۔

یہ درست ہو کہ میں پچیس سال ادھر یوپی اُردو کا مرکز تھا۔ ناولیں، کتابیں، اخبار و رسائل سب سے زیادہ یہیں سے نکلتے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہو کہ سب پُرانے اشاعت گھر اب خاموش ہیں، مگر

اس کے اسباب سو فی صدی وہ نہیں ہیں جو ہمارے بھولے دوست سمجھتے ہیں۔ ان کا آرزو مندانہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا ہو ادا نہ ہوگا۔ اس بات کے ثبوت میں ہم آپ کے سامنے چند ٹھوس دلائل رکھتے ہیں۔

(۱) یوپی میں صرف وہی فلم کامیاب ہو سکتا ہے جس کی زبان اُردو ہو۔

(۲) کسی شہر یا قصبے میں جا کر آپ دکان دار سے سودا مچکائیے۔ وہ اُردو بولے گا۔ ہندی بہت ضروری چیز ہے مگر اتنی نہیں کہ اس کے کارن اپنے سب گاہک سوائے پنڈتوں کے چھوڑ دیے جائیں۔ (۳) جب ہندی سیکھنے میں مجھے دشواری ہوئی تو میں نے اپنے استاد سے کہا زبان بول چال سے زیادہ آتی ہے، کوئی ایسا شہر بتائیے جہاں صرف ہندی بولی جاتی ہو میں وہاں کچھ دنوں کے لیے چلا جاؤں۔ میرے استاد ہندی کے بڑے پرستار اور ’لکھک‘ ہیں۔ مگر وہ ایسی کوئی جگہ نہ بتا سکے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہندی صرف تحریری زبان ہے۔

یوپی میں اشاعت گھروں کی خاموشی کے اسباب ہندی کے محلے کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔

بارہ سال ادھر کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اپنے دوست کا دیوان چھپوایا۔ ان کا قول تھا کہ دیوان اچھا ہو یا بُرا بکتا ضرور ہو کیوں کہ کچھ لوگ ہیں جو دیوانوں کے دیوانے ہیں۔

مگر وہ دیوان بکا نہیں۔ لکھنؤ میں جو دیوانوں کے دیوانوں کا مرکز تھا صرف ۲۰ کاپیاں بکیں۔ اب ہوا بدل چکی تھی۔ نوجوان ’بانگ درا‘، ’جذباتِ فطرت‘، ’دیوانِ غالب نیا ایڈیشن‘ خریدتے تھے۔ پُرانے لوگ ان کتابوں کی مخالفت ضرور کرتے تھے مگر ان کو بھی اب پُرانی کتابوں میں مزا نہ ملتا تھا۔ دکانوں میں ’طلسمِ ہوش بُرا‘ اور ’بوستانِ خیال‘ کی جلدیں پڑے پڑے دیمک کی نذر ہو گئیں، سلیمانی پریس بنارس کی ’کم سن بیوی‘ ’مسن شوہر‘ اور ’مسن بیوی کم سن شوہر‘، ’خطرِ شباب‘ اور ’معتوقہ فرانس رڈی‘ میں پک گئیں۔ اب صرف جاسوسی کی ناولیں اور ریٹائلرز کے ترجے چلتے تھے۔ اشاعت گھروں نے پُرانی کتابوں کو منبر کیا اور ان کو چھاپنے لگے۔ ’نیلِ جھتری‘، ’بہرام کی گرفتاری‘، ’طلسمی برج‘، ’زورِ گنبدِ دہلیو‘ کتابیں چھپیں اور خوب بکیں۔ لیکن یہ کتابیں ابھی چھپ ہی رہی تھیں کہ رومانی افسانوں اور رومانی رسالوں کی



مانگ ہوگئی۔ ساتھ ساتھ عمدہ کاغذ کی اچھی لکھائی چھپائی کی با تصویر مجلہ کتابیں آنے لگیں۔ دہلی اور پنجاب کے اشاعت گھرایسے رسالے اور ایسی کتابیں لے کر آئے تھے اس لیے انھوں نے یہاں جگہ بھی بنالی یوپی کے پُرانے اشاعت گھر اپنے کو اس رنگ پر نہ ڈھال سکے۔ کیوں کہ ان کے لکھنے والے، ان کے بچے کچھ جاننے والے، ان کے کارندے اور مشینیں سب پُرانی تھیں۔ ان کی دکانیں بھی شہر کے پُرانے حصوں میں تھیں۔ نئے کارخانے اور نئے خریداروں سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

کچھ نئے اشاعت گھر اُٹھے اور نئے رسالے نکالے گئے۔ لیکن ان کو نئی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یوپی میں لاہور اور دہلی کی طرح اشتہار ملتے نہ تھے جو رسالے کو شان سے نکالا جاسکے۔ نئے طرز کے لکھنے والے ہندستان بھر میں پکھڑے ہوئے تھے اور ان سے پنجاب اور دہلی کے اشاعت گھروں سے مراسم ہو چکے تھے۔ نئے اشاعت گھروں کو کتابوں اور رسالوں کے خریدار سے پہلے مخالف بل جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ مقام پُرانے مبسُوروں کا مرکز تھا۔ ان کو نئی چیزوں میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ سب سے بڑی دُشواری یہ تھی کہ جو مقام ادب کا مرکز تھا وہ اپنا پُرانا ذوق کھو چکے اور نیا ذوق ابھی حاصل نہ کیا تھا۔ دوسرے مقام ابھی مرکز بنے نہ تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سو خریدار یہاں ہیں تو دوسو وہاں۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں کام یاب دُکان رکھی جاسکے۔ چنانچہ اس دُور کے سب سے بڑے اشاعت گھر اور کتاب کے ایکسٹ انناظر بک ڈپو لکھنؤ کی کہیں دُکان نہ تھی۔ اس امتیاز کی حالت میں کسی نئے اشاعت گھر کا کام یاب ہونا بہت مشکل تھا۔ یہی حالت تھی کہ ذوق نے پھر پلٹا کھایا۔ ادب لطیف، ’لیگوریت‘، نیازیت رخصت ہوئی۔ ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو چلا۔ نئے اشاعت گھر جو سسک سسک کر اس بیچ کے ذوق پر چل رہے تھے، بیٹھ گئے۔

جدید ذوق کے ساتھ یوپی میں کچھ خوش گوار چیزیں اور بھی آئیں۔ یونیورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اُردو آگئی، سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریاں کھُلنے لگیں، لکھنؤ ادب کا مرکز پھر بننے لگا، بابجا شہروں میں ادبی کانفرنسیں ہونے لگیں، انجمنیں کھُلنے لگیں، شاعروں میں جدید طرز کی شاعری سے پھر جلا پڑ گئی۔ جدید نظموں کی کتابوں کی مانگ پیدا ہوگئی۔ اس نئے دُور کو خوش آمدید کہنے کو بہت سے

بے سراے کے اشاعت گھر کھل گئے۔ بہت سے پرچے اور رسالے بھل آئے۔ ایک آدھ پُرانے اشاعت گھروں نے بھی پر پرزے جھاڑے۔ مکتبہ جامعہ کی لکھنؤ میں شاخ کھلی۔ بنارس اور الہ آباد میں کتابوں کی خب صورت دکانیں نظر آنے لگیں۔ لکھنؤ میں ایک نیا اشاعت گھر 'دانش محل' کھلا۔ یہ سارا انقلاب ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کی بات ہے۔

اب یوپی میں اشاعت گھروں کے پنپنے کا میدان تیار ہو گیا ہے۔ یہاں ایک مخصوص ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ علمی ادبی کتابوں اور رسالوں کی مختلف صنفوں کی مانگ پیدا ہو گئی ہے۔ کان پور کی ترقی سے امید ہوئی ہے کہ دو چار برس میں یہ مقام اشتہاروں کا بھی جھوٹا موٹا مرکز بن جائے۔ لکھنؤ اور کان پور ایسے مقامات ہو گئے ہیں جہاں دکانیں کام یاب ہو سکتی ہیں۔ جو ہوشیار موقع شناس اور ایمان دار اشاعت گھر ہوں گے، موقع سے فائدہ اٹھا کر چمک جائیں گے۔ اور یوپی کے چہرے پر سے یہ کالا دھبہ کہ یہاں کتابیں نہیں چھپتی ہیں، مٹا دیں گے۔

## کتابیں

تبصرے کے لیے ہم صرف ان کتابوں کو لیتے ہیں جو تین مہینے کے اندر اندر چھپی ہیں۔ اسی طرح ہم ہر سہ ماہی کی کتابوں پر تبصرہ کرتے رہیں گے۔

فن	نام کتاب	مصنف	اشاعت گھر
<u>مختصر افسانے</u>			

(۱) دھوپ چھاؤ	عبدالشکور ایم اے	دانش محل لکھنؤ
(۲) نصیر الدین حیدر اور دوسرے افسانے	مجتبیٰ حسن جون پوری	صدیق بک ڈپو لکھنؤ
(۳) حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے	نیاز فتح پوری	نگار لکھنؤ

فن	نام کتاب	مصنف	اشاعت گھر
<u>مختصر افسانے</u>	(۴) دکھ سکھ	اعظم کرپری	انوار احمدی پریس الہ آباد
<u>ناول</u>			

(۱)	سوتیا چاہ	شوکت تھانوی	مدین بک ڈپو لکھنؤ
-----	-----------	-------------	-------------------

### تنقید و تذکرہ

(۱)	نقد و نظر	حامد حسن قادری	شاہ اینڈ کمپنی آگرہ
(۲)	یادگار شعرا	سعید احمد	ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد
(۳)	دورِ جدید کے چند ہندو شعرا	عبدالشکور ایم اے	دانش محل لکھنؤ

### مضامین کے مجموعے

(۱)	زندہ رؤس	مرتبہ ادارہ نیا ادب	دانش محل لکھنؤ
(۲)	انتخابِ شبلی	دارالمصنفین	دارالمصنفین اعظم گڑھ

### نظم

(۱)	کلیاتِ شبلی	دارالمصنفین	دارالمصنفین اعظم گڑھ
-----	-------------	-------------	----------------------

### سوانح عمری

(۱)	رحمتِ عالم	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ
-----	------------	-----------------	----------------------

اگر دیکھیے تو یہ تناسب اچھا ہے۔ افسانے و ناول سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد اچھی ہے۔ 'زندہ رؤس' وقت کی خوراک ہے۔ تنقید و

تبصرے کی تینوں کتابیں اور 'انتخابِ شبلی' علم دوست لوگوں کے مطلب کی چیزیں ہیں۔ 'رحمتِ عالم' مذہبی کتاب ہے۔

ان میں سے رحمتِ عالم، کلیاتِ شبلی، انتخابِ شبلی، سوتیا چاہ، حُن کی عیاریاں دوسری بار چھپی ہیں۔ یہ دلیل ہے ان کے مقبول ہونے کی۔

یہ تناسب اچھا تو ہو مگر مکمل نہیں ہو۔ اس میں عام پسند اَدب، بچوں کا اَدب اور جدید طرز کی نظم نہیں نظر آتی ہیں۔ مختصر افسانے اور ناول جو چھپے ہیں عمدہ چیزیں ہیں۔ دتیہ رسالوں نے ان کی تعریفیں کی ہیں۔ شوکت تھانوی ہندستان کے چند گئے پٹھنے لکھنے والوں میں ہیں۔ اعظم کرپوری صاحب دہاتی زندگی پر افسانے لکھنے والے مشہور ہو چکے ہیں۔ عبدالشکور صاحب کی ایک کتاب ’یارانِ مودکہ‘ چھپی، مشہور ہو کر فروخت ہو چکی اور اب ’دانش محل‘ نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا ہو۔ امید ہے کہ یہ کتابیں بہت دنوں تک زندہ رہیں گی۔

ہمارے اشاعت گھروں کو یہ تو دیکھتے رہنا ہی چاہیے کہ کس خاص قسم کی کتابوں کی آج کل کھپت ہو مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اگر رُخ بدلا تو کدھر بدلے گا۔ جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں یہ اپنی فرنگیوں میں پچھلے دَوروں کو مات کیے دے رہا ہو۔ یوپی کا کوئی مکمل ذوق نہیں ہو، اس لیے یہ بدلا تو بہت تیز بدلے گا۔

’دَورِ جدید کے چند ہندو شعرا‘ بہت ضرورت کی چیز ہو اور امید ہے کہ یہ کتاب بہت مشہور ہو جائے گی۔ ہندستانی اکاڈمی کی کتاب کو دیکھ کر تو وہ راسے بدلتی پڑتی ہو، جو میں نے یوپی کی لکھائی چھپائی کے بارے میں قائم کی تھی۔ اکاڈمی کی کتابوں کی دو خصوصیتیں اور ہیں۔ زیادہ تر وہ لائبریری ایڈیشن ہوتی ہیں اور کافی پڑے لکھے لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ کتاب میں اگر زراسی ریڈر کی شان بھی رہے تو کیا کہنا۔ دنیا کے بڑے بڑے مصنفوں برگسان اور برٹن رسل تک کی کتابوں میں یہ شان ہوتی ہو۔ اس سے نہ صرف اشاعت گھر کی آمدنی بڑھ جاتی ہو، بلکہ زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔

گرد پوش بھی عجیب چیز ہو۔ جب کتابوں پر عمدہ جلدیں ہونے لگیں تو ان کی حفاظت کے لیے موٹے کاغذ کے گرد پوش آنے لگے۔ لیکن یہ گرد پوش جلد کی خوش نمائی کو چھپا لیتے تھے۔ اس سے دکان اور لائبریری کی زینت میں کمی ہوتی تھی۔ اس لیے بھدے گرد پوش کی جگہ عمدہ گرد پوش لے لی۔ اب یہ خود ایک حفاظت کی چیز بن گئے۔ اس لیے اُن پر شیشے نما کاغذ چڑھایا جانے لگا۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہو کہ یہ کاغذ پھٹ جاتا ہو۔ نہ جانے یہ مسئلہ تہ در تہ کہاں تک جائے، لیکن اس وقت

کتاب کی نمائشی حیثیت رکھنے کے لیے یہ چیز ضروری ہو گئی ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب میں کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

’دانش محل‘ کی کتابوں پر سوائے ایک کے گردپوش موجود ہے۔ اور اس پر خوب صورت محرابی ڈیزائن بنا ہوا ہے۔ ڈیزائن کی ٹوک پلک بہت عمدہ ہے۔ چھپا بھی عمدہ ہے لیکن محرابی ڈیزائن مقفہ عبارت کی طرح ہے۔ وہ زیادہ گہرا مطلب نہیں ادا کر سکتا ہے۔ آج کل تو ڈیزائنوں میں نظموں کی قوت بھردیتے ہیں۔ لیکن ایسے آرٹسٹ یوپی میں نہیں۔ اور نہ ان کے چھاپنے والے پریس۔ بہر حال مجلد کتابوں اور گردپوش کے ساتھ ایک مسئلہ پڑا تو ڈیزائن کا بھی ہو۔

کیا ’رحمت‘ عالم کے قلم کی کتابیں اور نہیں لکھی جاسکتی ہیں؟ اگر کہیں اس کی زبان زرا اور آسان ہو جائے اور قیمت اور کم تو کیا کہنا؟ اور ہاں کیشن زاپد ہو۔ کچھ مذہب کی خدمت میں اور کچھ اُردو کی۔ دارالمصنفین نے ان دونوں خدمتوں کا بار اٹھایا ہے۔

محکمہ اشاعت عامہ حکومت مالکِ متحدہ نے وہ کتابچے جو اس نے تین چار ماہ کے اندر **کتابچے** اندر نکالے ہیں، ہم کو بھیجے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم محکمے کے ڈائریکٹر جناب دہاج الدین عبا صاحب کے شکر گزار ہیں۔ یہ کتابچے تعداد میں ۲۸ ہیں۔ ۵۰ صفحے سے لے کر ۴۴ صفحے تک کے ہیں۔ ہر سائز کے ہیں۔ سرورق پر اور اندر بھی عمدہ عمدہ تصویریں ہیں۔ ان کی لکھائی چھپائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یوپی میں یہ بھی ممکن ہے۔ جس صحافی زبان کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں کہ اس میں نئی اصطلاحیں اور نئی بندشیں مضمون ہو گئی ہیں اس کی یہ اچھی مثال ہیں۔ ہماری اُردو کتنی جلد نئی ڈگریوں پر سبک خرامی سے چلنے لگتی ہے۔

# تبصرے

## ادبیات

دستور الفصاحت | مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی، ہندستان پریس رام پور قیمت دو روپے آٹھ آنے (جلد) دو روپے (غیر جلد)

مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ رام پور نے مطبوعات کتاب خانہ رام پور کے نام سے سلسلہ کتب شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف حکیم اسد علی خاں یکتا لکھنوی ہیں۔

یہ کتاب اردو صرف و نحو، عروض و قافیہ اور معانی و بیان پر ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جس میں ان شاعروں کا مختصر تذکرہ اور نمونہ کلام ہے جن کے اشعار کتاب میں مثال کے طور پر درج ہوئے ہیں۔

فاضل مرتب کا یہ ادعا ہے کہ یہ کتاب انشا کی کتاب، دریائے لطافت سے پہلے تالیف ہوئی اور اس لیے اسے تقدیم کی فضیلت حاصل ہے۔ دریائے لطافت ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں تصنیف ہوئی۔ سنہ تالیف یا تصنیف سے ہمیشہ یہ مراد ہوتی ہے کہ کتاب فلاں سنہ میں اختتام کو پہنچی۔ مصنف دستور الفصاحت نے کتاب کے آخر میں قطعہ تاریخ لکھا ہے۔ اور مادہ تاریخ

”دستورِ فصاحت“ ہو اور یہی کتاب کا نام ہو۔ اس سے ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۴ء) برآمد ہوتا ہو۔ مگر فاضل مرتب کہتے ہیں کہ ”حقیقت یہ ہو کہ یہ سنہ مسودہ صاف کرنے کے وقت کا تعین کرتا ہو سالِ تالیف کو ظاہر نہیں کرتا“ اپنے اس دعوے کی تائید میں مصنف کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں :-

”معنی مباد کہ عرصہٴ بعید و مدتِ مدید سپری گردید کہ چہرہٴ تسطیر ایں مقالہ و گردہٴ تصویر ایں رسالہ برصغیر وجود نقشِ گردنت، بہ سبب تردد و تشتتِ بال کہ بہ وجہ شقی لاحق حالِ بنِ غربتِ مال ماندہ در محلِ تطلُّ افتادہ بود۔ و دریں تعطیل کہ سالہا سال بسر آمد ہرگز طبیعت متوجہ نہ شد کہ بہ نظر ثانی پروازد یا آں را بہ نحوے کہ منظور بود، درست سازد کہ دوستے از دوستانِ فقیرِ سستی یہ شیخ رمضان علی صاحب سلمہ ربّہ از باشندگانِ لکھنؤ بستہ بہ نقشِ پرداختند و برسی تمام ہر ماہ ذیحجہ ایں سال آں را تمام ساختند“

اس سے بے شک یہ تو معلوم ہوتا ہو کہ اس سال سے بہت پہلے کتاب کی تالیف کا آغاز ہو گیا تھا لیکن مکمل کب ہوئی اس کا پتا نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں تکمیل کی تاریخ وہی سمجھی جائے گی جب درستی کے بعد صاف مسودہ لکھا گیا۔ یہ بیان کہ مسودہ سالہا سال یوں ہی پڑا رہا اور درستی اور نظر ثانی کا موقع نہ ملا مصنف کے انکسار پر دلالت کرتا ہو۔ اس قسم کے عذرات اکثر پرانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں جو ہمیشہ سچ نہیں ہوتے۔ عرشی صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں خاتمے کے تذکرہ شعرا سے جو اس قسم کے ثبوت پیش کیے ہیں کہ فلاں شاعر کو جو ۱۲۴۹ء سے قبل فوت ہو چکا تھا، سلمہ ربّہ لکھا ہو یا یہ لکھا ہو کہ چند سال ہوئے انتقال کر گیا تو یہ بھی قطعی ثبوت نہیں۔ بعض اوقات کتاب کی تکمیل میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں اور مدتوں معرضِ تالیف میں رہتی ہو۔

عرشی صاحب نے اس امر کے ثبوت میں کڑا دستورِ فصاحت کی تالیف ’دریائے لطافت‘ سے بہت پہلے انجام پانچویں تھی، مصنف کا یہ بیان پیش کیا ہو۔

”یہ کتاب اذکتب میں فن و رسائل میں ہنر کے مفید مطلب و معین مقصد میں باب میثد،

در نظر نہ داشتہ که موافق آں می نوشتم و از خطا مصنون می ماندم“

یہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ وہ خود انشا کے تذکرے میں انشا کی نسبت لکھتے ہیں ”غواص بحر فصاحت، صاحب دریائے لطافت“ اگر ”دریائے لطافت“ کا علم نہ تھا تو یہاں کیسے لکھ دیا۔ کتاب کے مقدمے کے پڑھنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”دریائے لطافت“ مصنف کی نظر سے گزری ہے۔ خصوصاً جہاں انھوں نے عربی فارسی الفاظ کی صحت اور تلفظ کے متعلق گفتگو کی ہے، معلوم ہوتا ہے۔ ’دریائے لطافت‘ ان کے سامنے تھی۔

افسوس ہے کہ عرشی صاحب نے پوری کتاب نہیں چھاپی صرف اس کا مقدمہ چھاپا ہے جو شکل سے بارہ صفحے کا ہے۔ رہا خاتمہ جس میں ۳۵ شعرا کا ذکر اور نمونہ کلام ہے سو وہ اصل موضوع سے کچھ تعلق نہیں رکھتا محض بھرتی کی چیز ہے۔ اگر پوری کتاب چھپ جاتی تو اس سے البتہ کتاب کے حسن و قبح کا اندازہ ہوتا۔

بارہ صفحے کے مقدمے میں دو صفحے تو حمد و نعت اور مرتبی کی مدح اور سبب تالیف کے نذر ہو گئے۔ چھوٹے زبان کی پیدائش اور اس کی فصاحت وغیرہ کے متعلق ہیں۔ باقی چار صفحوں میں اردو کے حروف تہجی کا ذکر ہے یعنی عربی اور فارسی کے کون کون سے اور ہندی کے کتنے حروف ہیں۔ حروف میں ڈ ٹ ڈ ٹ پ ج کا تلفظ عبارت میں کس طرح ادا کرتے ہیں۔ حساب جمل سے ان حروف کے کتنے کتنے اعداد ہیں۔ اس مقدمے میں کوئی بات نئی یا کام کی نہیں۔ ’دریائے لطافت‘ میں حروف کی بحث دیکھ کر انشا کی طباعی اور نکتہ رسی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کتاب کو دریائے لطافت کے مقابلے میں پیش کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

البتہ عرشی صاحب نے دیباچہ اور حواشی لکھ کر کتاب کی وقعت بڑھادی ہے اور تذکروں اور شعرا کے حالات اور ماخذ کتب کے بیان میں بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔



(خودنوشت سوانح حیات سرسید رضا علی صاحب - ہندستانی پبلیشرز، دہلی - صفحات ۵۳۰۔

## اعمال نامہ

قیامت آٹھ رُپے

سرسید رضا علی ہماری قوم کے خاص لوگوں میں سے ہیں۔ وہ بہت لطیف، شگفتہ مزاج، باخبر اور مستعد شخص ہیں۔ وہ بہت اچھے مقرر ہیں اور اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ویسے ہی اچھے لکھنے والے بھی ہیں۔ اور سب سے زیادہ تعریف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے محض اپنی محنت اور لیاقت کے بل پر ترقی کی ہو۔ اگرچہ یہ کتاب انھوں نے اپنی زندگی کے حالات پر لکھی ہو لیکن اپنے حالات سے زیادہ ان میں قومی حیات کا نقشہ نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق کتنا وسیع اور ان کے شوق اور اشتغال کس قدر گوناگوں ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کی سیاست، معاشرت، مذہب، تعلیم، تہذیب و تمدن، زبان و ادب پر تبصرہ ہی نہیں کیا بلکہ ان تمام معاملات میں خود بھی شریک رہے ہیں اور ان اداوں میں سے اکثر سے ان کا ذاتی تعلق رہا ہے جو ان مسائل اور مباحث کے مرکز ہیں۔ یہ سب حالات پان سو سے اوپر بڑی تقطیع کے صفحات پر ہیں۔ ان سب پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

پہلے ۶۷ صفحوں میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی ابتدائی ثانوی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ زندگی کا دوسرا باب علی گڑھ کالج کی تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں انھوں نے سرانٹی میکڈائل کے ناگری والے رزولوشن، ہندی اردو کے مناقشے اور معرکے، سرسید کی جانشینی کا ناگوار قضیہ، ایکشنل کانفرنس کے اجلاس، سرانٹی میکڈائل کے ہاتھوں اردو کی حمایت کی وجہ سے نواب محسن الملک کی تدبیر، سرانٹی کی کوتاہ اندیشی سے مسلم لیگ کے قیام اور کان پور کی مسجد کے دل آزار ہنگامے کے تماشے، چشم خود دیکھے اور ان میں شریک رہے اور کام کیا۔ اسی تذکرے میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ اور ان کی سیرتوں کا مقابلہ کمال خوبی اور سچائی سے کیا ہے اور مطلق پاس داری اور مؤرعاہیت نہیں کی۔ نواب محسن الملک کی فہم و فرست، موقع شناسی، خوش بیانی اور قومی درد اور خلوص کے بے حد قائل اور مدلل ہیں۔ لیکن جو ان

کی کم دوری تھی۔ اُسے بھی بیان کر دیا ہو لیکن ایسے سلیقے اور شائستگی سے کہ اگر نواب محسن الملک اس وقت زندہ ہوتے اور اسے پڑھتے تو بُرا نہ مانتے۔ یہ بات سیکھنے کے قابل ہو خاص کر ہمارے اخباروں اور سیاست دانوں کو۔

علی گڑھ کالج کی محبتوں، پروفیسروں اور طلباء کے رجحانات، بعض دوست احباب کے حالات، وہاں کی مصروفیتیں، کالج میں امیر حبیب اللہ خاں کی تشریف آوری، کالج یونین کے انتخاب، کالج کی مذہبی رواداری وغیرہ کا ذکر دل چسپ طریقے سے لکھا ہے۔ یہ گویا چالیس برس پہلے کا علی گڑھ تھا۔

اس کے بعد کے کئی باب زیادہ تر ہندستان اور مسلمانوں کے سیاسی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ضمن میں بہت سے دل چسپ اور بعض اہم واقعات آگئے ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں۔ سید رضا علی صاحب بہت دل چسپ اور وسیع مشرب آدمی ہیں۔ دسواں باب جو مذہب پر ہے اور گیارھواں جو حُسن و محبت پر ہے انھیں پڑھ کر آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

بارھواں باب اُردو شاعری اور ادب اُردو کی ادبی حیثیت ناٹک اور ڈرامہ نویسی پر ہے۔ اس میں کئی بحثیں آگئی ہیں جن پر تفصیلی تبصرے کی ضرورت ہے لیکن اس تبصرے میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اسے کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔

تیرھواں باب ”والدین، متاہل زندگی اور اولاد“ پر ہے۔ آخری باب (۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۷ء) کا عنوان ”چوتھائی صدی کے پولیٹیکل بھیکماتے کا جمع خراج“ ہے۔ اس میں اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے، حکومت کا بادہ اور کانگریس کا ظفر، ایکریکٹو کونسل کے بعض ہندستانی ممبروں کی خصوصیات، صلح کے بعد کا یوپی، کانگریس والوں کا موجودہ رویہ، بعض اہم پولیٹیکل واقعات، یورپ کے سفر، روس کی سیاحت، جنوبی افریقہ کی کہانی وغیرہ ہیں۔

یوں تو اس کتاب میں بہت سی باتیں ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے لیکن ایک غلطی کا میں خاص طور پر ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ صفحہ ۴۷۹ پر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”زبان کا تقضیہ ہماری بدقسمتی سے محض زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا سنگ بنیاد دراصل سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش ہے“

یہ صحیح ہو۔ لیکن انھوں نے اپنی تائید میں مسٹر کرشن پرشاد کول کا یہ قول نقل کیا ہے ”اُردو ہندی کا جھگڑا پُرانا ہے، اس جھگڑے کی پنا سیاسی بلکہ قومی ہے۔ یہ ادبی قضیہ نہیں۔ یہاں اس واردات کی سرگزشت کے سرسری بیان کا بھی موقع نہیں تاہم احباب کو یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اس قضیے کا شور پہلے پہل اس کے بعد سننے میں آیا جب سرسید مرحوم نے کانگریس کی مخالفت اس صوبے میں شروع کی تھی۔ اس جھگڑے کا تانتا بعد میں مسلم لیگ اور ہندو سبھا کی شکل میں جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ نرض کہنے کی یہ ہے کہ اس جھگڑے کی پنا قومی تعصب یا سیاسی اختلاف سے پڑی“ یہ قول نقل کرنے کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ ”مسٹر کول کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے سچی بات صاف طور سے کہ دی“ میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ یہ سراسر غلط ہے کہ ہندی اُردو کا جھگڑا سرسید مرحوم کی کانگریس کی مخالفت سے شروع ہوا۔ بلکہ یہ تنازع اُس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے بنارس کے بعض سربراہانہ ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں اور دفاتروں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے خارج کرنے کی کوشش کی۔ اُس زمانے کے اخباروں میں یہ تمام بحثیں اور کارروائیاں موجود ہیں۔ اُس وقت سرسید کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو بلا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا (جیسا کہ وہ اُس وقت تک کرتے آئے تھے) محال ہے۔ کانگریس کا اُس وقت وجود بھی نہ تھا۔ اب بلاشبہ اس مسئلے کو (خصوصاً گاندھی جی کی تائید کے بعد سے) سیاسی اور قومی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

سرسید رضا علی صاحب نے اپنی کتاب سادہ، بے تکلف اور اچھی اُردو میں لکھی ہے۔ کتاب میں اُس زمانے کے بہت سے واقعات ملیں گے جنہیں لوگ اب نہیں جانتے یا بھول گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے بعض غلط فہمیاں بھی رفع ہو گئی ہیں۔ مصنف نے تمام حالات و واقعات اپنے حدِ یقین تک صحت اور سچائی کے ساتھ لکھے ہیں اور چوں کہ یہ سب کے سب اُن کے چشم دید ہیں اور خود انھوں نے ان میں حصہ لیا ہے اُس لیے اُن کے سچ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ کتاب بہت دل چسپ اور پُر از معلومات ہے اور مطالعے کے قابل ہے۔

## سلسلہ تعلیم بالغان

مرتبہ ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

ہندستان تعلیمی رفتار میں دنیا کے مہذب ممالک سے اتنا پیچھے ہو کہ اگر یہاں صرف بچوں ہی کی تعلیم پر قناعت کی گئی تو تمام تر کوشش اور دوا دوش کے باوجود ہم ترقی یافتہ ممالک کو نہ پاسکیں گے اور جتنے برس ہمارے آئندہ نسلوں میں پڑے لکھوں کی تعداد بڑھانے میں صرف ہوں گے اُن تین برسوں میں ترقی پزیر ممالک و اقوام اور بہت آگے بھل جائیں گی۔ اس لیے اس کی ضرورت ہو کہ بچوں کے ساتھ بوڑھوں کو بھی پڑھایا جائے اور نیز جدید حقوق و قوانین سے متفع ہونے اور اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہو کہ اولاد کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ والدین کو بھی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ کچھ دلوں سے ملک میں تعلیم بالغان کی تحریک شروع ہوئی ہو اور مختلف ادارے اس سلسلے میں اپنی اپنی کوشش کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے بھی اس کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں شبینہ مدارس وسیعہ جاری کیے ہیں۔ جس میں تعلیم پانے والوں کی ہر طرح امداد اور ہمت افزائی کی جاتی ہو اور بے پڑے لکھے ملازمت، نجات پیشہ بالوں کو ترغیب دی جاتی ہو کہ وہ دن کو اپنے کام سے فراغت کر کے رات کو تھوڑی دیر پڑھنے میں صرف کریں۔ مگر اس وقت جو وقت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہو وہ یہ ہو کہ دیہی زبانوں میں بالغ مبتدیوں کے لیے موزوں کتابیں نہیں ہیں اور جو کتابیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ان کے لیے مناسب نہیں ہیں اس لیے کہ بچوں کے اسباق میں کھیل کود کی باتوں سے تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہو اور بوڑھے آدمیوں کو ان چیزوں میں خاص دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ نیز سیاسی ترقی کی موجودہ منزل میں اس کی بھی ضرورت ہو کہ لوگوں کو شہری حقوق و فرائض سے آگاہ اور نظم و نسق کے مختلف مراحل سے واقف کیا جائے۔ یہ چیزیں چوں کہ بچوں کی حد سے آگے ہیں اس لیے ان کی ابتدائی کتابوں میں ان مسائل کا ذکر کم ہوتا ہو مگر بالغ مبتدیوں کی ابتدائی کتابوں ہی میں یہ سب باتیں ہونی ضروری ہیں۔ اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے چھوٹے چھوٹے سو رسالوں کا ایک سیٹ بالغ مبتدیوں کے لیے تیار کیا ہے جس

میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عام معلومات، شہری حقوق و فرائض، معاشی اور سماجی ضروریات، نظام حکومت اور مختلف علوم و فنون کی سرسری واقفیت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہو۔ کارپردازانِ مکتبہ مستحقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آگے قدم بڑھایا اور زیر نظر سلسلہ رسائل شائع کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے رسالے جو زیادہ تر سولہ سولہ صفحے کے ہیں اور چند اس سے کچھ زیادہ کے مگر چھپس صفحے سے زیادہ کوئی نہیں ہو اور ایک ایک آنہ فی رسالہ قیمت ہو اور ان میں وہ معلومات بھری گئی ہیں جن کا جاننا ایک ہندوستان کے عام باشندے کے لیے ضروری ہو اور جن کے بعد وہ حالاتِ حاضرہ کے سمجھنے اور اپنے حقوق و فرائض برتنے کی قابلیت و صلاحیت حاصل کر سکتا ہو۔ مسلمان بالعموم کے لیے مذہب کے متعلق ۹ رسالے ہیں جن میں نماز، حالاتِ قرآن مجید، تعلیماتِ قرآن مجید متعلق عقائد و عبادات و اخلاق و معاملات، قصصِ قرآن مجید، کتبِ شریف اور حدیث شریف کا بیان ہو۔ سیر پر پندرہ رسالے ہیں جن میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، شہیدِ کربلا عمر ابن العزیز، حضرت غوثِ پاک، اجمیری خواجہ اور حضرت نظام الدین اولیا رحمہم اللہ علیہ کے حالات ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے مذاہب پر بھی چار کتابیں ہیں جن میں مہاتما گاندھی، کرشن کہنیا اور رام چندر جی کا ذکر ہو۔ ہمارا وہ ادبی ذخیرہ جس پر ہمیں ناز کرنا چاہیے کئی رسالوں میں پیش کیا گیا ہو تاکہ اس کے متعلق عام معلومات و فرائض تعلیم میں حاصل ہو جائیں اور ذوق و شوق کی صورت میں اس سے اور زیادہ فائدہ ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں شنوی شریف، گلستاں، فائدہ عجائب، مثنوی میر حسن، قصہ گل بکاولی، قصہ چار درویش، داستانِ امیر حمزہ، قصہ حاتم طائی، قصہ لیل مجنوں، شکنتلا اور مولانا عبدالحلیم شرر کے تین مشہور ناولوں کے خلاصے تحریر کیے گئے ہیں۔ ابتدائی مراحل سے مانوس کرنے کے لیے حکایتیں، گنتی، پہاڑے، اُجرت اور تنخواہ کا حساب اور چاند تاروں کا حال چند رسالوں میں بیان کیا ہو۔ چھ رسالے آئین و دستور کے متعلق ہیں جن میں میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، ضلع کی حکومت، حکومتِ ہند اور جمہوریت کے حالات مختصراً بیان کیے

گئے ہیں اور ان سب کی ترکیب اور طریق کار کو دل چسپ اور عام فہم انداز میں لکھا گیا ہو۔ دس سالے جغرافیے کے متعلق ہیں جن میں دُنیا، یورپ، امریکہ، افریقہ، ایشیا، ہندستان اور اس کے صوبوں اور دیسی ریاستوں کے نقشے دیے گئے ہیں اور ان کی مختصر تشریح کی گئی ہو۔ عام روزانہ کی زندگی میں ہیں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو اُن کا بھی ذکر الگ الگ رسالے میں کیا گیا ہو جیسے دکان دار، خدمت گار، خانساناں، ہشتی، درزی، تجام، بڑھئی، حلوائی، تانگے والا بھگرو اور اس ذیل میں نہایت مفید معلومات اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں جن کا افسانوی انداز بہت ہی دل چسپ ہو۔ اسی سلسلے میں ”امامی بھی پڑھنے لگے“ نامی رسالے میں تعلیم بالغان کی ترغیب کے لیے روزمرہ کی زندگی سے مفید نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ حفظِ صحت کے متعلق علاحدہ دو رسالے ہیں جن میں سے ایک نزلہ زکام کے بارے میں ہو اور ایک میں بچوں کی داشت پرداخت اور عام صفائی وغیرہ قصے کے طرز میں بتائی گئی ہو۔ صحت و صفائی کے ساتھ عام معلومات کے رسالے ہیں ان میں روزانہ زندگی کی عملی ضروریات اور معاشرتی اصلاح کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور یہ کوشش کی گئی ہو کہ سارے مسائل پڑھنے کے بعد ہم سماجی اور معاشی اصلاح کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے متعلق حسبِ مقتدرت کچھ کام کر سکیں۔

ان رسالوں کی تیاری اور طباعت و اشاعت میں جو کوشش و کاوش اور صرف برداشت کامیاب ہو اُس کے لحاظ سے کاغذ کی اس گرانی اور قحط کے زمانے میں ایک ایک آنہ قیمت لاگت سے بھی کم ہوتی اس لیے کہ خردہ خریداری میں ایک آنے کا اتنا کاغذ بھی نہ ملے گا جتنا ہر رسالے میں لگا ہو اور چنانچہ کہ ان رسالوں سے ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی گئی ہو اس لیے ہمیں یقین ہو کہ یہ کافی مقبول اور کامیاب ہوں گے۔ اسی کے ساتھ ہمیں امید ہو کہ جب ان کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو بعض معمولی استعام جو اس ایڈیشن میں نظر انداز ہو گئے ہیں، وہ بھی دُور کر دیے جائیں گے۔ خاص کر پروف کی جا بجا غلطیاں اور بعض رسالوں میں زبان کی خامیاں قابلِ توجہ ہیں جن پر یقیناً ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکنوں کی نظر ہوگی اس لیے ہم زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ یہ اشارہ

صرف اس لیے کر دیا ہو کہ ہمدی خواہ نابالغ ہوں یا بالغ انھیں تعلیم دینے کے لیے جو کتابیں بنائی جائیں وہ حتی الامکان ایسے اسقام سے پاک ہونی چاہئیں۔ اور الفاظ محاورات وغیرہ کے استعمال میں خاص احتیاط برتنی چاہیے۔ خاص کر ایسے فقرے جیسے ”ہمیں جان پڑتا ہے“ تعلیمی کتابوں میں نہ ہونے چاہئیں۔ اور نہ الفاظ کے ہجوں میں بے احتیاطی برتنی چاہیے جیسے ”حفیظ خانساں“ کے رسالے میں ”کباب“ کو ”کواب“، ”روزن نواب“ لکھا گیا ہے۔ بد قسمتی سے کباب اور نواب کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہو کہ صاحب بہادر لوگ نواب کو ”نباب“ کہتے ہیں اور مولوی عبدالملک صاحب نے جو رسالہ ”حفیظ خانساں“ کے مؤلف ہیں، کباب کو کواب کر دیا ہے۔ گویا کباب اور نواب کے جو بچے بھی مقرر کیے جائیں دونوں کا یکساں ہونا اور ہم قافیہ ہونا حرف روی تک ضروری ہے۔

لیکن اس قسم کے اسقام زیادہ نہیں ہیں اور ہندوستان میں عام طور پر طباعت اور پروف ریڈری کی جو سقیم حالت ہو اُسے دیکھتے ہوئے یہ نظر انداز بھی کر دیے جائیں گے لیکن ان رسالوں کی دیگر خوبیوں اور ان کے کارآمد ہونے کے لحاظ سے ہمارا یہ جی چاہتا ہے کہ ان میں ایسے خفیف نقائص بھی نہ رہتے پائیں۔ اور بہر نوع ان کی وجہ سے رسائل کے عام افادے اور قابل قدر ہونے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

(ر - ع - ۵)

## اُردو کے نئے رسالے اور خاص نمبر

انوارِ مبینی سے متعدد اُردو روزنامے، ہفتہ وار اخبار، ماہانہ رسالے شائع ہوتے ہیں ان دنوں مبینی اُس حصہ ملک کا اچھا خاصا اُردو مرکز بنا ہوا ہے۔ وہاں پہلے سے کئی وقیع رسالے نکلتے ہیں، ان میں ابھی ابھی ایک اور اچھے رسالے کا اضافہ ہوا ہے۔ ’انوار نے محمود سرور شاہ آبادی اور عبدالمجید قاضی کی ادارت میں اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور سید الودحین آرزو صاحب کی سرپرستی میں آنکھ کھولی ہے۔ کچھ مضمون لکھنے والے بھی اچھے پیدا کرے

ہیں۔ صبحِ راسے دو چار نمبر دیکھنے کے بعد قائم ہو سکتی ہے۔ البتہ ابتدا اچھی ہوئی ہے اور ہونہار نظر آتا ہے۔ رسالہ زیادہ تر ادبی دل چسپی کا ہے۔ ایک دو مضمون غور و فکر سے بھی لکھے ہوئے درج ہیں۔ نظموں کی تعداد نثر کے مضمونوں سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے۔ ممبئی سے ایسے رسالے کا نکلنا بہت غنیمت اور داد کے قابل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پروفیسر نجیب اشرف کی رہنمائی میں یہ اپنے سیار کو اور بلند کرنے کی کوشش کرے گا۔

بہت بڑی تقطیع، دو کالم کے ۶۸ صفحوں پر ہے۔ چھپا بھی اچھا ہے جس کی توقع ممبئی سے کم تھی۔ چندہ سالانہ سات رپے۔

یہ ماہانہ رسالہ حیدر آباد دکن سے ادارہ اشاعتِ اُردو کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ **پیامِ ادب** | اس وقت ہمارے سامنے اس کا ماہ دسمبر کا نمبر ہے۔ سب سے پہلا مضمون ماہرِ نقادری صاحب کا ”غلط اندیشیاں اور بدگمانیاں یا اصلاحِ خیال کی کوشش“ ہے۔ اس میں انھوں نے ترقی پسند ادب پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ ”وہ ترقی پسند جو گمراہ کن ادبی رجحانات کے حامی نہیں ہیں میرے مخاطب نہ سمجھے جائیں“۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر اختر حسین صاحب کا مضمون ”ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم“ ہے۔ اس سے رسالے کی ادبی رواداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں اور غزلیں اور کچھ دل بہلانے کی باتیں اور قصے کہانیاں ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ خاص کر سُرورق خوب ہے۔ سالانہ چندہ چھو رپے۔

یہ ترقی پسند مصنفین کی سہ ماہی کتاب ہے (رسالہ نہیں) نیا ادب ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ جوش یلح آبادی صاحب کا رسالہ کلیم بھی اسی میں ضم ہو گیا تھا۔ کچھ مدت باقاعدہ اور بے قاعدہ نکلتا رہا۔ لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے ۱۹۷۷ء میں بند ہو گیا۔ اب ممبئی سے چھوٹی سی تقطیع پر نکلتا شروع ہوا ہے۔



پہلا مضمون سبط حسن صاحب کا ”زندگی کی نقش گری“ پر ہو۔ عنوان سے مضمون کا منشا سمجھ میں نہیں آتا۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک نئے مضمون کی ان چند تصویروں کی تشریح کی ہو جس میں مصور نے بنگال کے قحط کا دردناک منظر پیش کیا ہو۔ اس مضمون میں اس دردناک مصیبت اور تصویروں کی تفسیر ہو اور ان تصویروں کے چند خاکے بھی ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی ایک مثنوی لکھ رہے ہیں جس کا نام ”حرفِ آخر“ ہو۔ اس میں کا ایک ٹکڑا ”دنیا کی تخلیق مہس سماہی میں شائع ہوا ہو۔ دنیا کی تخلیق جدید سائنس کی رو سے بیان کی گئی ہو۔ سب حقیقت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۵

کتنے قرون میں بڑھا یہ کاروانِ زندگی	سائنس اُکھڑ جاتی ہو اس تفسیر سے تاریخ کی
سوچ تو کس منزلِ طوفان سے آئی ہو حیات	کتنی موتوں کو نچل کر مسکرائی ہو حیات
کتنی لاتعداد زنجیروں کو ہو توڑے ہوئے	اور کلائی کتنے طوفانوں کی ہو مڑے ہوئے
کتنی تاریکی کے اندر پائی ہو راہِ نجات	کتنے میدان تھے جہاں گر گر کے اُٹھی ہو حیات
کتنی اندھی طاقتوں سے کس قدر دکھ پائے ہیں	کس قدر سناک قدرت کے طمانچے کھاتے ہیں
ابتدائی منزلوں کی بے پردہ بالی کو دیکھ	تہرانگن مادے کی ہمتِ عالی کو دیکھ
قدرتِ جبار کا بھی خشک ہوتا ہو لہو	مادے کے فاتحانہ دلولوں کے روبرو
روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے	مادے کے سامنے گردن جھکانا چاہیے

مادے کے سامنے گردن جھکانے کے منہ ہوئے کہ پھر اُسٹے پیروں اسی طرف جانا چاہیے جہاں سے منزل شروع ہوئی تھی۔ تخلیق کا ارتقا پوری قوت اور جوش سے لکھا ہو جس سے بیان و الفاظ کی شوکت اور قدرت ظاہر ہوتی ہو۔

ایک مضمون ”ہمارا پہلا فاشسٹ دشمن ادیب“ کے نام سے ہو۔ یہ خطاب ٹیگور کو دیا گیا ہو اور ثبوت میں اٹلی اور جاپان سے ان کی بیزاری پیش کی گئی ہو۔ کچھ نغلیں ہیں اور کچھ رؤسی افسانوں وغیرہ کے ترجمے۔ نہ معلوم سردار جعفری صاحب کے ناول کا صرف ایک باب کیوں درج کیا

گیا ہو۔ قاضی عبدالغفار صاحب کا خطبہ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد ممبئی اور پامال باتوں سے بھرا ہوا ہو۔ ڈاکٹر اختر حسین کا مضمون ”اُردو ادب کے جدید رجحانات“ اگرچہ تشنہ ہو لیکن پڑھنے کے قابل ہو اس میں بعض حقیقتیں اپنے اصلی رنگ میں دکھائی گئی ہیں۔

دو غیر ملکی ناولوں کا ذکر ہو۔ ایک ”ذوالِ پیر“ ہو دوسرا ”سپین میں ایک لمحہ“۔ ان کی کہانی اور کہانی کے خیالات کا خلاصہ دیا ہو۔ آخر میں ہندوستانی اور انگریزی فلموں کا مختصر ذکر ہو۔ فلموں کے متعلق رائے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے نقطہ نظر سے دی گئی ہو۔ یہ کچھ فلموں ہی پر منحصر نہیں یہ حضرات ہر خیال، ہر کتاب، ہر شخص کو اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ رجعت پسندی کیا ہو اور ترقی پسندی کیا۔ یہ مختلف فیہ ہو اور اس کے لیے الگ بحث کی ضرورت ہو۔

جو لوگ ترقی پسند ادب سے سو وطن رکھتے ہیں اور جو حُسن ظن، دونوں کو یہ سہ ماہی کتاب پڑھنی چاہیے۔ ایک پرچے کی قیمت ایک روپیہ اور سالانہ چندہ چار روپے۔ چھپائی کھائی بہت ذرا ہو۔

**ہمایوں، سال گرہ نمبر** | یہ سال گرہ نمبر بہت قابلِ تعریف ہو۔ سب سے پہلے سال گزشتہ کا جائزہ لیا ہو اور بڑی خوبی اور اختصار کے ساتھ سال

بھر کی اُردو کارگزاری کو بیان کیا ہو۔ اُردو کی ترقی اور حمایت میں جو جو کچھ ہوا ہو جہاں جہاں ہوا ہو جس جس نے کچھ کیا ہو، اُن کے پتے اُن کے خیالات اور کاموں کا خلاصہ سلسلے کے ساتھ چند ورق میں بڑی خوش بیانی کے ساتھ آگیا ہو۔ میاں بشیر احمد صاحب ہر سال اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے اچھے اچھے مضمون ہیں، ادبی اور تنقیدی بھی اور مزاحیہ بھی۔ نظمیں اور غزلیں، فسانے اور داستانیں بھی ہیں۔ سب میں کوئی نہ کوئی خوبی ہو۔ اکثر مضمون قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ سارا نمبر ایک خوش نما گلِ دستہ ہو۔ ہم میاں بشیر کو اُن کے ذوق پر مبارک باد دیتے ہیں۔

**ندیم کا شاد نمبر** | جنوری فروری مارچ کے تینوں نمبر لار شاد نمبر شائع کیا گیا ہو اور میں حضرات نے شاد مرحوم کے کلام پر مضامین لکھے ہیں۔ اس میں ہر قسم

کے مضمون ہیں۔ پہلے دو مضمون خود حضرت شاد کے لکھے ہوئے ہیں جو اتفاق سے دست یاب ہو گئے ہیں۔ پہلے میں انھوں نے اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہو۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں ”شاید ۱۹۷۷ء میں جب کہ میں دہلی گیا تھا مولوی حالی مرحوم نے مجھ سے کچھ بند مولود کے سنے وہ ایسے متاثر ہو گئے کہ میں کیا عرض کروں۔ پہلے وہ مرزا دبیر کے طرز کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے دیوان کا مقدمہ جو سنایا تو مرزا دبیر کے کلام کی ترجیح میر صاحب پر صاف سات تھی، میں نے برابر دو دنوں تک میر صاحب کا کلام سنا سنا کر رستے پر لگایا، میر صاحب مرثیہ دیے۔ مجھ پر اصرار کیا کہ اس حصے کو ٹم ہی لکھ دو، چنانچہ مقدمہ دیوان حالی میں یہ حصہ قریب قریب میرا لکھا ہوا ہو۔“

ہمیں اس کے ماننے میں بہت تاثر ہوا۔ اول تو جو لوگ مولوی حالی کے ذوق اور کلام سے واقف ہیں، وہ ہرگز اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ مرزا دبیر کو میر صاحب پر ترجیح دیتے ہوں۔ ان کے دوستوں اور جاننے والوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ انیس کے کلام کی بے حد قدر کرتے تھے اور محاسن انیس پر کتب لکھنے والے تھے۔ دوسرے مقدمہ انھوں نے دیوان مرتب کرنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں لکھا۔ یہ تالیف انھوں نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں کی تھی۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہو اور اس کے بعض مسائل پر لکھتے وقت کئی بار ہم سے گفتگو آئی۔ مولوی حالی اس قسم کے شخص نہیں تھے کہ وہ انیس کے کلام کے متعلق شاد سے کچھ لکھوا کر اپنے مقدمے میں درج کرتے۔ شاد اور حالی کے طرز تحریر میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ شاد کی نثر بہت ہی معمولی بلکہ فصاحت سے گری ہوئی ہوتی ہو۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سرسید، مولوی شبلی اور پروفیسر ارنلڈ کی جوارے اپنے کلام کے متعلق لکھی ہو، وہ بہت ہی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہو۔ پروفیسر ارنلڈ ان کے مولود کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ”میں نے کئی سو کتابیں پیغمبر اسلام کے مولود

کے بارے میں پڑھی ہیں مگر ایسے نادر مضامین نظم میں کبھی نہیں مئے ” جب کہ وہ اردو پوری طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ شاد مرحوم کی یہ کم زوری تھی کہ وہ اپنے خطوں اور تحریروں میں اس قسم کی تغلی کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد دوسرا مضمون مرحوم کا ایک طویل خط ہے جو مولانا سید مقبول احمد صاحب صدائی کے نام لکھا تھا اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ حالات تو بہت کم ہیں لیکن ”تنازع اہل وطن“ کی داستان بہت طویل ہے۔ اور ایک اور مکتوب جو ڈاکٹر سید محمود کے نام ہے اس میں بھی یہی دکھڑا رویا ہے اور ناقدری کی شکایت کی ہے۔

شاد مرحوم بلاشبہ خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے اور ان کا منتخب کلا بہت قابل قد ہے۔ مرثیے بھی انھوں نے (جیسا کہ وہ خود اپنے مکاتیب میں لکھتے ہیں) برکثرت لکھے، م۔ ایک مرثیہ شہادت ابام حسین کے بیان میں اس نمبر میں درج ہے اور اچھا ہے۔ حمید عظیم آبادی صاحب نے خاص طور پر ان کی مرثیہ گوئی کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے اور ان کے مرثیوں سے کچھ کچھ اقتباس بھی دیے ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر صاحب نے اپنی ایک ملاقات کا حال لکھا ہے۔ بہزاد فاطمی صاحب نے ”ارشادات شاد“ کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ دوسرے مضامین بھی اس عیب سے خالی نہیں۔ البتہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے احتیاط سے کام لیا ہے اور شاہ ولی الرحمن صاحب کی مفصلہ ذیل رائے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ ”اُن کے ضخیم دیوان غزلیات کا غایت سے غایت چوتھائی حصہ قابل اعتنا ہے باقی حصہ بالکل ناقابل توجہ ہے، بہت سے اشعار ایسے ہیں جو شعریت سے یکسر معز ہیں۔“ اس سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف کھوریہ، نائب مدیر، منظور احمد۔ چند سالانہ عام خیراتوں سے

قوم [تین رپے]

یہ رسالہ انجمن ضیاء الادب دہلی کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے

مضامین نظم و نشر میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ضیاء الادب کے حالات اور کارروائیاں، معلومات عامہ، نسوانی دنیا کا ذکر اور آخر میں بچوں کے لیے نوہال کلب کے نام سے کچھ حصہ ہوتا ہے۔ رسالہ دل چسپ ہے۔ فرصت کا وقت کاٹنے کے لیے اچھا ہے۔

یہ رسالہ اڑتیس سال سے مسلسل سرشتہ تعلیم پنجاب کی خدمت رہنمائے تعلیم لاہور کر رہا ہے۔ اب اُتالیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا یہ استقلال اور شوق قابلِ مبارک باد ہے۔ رسالے میں علاوہ تعلیمی معلومات اور خبروں کے ادبی اور اخلاقی مضامین اور نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ اس سے رسالہ کارآمد ہونے کے علاوہ دل چسپ بھی ہو گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے جنوری اور فروری ۱۹۷۷ء کا نیا رسالہ ہے۔ اس میں علاوہ تعلیمی، ادبی، اخلاقی مضامین کے مطالعے کے قابلِ سب سے اچھی چیز ”پانی پت کا آخری معرکہ“ ہے جو کاشی رائے سکرٹری نواب شجاع الدولہ وزیر اودھ نے ۱۷۹۷ء میں فارسی زبان میں لکھا تھا۔ کاشی رائے اس انقلاب انگیز معرکے میں موجود تھا اور چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اس تاریخی جنگ کے حالات اس سے بہتر اور کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ اصل فارسی کتاب اب ناپید ہے۔ یہ حُسن اتفاق ہے کہ لفٹننٹ کرنل جیمز آف دیناپور نے ۱۷۹۷ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اسی انگریزی کا یہ ترجمہ اردو میں ہے جو شیخ بدرالاسلام صاحب فضل بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ) ہیڈ ماسٹر حالی مسم ہائی اسکول پانی پت نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

# ”مجلہ طیلسانین“

## حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

اخبار، صحفہ، حیدرآباد دکن کی رائے :-

”یہ رسالہ بلند معیار پر پہنچ گیا ہے یہ رسالہ بہترین معاشی، معاشرتی، علمی اور تاریخی مضامین پیش کرتا ہے“

’ہماری زبان‘ دہلی کی رائے :-

”بہت کم اس نوعیت کے رسالے اس ظاہری و معنوی شان کے دیکھنے میں آئے ہیں - واقفیت اور تحقیق سے مالا مال مقالے ذہنیت افزا ہیں“

انگریزی رسالہ ’ہندوستان ریویو‘ پٹنہ کی رائے :-

”یہ رسالہ اُردو کا ایک بہت قیمتی اور معیاری رسالہ ہے اس کا حصہ معاشیات ساری اُردو صحافت میں اپنی نوعیت کا واحد نمونہ ہے - مضامین سے خود پڑھنے والوں میں بھی نئے خیالات

پیدا ہوتے ہیں“

قیمت سالانہ پانچ روپے -

چمکنے کا پتہ :-

دفتر ”مجلہ طیلسانین“ انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن

# انجمن ترقی اُردو (ہند) کی تازہ ترین مطبوعات

کیفیت | قیمت مجلد چار روپیہ (ملک)  
بلا جلد تین روپیہ (تسے)

تنقید شعر العجم | قیمت مجلد چھ روپیہ (تسے)  
بلا جلد پانچ روپیہ (ص)

کتاب الہند (حصہ دوم) | قیمت مجلد چار روپیہ (ملک)  
بلا جلد تین روپیہ (سے)

دیوان بہرام | مجلد دو روپیہ چار آنے، بلا جلد ایک سو چار آنے  
یودے اور اُن کی زندگی | مجلد تین روپیہ (تسے)  
بلا جلد دو روپیہ (ص)

نظریہ تعلیم (حصہ دوم) | قیمت مجلد چار روپیہ (ملک)  
بلا جلد تین روپیہ (تسے)

فردوسی پر چار مقالے | مجلد تین روپیہ آٹھ آنے (سے)  
بلا جلد دو روپیہ آٹھ آنے (ص)

مکالمات افلاطون | مجلد پانچ روپیہ (ص)  
بلا جلد چار روپیہ (ملک)

چند ہم عصر | قیمت مجلد ڈھائی روپیہ (ص)  
بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (ص)

حیوانیات | قیمت مجلد تین روپیہ چار آنے (سے)  
بلا جلد دو روپیہ چار آنے (ص)

اصطلاحات پیشہ وران | مجلد ششم | مجلد دو روپیہ بارہ آنے  
بلا جلد ایک روپیہ بارہ آنے

الف لیلہ ولیلہ (جلد دوم) | قیمت مجلد پانچ روپیہ (ص)  
بلا جلد چار روپیہ (ملک)

حکایات اغانی (جلد اول) | مجلد پانچ روپیہ (ص)  
بلا جلد چار روپیہ (ملک)

ہمارے بینک | قیمت مجلد دو روپیہ بارہ آنے (ص)  
بلا جلد ایک روپیہ بارہ آنے (ص)

مانڈو | قیمت مجلد تین روپیہ (سے)  
بلا جلد دو روپیہ (ص)

مشاہیر یونان و روم (حصہ اول) | مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (سے)  
بلا جلد تین روپیہ آٹھ آنے (ص)

برہ اور اُس کا مٹ | مجلد دو روپیہ آٹھ آنے (ص)  
بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (ص)

اخبار مجموعہ | مجلد تین روپیہ آٹھ آنے (سے)  
بلا جلد دو روپیہ آٹھ آنے (ص)

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ | قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (سے)  
بلا جلد تین روپیہ آٹھ آنے (ص)

مینجر انجمن ترقی اُردو (ہند) منبرا، دریا گنج، دہلی

# رسالہ ”سائنس“ کانیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع سے رسالہ ”سائنس“ بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقلم اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:-

مہتمم مجلس ادارت رسالہ ”سائنس“

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:- رسالہ ”سائنس“ (سہ ماہی) کے پرانے پیرچہ پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ ع) تک داتا احسن ترقی اردو (دہلی)، دہلی سے ۵ قیمت ایک روپے آٹھ آنے فی پیرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔



**Vol. 24**

**JANUARY 1944**

**No. 1**

# **THE URDU**

**The Quarterly Journal  
OF  
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)**

---

*Edited by*  
**ABDUL HAQ**

---

*Published by*  
**The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)**  
**Delhi.**





# اُردو

## انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سیہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر: عبدالحق

شائع کردہ  
انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

# اُردو

- ۱۔ یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے۔
- ۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں رمان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔
- ۳۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آئے۔
- ۴۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آرہیری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۰، دریا کنج۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشہر

## انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

### نرخ نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

چار مار کے لیے	ایک مار کے لیے	کالم
۳۰ روپے	۸ روپے	دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ
۱۵ روپے	۴ روپے	یک کالم (آدھا صفحہ)
۸ روپے	۲ روپے ۴ آئے	تف کالم (چوتھائی صفحہ)

جو اشتہارات چار مار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں - کمی وصول ہونا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ مار چھپوائے جائیں گے ان کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشہر صف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کر دے۔

المشہر

## انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

# اُردو

نمبر

اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

جلد ۲۴

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت : دہلی

---

سید صلاح الدین جمالی فیضانِ نبی نے جتہ پریس تلی ماراں دہلی میں چھپوا کر  
دفترِ انجمن ترقی اُردو (دہند) دہلی سے شائع کیا

---

# اُردو

جلد ۲۴ ————— اپریل سنہ ۱۹۴۴ء ۶ ————— نمبر ۲

## فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۔	عرض داشت	۱۵۷
۲۔	اُردو، ہندوستانی، ہندی	۱۸۰
۳۔	سر سید کے لکچر	۱۹۱
۴۔	منشی اقبال و رما سحر ہنگامی	۲۲۷
۵۔	تشطیر	۲۴۷
۶۔	روحِ تبسم، جگر	۲۷۰
۷۔	ساما ہی تبصرہ	۲۷۷
۸۔	تبصرے	۲۹۳
	مضمون نگار	
	منقول از اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء	۱۵۷
	جناب پنڈت دتاتریہ صاحب کیفی	۱۸۰
	سید رشید الحسن صاحب ایم۔ اے	۱۹۱
	جناب بابو راج بہادر لکھوڑہ ایم اے ال ال بی۔	۲۲۷
	جناب محمود اسرائیلی صاحب	۲۴۷
	جناب سید مختار حسین صاحب مختار بی اے ال ال بی	۲۷۰
	جناب حیات اللہ انصاری صاحب	۲۷۷
	ایڈیٹر و دیگر حضرات	۲۹۳





# عرض داشت برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب

بہ حضور جناب نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل

(منقول از اخبار سائنٹیٹک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ ع)

[نکل ہند اردو کانفرنس، ٹاگ پور نے حال میں یہ قرارداد منظور کی ہے کہ انجمن ترقی اردو سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندوستان (انگریزی علاقے) کے کسی مقام میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے ارکان اور ابتدائی تدابیر پر غور کرے جس میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اردو ہو اور جو سرکاری طور پر بھی مسلم ہو۔ انجمن اس دعوے داری سے عہدہ برآ ہونے پر متوجہ ہو لیکن اس سلسلے میں ذیل کی عرض داشت خاص دل چسپی سے پڑھی جائے گی جسے آج سے تین پیڑھی پہلے سرسید مرحوم نے تحریر کیا اور محضر کے طور پر بہت سے ہندو مسلمان حضرات کے دستخط کرا کے سرکارِ انگریزی میں پیش کیا تھا۔

اس عرض داشت میں مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم دیسی زبان کے ذریعے دینے کی دلیلیں بڑی قوت اور قابلیت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور زبانِ انگریزی کی تعلیم کو مفید اور ضروری بتانے کے ساتھ، یہ بتایا گیا ہے کہ اگر دیسی زبان ذریعہ تعلیم نہ ہوگی تو جدید علوم ہندوستان میں عام اشاعت نہ پاسکیں گے۔

اس تحریر سے جسے اب ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہو، جہاں سید احمد خاں مرحوم کی حیرت انگیز فراست اور دُور بینی کا ثبوت ملتا ہو، وہاں اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوتا ہو کہ (۱) وہ اعلیٰ تعلیم کو طبقہ خواص تک محدود رکھنے کے حامی تھے اور (۲) اُس تعلیمی حکمت عملی کے سراسر موید تھے جسے بد قسمتی سے (لانڈ) میکالے کی پُر جوش سفارش پر سرکارِ انگریزی نے ہندستان میں اختیار کر لیا اور اب تک اُسی ڈگر پر چل رہی ہو۔ [ادارہ]

ہم برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب کے ممبر جن کے دستخط اس عرض داشت کے ذیل میں ثبت ہیں، بہ دل و جان گورنمنٹ کی اُن سخت کوششوں سے بخوبی واقف اور ان کی قدر و منزلت کرنے والے ہیں۔ جو اُس نے ہندوستانیوں کی عام تعلیم کے باب میں کی ہیں۔ اور ان کی عرض میں ہم سب پر گورنمنٹ کی نہایت بڑی احسان مندی واجب اور لازم ہو، ہم کو اچھی طرح یقین ہو کہ گورنمنٹ نے اس تعلیم کے کام کو نہایت خالص نیت اور بالکل بے غرضی سے اختیار کیا ہو۔ تعلیم سے گورنمنٹ کا اصل مقصود بالکل لوگوں کی بہبودی اور فلاح ہو وہ اپنی رعایا کی حالت کو ترقی دینے کے باب میں ہمیشہ ساعی رہتی ہو۔

اس یقین کے مستقل اثر سے جو ہمارے دلوں پر اچھی طرح نقش پزیر ہو گیا ہو پیش گاہِ حضور میں ایسی چند تدبیریں پیش کرنے کے لیے ہماری ڈھارس بندھی ہو جن کا عمل درآمد ہو جانے پر ہم کو کامل بھروسہ ہو کہ اس موجودہ سرشتِ تعلیم سے لوگوں کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ اور ہم کو بہت بڑی توقع ہو کہ گورنمنٹ کمال فیاضی سے ان تدبیروں پر ازبں سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فرمائے گی ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو علوم و فنون اب ایشیا کے ملکوں میں جاری ہیں۔ جن کے موضوع اور تاریخی حالات ہمارے بہت سے مشہور معنفوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور اپنی اصل حالت میں بغیر کسی طرح کے تغیر و تبدل اور ترقی کے ہم تک پہنچی ہیں اُن میں سے اکثر ایسے اصول پر مبنی ہیں جو زمانہ حال میں علم کی ترقی ہونے سے بالکل غلط اور ناجائز ٹھہرے ہیں۔ اور بعض عام ایسے ہیں کہ اگرچہ بنیاد اُن کی صحیح اور مضبوط اصول پر ہو مگر زمانہ حال کی نئی نئی تحقیقاتوں اور تلاشوں کے

جنب سے ان کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ہو اور بعض علم ایسے ہیں کہ اب تحصیل ان کی محسن فضول اور غیر مروج ہوگئی ہو اور برخلاف اس کے آج کل دُنیا میں بہت سے ایسے علوم و فنون کی گرم بازاری ہو جو زمانہ حال کے ایجاد ہیں۔ اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل معلوم نہ تھا۔ پس یہ ایک ایسی بات ہو جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ایشیا میں جو علوم اور زبانیں اب جاری ہیں ان کی تحصیل ہمارے علم کی ترقی اور روشن ضمیری کے واسطے محض غیر کافی ہو اور یہ بات بھی ایسی ہی تحقیق اور مسلم ہو کہ مذکورہ فائدے کے حاصل کرنے کے واسطے کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں ہو کہ ہم انگریزی زبان کو سیکھیں اور اب جو مالا مال خزانے علم و ہنر کے زمانہ حال میں جمع اور قائم ہوئے ہیں ان تک اس زبان کے ذریعے سے رسائی حاصل کریں۔ انہی وجوہات کے لحاظ سے ہم سب اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کی جو تدبیر اس ملک میں انگریزی زبان کے رواج دینے کی ہو وہ حقیقت میں نہایت عمدہ اور مناسب سوچی گئی ہو۔

مگر یہ بات ممکن ہو کہ جس حالت میں ہم ایک اچھے کام کے کرنے پر کوشش کرتے ہوں تو ہم اور ایسے کاموں سے جو زیادہ ضروری اور زیادہ مرتبے کے ہیں غافل رہیں اور اسی طرح سے ان کوششوں کی قدر و منزلت کو گھٹا دیں جن کو اگر بطور مناسب اور بلا رُ رعایت کے رکھا جائے تو ہم کو وہ نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی پر پہنچادیں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ غلطی تعلیم کے سرشتہ حال میں ہوئی ہو۔ ہماری بڑی آرزو یہ ہو کہ یہ سرشتہ ایسا بے عیب اور بے داغ ہو جائے جیسا کہ حوصلہ توقع میں سا سکتا ہو اور ہم اس بات کا خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہم ایک اچھے کام کے پورا کرنے پر کمر باندھ رہنے سے ایسے مطلبوں سے غفلت کر رہے ہیں جو بہت بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ضروری ہیں۔ جو کوئی گورنمنٹ خصوصاً انگریزی گورنمنٹ اپنی رعایا کے بہت سے گروہوں کو عام تعلیم دینے کا کام اختیار کرے تو اس کا فرض ایسے علم اور پند اور نصیحت کی تعلیم دینا ہو جو لوگوں کے روزمرہ کے کاروبار میں کام آوے اور فائدہ بخشے اور اس سے ان کی عادت اور اخلاق کی تہذیب اور اصلاح ہووے اور لوگوں کو قدرت اور علم کے حقائق اور حالات

سے جہاں تک ممکن ہو آگاہی حاصل ہو۔ اور ان کے دلوں میں عمدہ عمدہ اصول اور بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے خیال پیدا ہوں۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے کہ ان اصولوں اور خیالوں کی اصل و بنیاد کسی مذہب کے مسائل یا کسی قومی یا مذہبی رسم و رواج پر نہ ہووے بلکہ وہ قدرتی اخلاق کے قوانین اور علی العموم عقل کے تسلیم کر لینے پر مبنی ہو یہ کام مشکل تو بے شک ہو مگر غیر ممکن نہیں اور اگر اس کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کوشش کی جائے تو نتیجے اُس کے ملک کے حق میں نہایت عمدہ ہوں۔ چنانچہ لوگوں کی عقل کے روشن ہونے سے ان کے مال و دولت اور جہانی فائدوں کو ترقی ہوگی جبکہ وہ ان سب چیزوں کی ماہیت سے جو ان کے چاروں طرف نظر آتے ہیں واقف ہو جائیں گے۔ تو ایسے فاسد خیالوں اور بیہودہ خوف و اندیشوں کو آئندہ فوراً اور یک بیک قبول نہ کر لیا کریں گے جس سے لوگوں کی طبیعتوں کو پریشانی حاصل ہوتی اور سب میں ایک ہل چل پڑ جاتی ہو۔ اور عام امن و آسائش اور انتظام میں خلل واقع ہوتا ہو۔ علاوہ اس کے جو نفرت اور عداوت نسل اور مذہب کی غیریت سے پائی جاتی ہو وہ قدرت اور عقل کی روشنی کے آگے نیست و نابود ہو جائے گی اور بجائے ان سب کے آپس میں لحاظ و پاس اور بھروسہ قائم ہو جائے گا۔ جو گورنمنٹ سوائے ان غرضوں کے اور کسی قسم کی اور شاید اس کم تر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کہ ان کو صرف اس قدر تعلیم کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہو جائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کھنچوائے یا اور کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھلنے میں کرتا ہو مگر ہم کو دل سے یقین ہو کہ گورنمنٹ ہند کی یہ غرض اور ایسا ارادہ نہیں ہو بلکہ اس بات کو ہم تحقیق جانتے ہیں کہ اس نے جو کام تعلیم کا اختیار کیا ہو وہ بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے مقصدوں اور ارادوں سے شروع کیا ہو چنانچہ اس کا مشہور عمدہ ثبوت وہ تین یونیورسٹیاں یعنی مدرسہ ہائے اعظم ہیں جن میں علی العموم علم تک ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی دسترس ممکن ہو۔ اس لیے ہم اپنی گورنمنٹ کو اس بات کے تصفیے پر متوجہ کرتے ہیں جو سرشتہ تعلیم کا آج کل سرکار کا درست

اور قائم کیا ہوا موجود ہو وہ اس قابل ہو یا نہیں کہ اس سے تعلیم کے اصلی مقصد جن کا تذکرہ بالا جہاں اوپر ہوا حاصل ہوویں ہم نیازمندی سے عاجزانہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری رائے میں اس سرشتہ سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوں گے سرشتہ مذکور کے ذریعے سے چودہ کروڑ آدمیوں میں جو گورنمنٹ ہند کے محکم اور مطیع ہیں چند آدمیوں کو ایک عمدہ اور معقول تعلیم کے تمام حظ اور لطف اور فائدے حاصل ہوئے ہوں مگر جب کہ بہت سی خلقت کا ان چند تعلیم یافتہ سے مقابلہ کیا جائے تو ان کی تعداد نہایت بے حقیقت اور خفیف ٹھہرتی ہو کیوں کہ خلقت کے اس انبوہ کثیر کو روشن ضمیری حاصل ہونا تو ایک طرف روشن ضمیری کا پرتو بھی اس پر نہیں پڑا ہو، غرض کہ ملک بہ اعتبار ہیئت مجبوری اپنی اصل تاریکی کی حالت میں ہو اور اس نے علم اور شایستگی کے کسی فائدے کا مزہ نہیں چکھا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس عرض داشت کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہو کہ ایشیا کے مردہ علوم و فنون شایستگی اور خوبی کو تروتازہ کیا جائے بلکہ اصل غرض یہ ہو کہ پچھلے زمانوں میں اہل یورپ نے جو علم و ہنر بہم پہنچایا ہو اور وہ زیادہ عمدہ اور مفید ہو اس کا رواج ملک میں ہوئے۔ سوائے اس کے ہماری خواہش یہ ہو کہ بجائے چند آدمیوں کے، گروہوں کے، گروہوں کو فائدہ پہنچے۔ اخلاق پسندیدہ اور قومی دانائی کی نعمتیں تمام ملک پر پھیل جائیں۔

بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعے سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہو اور یہی بات ایسی ہو جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شلئے ہونے میں پڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں۔ اور اسی کے باعث سے لوگوں کی رائے اور خیالات میں بہتر تبدیلی ہونے میں توقف ہوتا ہو اور عام تعلیم مضلل اور پڑمردہ ہو گئی ہو اور چند لوگ ایسے ذریعے سے جس تک رسائی شکل ہو اس علم کے ثمروں کو حاصل کر سکتے ہیں جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہیے۔

یہ جو حال تعلیم کا ہو رہا ہو اس کا باعث یہ نہیں ہو کہ لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے تھے۔ ہم کو یقین ہو کہ وہ زمانہ ایسا گزر گیا کہ پھر کبھی نہ آئے گا انگریزی کی ضرورت اور

کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم اور فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبانوں کو ذریعہ ٹھہرایا جائے جو معقول رائیں کہ ہالسن صاحب نے ہندستان میں علم پھیلنے کے لیے ایک جلسے کی بنیاد پڑنے پر ظاہر کیں، ان کا ذہن نشین کرنا نہایت مناسب اور بہت اچھا ہو۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا ہو کہ میرے نزدیک اگر ہم کتابی تربیت کے ذریعے سے ہندستان کو فی الحقیقت فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ ہم کو اسی طرح پر پہنچانا چاہیے جس طرح کہ ہم اس کو اپنی حکومت اور اپنے قوانین سے پہنچاتے ہیں یعنی کتاب کے علم کو جھگڑوں اور دقتوں سے پاک صاف اور عام فہم کر کے ان کی خاص زبان سے اس کو ہم رشتہ اور ہم پیوند کر دیں تاکہ بہت لوگوں کی رسائی اس تک ہونے لگے۔ اور انھی مقصودوں کو اصلی اور مستحکم سمجھ کر ان کی تہذیب اور تربیت کو اپنا بڑا منشا قرار دیں۔ علم کی اس طرح پر تعلیم کی جاوے کہ وہ روزمرہ کے کام میں آئے اور فائدہ بخشے اور اس کی تحصیل میں ہر قسم کی آسانی کرنی چاہیے جب کہ یہ سب میری خواہشیں ہیں تو میں علم کی تحصیل کے واسطے زبان کے ذریعے کو اس لیے از بس ترجیح دیتا ہوں کہ اول تو طالب علم کو اس میں بہت سی آسانی ہوتی ہو دوسرے اس کی یہ خاصیت ہو کہ جو علم اس زبان کے ذریعے رکھایا جاتا ہو اس کا اثر عمل میں بہت قوی اور مفید ہوتا ہو۔ علاوہ اس کے اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہو کہ اس کے ذریعے سے علم خوب شائع ہوتا ہو۔

اگر علم کی تحصیل غیر ملک کی زبان کے ذریعے سے کی جائے تو اس میں دوچند دقت صرف ہوتا ہو اول تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہو اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعے سے جس کو انھوں نے حاصل کیا ہو کسی مفید علم کی تحصیل کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہو۔ بہت تھوڑے طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو بزبانی علم تحصیل کر لیتے ہیں دوسرے علم کی تحصیل خاص ہم کے ہی فائدوں کے لحاظ سے ضروری ہوتی ہو اور شاذ و نادر ایسے طالب علم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کے تحصیل میں کامیابی حاصل ہو مگر جب کہ اس کے دیں کی زبان میں علم کی تعلیم کی جاتی ہو تو طالب علم کا کچھ بھی وقت ضائع

نہیں ہوتا اور یہ بات تحقیق ہو کہ اُن مضمونوں سے اُس کو کچھ کچھ آگاہی ہوگی جن پر اُس کی رسائی اس حالت میں کہ وہ زبان جس کے ذریعے سے اُن مضمونوں کو حاصل کیا غیر ملکی ہوتی اگر غیر ممکن نہ ہوتی تو جیسا کہ اکثر ہوتا ہو نہایت مشکل ضرور ہوتی۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہونی چاہیے ہماری یہ مراد نہیں ہو کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر تروتازہ کیے جائیں اور ان کی تعلیم ہو بلکہ ہم صرف اس بات کے خواست گار ہیں کہ جو علوم و فنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں ان کو شائع کیا جاوے کیوں کہ بجز اس کے ہماری اور کچھ غرض نہیں ہو کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری تمام ہندوستان میں عموماً پھیل جائے۔

دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں ایک تو ٹامسن سول انجینئرنگ کالج روڈکی اور دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اُردو روڈکی کالج کے انگریزی اور اُردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجے کے علم سکھائے جاتے ہیں یعنی جن کتابوں کی تحصیل اُردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل ان کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں ایک بند سوالوں کا انگریزی میں اور دوسرا اُردو میں دیتے ہیں جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہو۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں کبھی اُردو فریق کا طالب علم انگریزی فریق والے اپنے ہم سر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہو اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہم سر اُردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہو دونوں فریق کے طالب علموں کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں صرف وہ ذریعہ مختلف ہوتا ہو جس سے وہ علم کی تحصیل کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہو کہ اُردو کے طالب علم اپنے انگریزی کے ہم سر طالب علموں سے اُن مضمونوں کے بہ خوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہوں جو دونوں کو ایک ہی معین حد تک یکساں طریق پر سکھاتے ہیں۔



پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا جائے تو اسی درجے کا علم جس تک اب چند ایم اے کے سنیافتہ طالب علموں کو رسائی ہوئی ہو بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا۔ اب جو سرشتہ تعلیم کا غیر ملکی زبان کے ذریعے جاری ہو اس کی بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ہو اس کو وہ یونیورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہو اور جلد اس کے ذہن سے وہ علم اُتر جاتا ہو۔ مگر جو طریقہ ہم نے تجویز کیا ہو اس کے ذریعے سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہو جائے گا صرف وہ ہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کے تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم طالب علم کی استعداد اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا۔

اس بات کا خیال کرنا بے جا ہو کہ دیسی زبان کے ذریعے اعلیٰ درجے کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور ہارج ہوگا کیوں کہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی ضرورت ہو مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا حالانکہ یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض بخش ہو اور ایک دوسرے کا ہارج اور مزاحم نہیں۔ انہی وجوہات سے تعلیم کا انگریزی میں ہونا اور علیٰ العموم تربیت کا دیسی زبان کے ذریعے سے ہونا ایسے دو متفرق کام ہیں کہ دونوں ایک اچھے نتیجے کا ممد و معاون ہیں۔ حقیقت میں یہ دونوں دو جدا جدا آلے ایک ہی قسم کے نتیجوں کے حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں بلکہ اچھی طرح یقین ہو کہ اگر اہل یورپ کے علموں اور ان کے نتیجوں کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے کی جائے تو اس سے انگریزی زبان کی تحصیل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور ہندوستانیوں میں انگریزی کے عموماً پھیلنے میں اس سے بڑی مدد ہوگی۔ بالفعل ہندوستانیوں میں ان علموں اور فضل کی تعظیم و تکریم بہت سی نہیں ہو جو اہل یورپ کو حاصل ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہو کہ یورپ کی تحصیل اور تحقیق اس سے برتر نہیں ہو جو ایشیا والوں کو پہلے حاصل تھی اس کی یہی وجہ ہو کہ ہندوستانی اہل یورپ کے علم تربیت سے

بالکل واقف نہیں ہیں اور یہ اُن کی نادانیت ایسی ہو کہ جب تک ان کو اس کے دُور کرنے کا ذریعہ حاصل نہ ہوگا جیسا کہ اب تک حاصل نہیں ہو اس وقت تک وہ نادانیت قائم رہے گی۔ فرض کیا جائے کہ ایک ہندوستانی کلکتہ بلکہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں علم تحصیل کر کے گھر کو واپس آئے اور ایم اے یا ایل ایل ڈی کی سند کے تمام اعزاز اس کو حاصل ہوئے ہوں لیکن جب وہ اپنے دوستوں سے گفتگو کرے گا تو جو علم اس نے حاصل کیا ہو اس کا کچھ بھی حال ان کو نہیں بتا سکے گا۔ انگریزی اصطلاحیں اور الفاظ تو اس کے دل میں بھرے ہوں گے مگر مطلب اور منشا اپنی دیسی زبان میں عبارت نہ رکھنے کے سبب سے اپنے دوستوں کے رُوبرُو بالکل نہیں بیان کر سکے گا۔ اسی وجہ سے اس کا علم اس کے دوستوں اور واقف کاروں کو کچھ فائدہ نہ بخشنے گا۔ اور اس کے علم کو ذیل اور حقیر سمجھیں گے۔ اب اگر تعلیم اس کی دیسی زبان کے ذریعے ہو دے اور وہ تمام لوگوں پر جو اس سے ملتے جلتے ہیں اپنے علم اور تجربوں کو فوراً ظاہر کر سکے تو ان میں اس کی کسی قدر زیادہ عزت اور بڑائی ہو اور نادانیت کی وجہ سے نفرت کرنے کی بجائے لوگ اس کی حرص اور تقلید کریں۔ اور ایک برتر درجے کی تربیت کے عمدہ نتیجوں کے ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے سے ان کو بھی اس کی مانند علم حاصل کرنے کی ترغیب ہو اور اس کا ایسا اثر ہو کہ زمانہ حال کے علموں کی تحصیل کا شوق لوگوں کے دلوں میں پھیل جائے۔

دجہات مسطورہ بالا کی رُو سے ہم مسکینی اور نہایت عاجزی سے گزارش کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند اعلیٰ درجے کی تعلیم عام کا ایسا سرشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہو کرے اور دیسی زبان میں انہی مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جن میں کہ اب طالب علم کلکتہ کی یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کے مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کی عوض میں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں ان طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو انہی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ حاصل یہ ہو کہ خواہ تو ایک اُردو فریق کلکتہ کی یونیورسٹی میں قائم کیا جائے

یا ممالکِ شمالی و مغربی میں ایک یونیورسٹی دیسی زبان کی علاحدہ مقرر کی جائے۔

گورنمنٹ پنجاب نے مشرقی زبانوں کی ایک یونیورسٹی کی ضرورت کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد ڈالنے کی کوشش شروع کی ہے اس یونیورسٹی کا مقصد اور منشا مشرقی زبانوں کا شگفتہ اور سرسبز کرنا ہے اور یہ یونیورسٹی ایک ایسا ذریعہ ہوگی جس کی بدولت اہل یورپ کے علم اور شایستگی اور تربیت ہندوستان میں پھیلے گی۔ جس سے ہندوستان کی حالت بالکل بدل جائے گی۔

یہ بات البتہ سچ ہو کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی زبانوں میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کر سکے جو اب یونیورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ضرور ہوتا ہو مگر ایسی کتابوں کا موجود ہو جانا کوئی شکل امر نہیں ہے۔ جو کتابیں یونیورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہو سکتے ہیں۔ اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے عالم فاضل اس کام کے لائق موجود ہیں۔ اور علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی اسی کام کو انجام دے رہی ہے۔ اس نے حال ہی میں ایلفنٹن صاحب کی مشہور تاریخ ہندوستان کا ترجمہ مشہر کیا ہے جو ایک کتاب یونیورسٹی کے امتحان کے مضمونوں میں سے ہے اور آئندہ بھی وقتاً فوقتاً سوسائٹی اسی قسم کے ترجمے چھاپتی رہے گی۔

خاتمے پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جائے تو اسی ملک کی حالت کو از سر نو عمدہ اور بہتر کرنے اور اس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کے دور کرنے اور سب حاکم محکموں کو برابر بہت سافائدہ پہنچانے کا یہ تجویز ایک بڑا موثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی۔ ہم اس لیے نہایت ادب اور بھروسے کے ساتھ امید رکھتے ہیں کہ ہماری روشن ضمیر گورنمنٹ ہند جس نے اپنی ہندوستانی رعایا کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہمیشہ اپنی آرزو اور فکر ظاہر کی ہے اس بڑے پائے کی تجویز پر جواب ہم پیش کرتے ہیں اپنی نہایت بخیدہ اور پسندیدہ توجہ قیامی سے کرے گی۔ الٰہی آفتاب و دولت و اقبال ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے۔

## عرض داشت کی رسید از جانب حکومت ہند

(منقول از اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۲۳ اگست سنہ ۱۸۹۶ ع)

### چٹھی

بنام راجا جوگیش داس بہادر دیگر ممبران برٹش انڈین ایسوسی ایشن مالک مغربی دہلی مقام شملہ

مورخہ ۱۲ اگست سنہ ۱۸۹۶ء

۱۔ صاحبو—آپ کی عرض داشت تعلیم کے باب میں مورخہ یکم ماہ حال مقام علی گڑھ سے بہ جنسہ میرے پاس پہنچی اور میں نے اس کو حضور دائسراے کے روبرو پیش کیا۔ عرض داشت مذکور حضور دائسراے کے ارشاد کے بموجب صیغہ ہوم ڈپارٹمنٹ کو حضور محترم الیہ بہ اجلاس کونسل کے روبرو پیش ہونے کے واسطے منتقل کر دی گئی ہے جہاں اس پر وہ دلی غور اور توجہ کی جاوے گی جو اس کی عمدگی کے باعث سے اس پر ہونی چاہیے۔

میں آپ سے نہایت رضامندی کا اظہار کرتا ہوں جو حضور محترم الیہ کو آپ کی عرض داشت کے لحاظ سے حاصل ہوئی ہے جو دلی فکر عرض داشت مذکور سے آپ کے اپنے ہم وطنوں کے اصلی مطالبوں کے واسطے ثابت ہوتی ہے اور جو عمدہ تربیت یافتہ رائیں اس سے ظاہر ہوتی ہیں اور جس مائٹم اور صاف تقریر میں وہ مرتب کی گئی ہے یہ سب باتیں آپ کو یکساں قدر و منزلت اور نیک نامی بخشی ہیں علاوہ اس کے انھی سب باتوں سے اس انتظام تعلیم کے فائدے ثابت ہوتے ہیں جو آج کل رائج ہے۔

حضور دائسراے کو بھی اسی قدر فکر ہے جس قدر آپ کو ہو سکتی ہے کہ سرشتہ تعلیم کو جہاں کہیں اُس میں ترقی پندیدہ اور ممکن معلوم ہو وہاں دست دی جاوے اور اس کی ترقی کی جاوے اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ عنایت حضور دائسراے کی خدمت میں ایک اور عرض داشت اس معاملے میں تحریر

کریں جس میں عمل میں لائے جانے کے قابل ایسی تدبیر کی نسبت مفصل رائیں مندرج ہوں جس سے رعایا کو تعلیم کے فائدے دیسی تعلیم کی صورت میں عموماً پہنچائے جانے ممکن ہوں۔

(دستخط) آپ کا نہایت صادق دوست

جی ڈی گارڈن پرائیویٹ سکرٹری

## جواب عرض داشت من جانب حکومت ہند مع انتخاب مراسلہ کورٹ ڈائریکٹرز

(منقول از اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۱۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء)

۱۱۔ اب ہم کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ ہمارے مقصد کی تکمیل کس طرح پر ہو سکتی ہو اور اس سے ہم کو اُس درجہ کے بحث پر توجہ ہوتی ہو جس سے ہندوستان کے لوگوں کو علم کی تعلیم کی جاوے اب تک ہندوستان کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہونے سے یا دیسی ہی اصل کتابوں کے نہ ہونے سے اور مشرقی املا درجے کی زبانوں میں یورپ کے علم کی نہایت ناقص کتابوں کے ہونے سے اُن لوگوں کے واسطے جو عمدہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اب تک اس بات کی ضرورت ہو کہ انگریزی زبان کو یورپ کے علم کی گنجی سمجھ کر اول اول اسی کی تحصیل سے شروع کریں اور انگریزی کا علم ہمیشہ ہندوستان کے اُن باشندوں کے واسطے جو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں ضرور ہوگا۔

۱۲۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں خصوصاً صدر مقاموں کے قرب وجوار میں جہاں کہ انگریزی کا علم رکھنے والوں کو بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں کے لیے اور لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہو وہ لوگ جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں انگریزی کے واسطے درجے کی استعداد کو اپنے عام علم کی ترقی کا ضروری سلسلہ نہیں بلکہ اپنی تعلیم کا مقصد اور مالی کار سبھتے ہیں ہم بہت سی باتوں میں صرف انگریزی بولنے اور لکھنے کی لیاقت کے فائدے سے منکر نہیں ہیں لیکن ہم کو خوف ہو کہ ان اصلاخ میں کچھ ایسا ڈھنگ پڑ گیا ہو کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کی جانب سے بے جا غفلت کی جاتی ہو۔

۱۳۔ ہمارا یہ ارادہ یا خواہش نہیں کہ ملک کی دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کو قائم کریں۔ ہم ہمیشہ سے یہ بات جانتے ہیں کہ جن زبانوں کو صرف جمہورِ اہم کے بہت سے فرقے سمجھ سکتے ہیں انھی کا رواج نہایت ضرور اور مفید ہو ہم نے ہی زبانیں نہ انگریزی زبان بجائے فارسی کے دادرسانی کے محکموں اور گورنمنٹ کے افسروں اور لوگوں کے درمیان میں معاملات کے واسطے قائم کی ہو پس یہ ضرور ہو کہ تعلیم کے کسی عام انتظام میں ان کی تحصیل پر بڑی توجہ کی جاوے اور یورپ کے ترقی یافتہ علم کی کوئی واقفیت جو جمہورِ اہم کے ان بہت سے فرقوں کو سکھایا جاوے جو اپنی حالتوں کے باعث سے ایک اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے سے معذور ہیں اور جن کی ذات سے یہ توقع نہیں ہو سکتی ہو کہ وہ ایک غیر زبان کی مشکلوں پر غالب آویں گے ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے ان کو حاصل ہو سکتی ہو ۱۴۔ تعلیم کے کسی عام سررشتہ میں انگریزی زبان ان مقاموں میں سکھانی چاہیے جہاں اس کی خواہش ہو لیکن انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ ہمیشہ ضلع کی دیسی زبان کی تحصیل پر بڑی توجہ اور ایسی عام تعلیم و تلقین ہونی چاہیے جو اس زبان کے ذریعے سے ہو سکتی ہو اور جس صورت میں کہ انگریزی زبان کا استعمال بطور ایک نہایت کامل ذریعے کے واسطے تعلیم ان شخصوں کے جاری رہے جن کو اس سے اس قدر واقفیت حاصل ہو گئی ہو کہ وہ اس کے ذریعے سے عام تعلیم و تلقین حاصل کر سکتے ہیں تو ان بہت سے فرقوں کے سکھانے کے واسطے جو انگریزی زبان سے بالکل ناواقف ہیں یا کم واقف ہیں دیسی زبانوں کو استعمال کرنا چاہیے اس کا انجام ایسے ماسٹروں اور پروفیسروں کی معرفت بخوبی تمام ہو سکتا ہو جو خود انگریزی دان اور جو ترقیاں حال میں ہر ایک قسم کے علم میں ہوئی ہیں ان سے بخوبی واقف ہو کر اپنے ہم وطنوں کو اپنے وطن کی زبان کے ذریعے سے وہ علم سکھلا سکتے ہیں جو انھوں نے بذریعے انگریزی کے حاصل کیا ہو اسی کے ساتھ میں اور جس قدر کہ روز بروز دیسی زبان کی قدر کو لوگ پہچانتے جاویں ہندوستان کی دیسی زبان کا علم انگریزی کتابوں کے ترجمے یا ان شخصوں کی اصلی تصنیفات کے ذریعے سے جن کے دل میں یورپ کی شائستگی کی بڑی ساگمی ہو رفتہ رفتہ مالا مال ہو جاوے گا اور اس طرح پر تمام فرقے رفتہ رفتہ یورپ کے علم کو حاصل کر سکیں گے۔ پس ہم انگریزی زبان اور نیز ہندوستان کی دیسی زبانوں کو ذریعہ اشاعتِ علم

یورپ کا سمجھتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہو کہ جو مدرسے ایسے اعلیٰ درجے کے ہندوستان میں ہوں جن میں ایک ایسا مدرسہ رہ سکتا ہو جس میں تمام ضروری یا قتیوں موجود ہوں ان سب میں انگریزی اور دیسی لغز کہ دونوں زبانوں کی تحصیل ہو دے۔

## مراسلہ من جانب برٹش انڈین ایسوسی ایشن

(منقول از اخبار 'سانٹی فلک سوسائٹی' علی گڑھ، مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۹۷ ع)

۱۔ مسٹر جے ڈی گارڈن صاحب پریوٹ سکریٹری حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند کی چٹھی مورخہ ۱۲ اگست سنہ ۱۸۹۷ ع اور آپ کی چٹھی صیغہ ہوم ڈیپارٹمنٹ نمبر ۲۲۱۷ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۹۷ ع اس ایسوسی ایشن کے ممبروں کے سامنے پیش ہوئی اور اُس کے ممبروں نے خود اور نیز بہ شرکتِ ممبرانِ سانٹی فلک سوسائٹی کے نہایت غور و فکر سے اُس پر لحاظ کیا۔

۲۔ ہر قدر غور اور توجہ واجب حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے بہ اجلاسِ کونسل ایسوسی ایشن کی عرضداشت پر جو دربابِ تربیتی تعلیم اہل ہند تھی فرمائی ہو اُس کی بابت دونوں سوسائٹیل کے ممبر نہایت عاجزی اور ادب سے اپنے ولی شکر اور ولی احسان مندی پیش کرتے ہیں اور نہایت ادب اور عاجزی سے بہ اتباعِ اُس تجویز کے جو آپ کی چٹھی کی دفعہ ۲۲م میں مندرج ہو اُن علی تدبیروں کے پیش کرنے کی اہانت لیتے ہیں جو دونوں سوسائٹیوں کے ممبروں کی رائے میں اُس امر اہم کے انجام پانے کے لیے ہر دست ہوئی ضروری ہیں اور وہ امید رکھتے ہیں کہ وہ تدبیریں حضور وائسرائے اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند بہ اجلاسِ کونسل کی غور اور توجہ کے قابل ہوں گی۔

۳۔ جس وقت کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ممبروں نے اس درخواست کا پیش کرنا گورنمنٹ میں تجویز کیا تھا اس وقت وہ مشکلات جو اُس تدبیر کے انجام میں تھیں اُن کے پیش نظر تھیں اور وہ اُن سے بخوبی واقفیت تھے جن کا ذکر حاشیہ پر \* مندرج ہو مگر اُن کو اس بات میں شبہ تھا کہ آیا وہ اصول

عام تعلیم کا یہ ذریعہ درنیکر زبان کے جس کی ایسوسی ایشن تائید کرتی ہو گورنمنٹ کو تسلیم اور منظور ہو یا نہیں اور اسی سبب سے اس عرض داشت میں صرف ان اصولوں کی بھی صحیح اور مستحکم ہونے پر گفتگو کی گئی تھی اور اس کی عملی تدبیر کا بیان کرنا آئندہ موقع پر منحصر رکھا تھا اب کہ ایسوسی ایشن کو یہ بات حسب اطمینان دریافت ہوئی ہو کہ گورنمنٹ کی تدبیریں در باب ترقی عام تعلیم کے اس کی تدبیروں سے متفق ہیں تو اس نے عام رعایا کی ترقی تربیت کی طرف گورنمنٹ کی فیاضی سے متوجہ ہونے پر بھروسہ کر کر اس کی عملی تدبیر کو پیش کرنا ضروری سمجھا ہو ۴۔ یہ بات مسلم ہو کہ ایک ناقص تربیت جس قدر کہ ایک قوم کی اصلی غرضوں اور فائدوں کی غالباً ہارج اور مانع ہوتی ہو اسی قدر کامل تربیت بلاشبہ اس کے حق میں مفید ہوتی ہو اب کہ گورنمنٹ کی پیش گاہ سے یہ بات منظور اور پسند ہو چکی کہ دیسی زبان کے ذریعے سے تمام فرقوں کو عام تعلیم کرنا نہایت کھراہد اور موثر طریقہ ہو اور اس طریقے کے فائدے گورنمنٹ بخوبی تسلیم کر چکی ہو تو یہ عرض کرنا ضرور ہوا کہ وہ طریقہ کس طرح پر جاری ہو سکتا ہو۔

۵۔ سنہ ۱۸۵۴ء کے مراسلہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے دیکھنے سے جیسی ایسوسی ایشن کو خوشی ہوئی ہو ویسا ہی اس کو رنج ہوا ہو اور اس کو افسوس ہو کہ اگر ہندوستان کے شریف اور متمول لوگ متعدد ارادوں مندرجہ مراسلہ مذکور کی مدد پر متوجہ ہوتے تو آج تک کیا کچھ ترقی تربیت اور روشن ضمیری اہل ہند کی درنیکر کے ذریعے سے ہو جاتی مگر اب ایسوسی ایشن گورنمنٹ کو اس بات کا یقین دلانے کو واجب سمجھتی ہو کہ زمانہ گزشتہ کی کاہلی اور سستی دور ہوتی جاتی ہو۔ اب اکثر اہل ہند درنیکر کے ترقی دینے پر بہت متوق

(لغیہ صفحہ گزشتہ) (دوم) صرف انہی کتابوں کا درنیکر میں ترجمہ کافی نہ ہونا جو یونیورسٹی میں امتحان کے لیے مقرر کی جاتی ہیں بلکہ بالضرر ایک اور سلسلہ بڑے درجے کی اصل کتابوں کا درنیکر میں موجود ہونا۔

(سوم) ان تمام کتابوں کے درنیکر میں موجود اور شائع کرنے کی تدبیر اور اس کے اخراجات کیوں کہ ایسوسی ایشن بالیقین جانتی ہو کہ یہ غیر ممکن ہو اور اصول گورنمنٹ کے بھی خلاف ہو کہ ان اخراجات کا بالکلیہ بوجھ گورنمنٹ اپنے دستے لیرے۔ (چہارم) تدبیر اور طریقہ ان کتابوں کے رواج کا اس طرح پر کہ سرکاری مدرسوں اور اسکولوں اور نیز پرائیویٹ کتبوں کے دذ میں لائی جادیں۔

(پنجم) بہم پہنچانا ایسے ٹیچروں اور پرمیسروں کا جو ان کتابوں کی تعلیم کی لیاقت رکھتے ہیں۔



سے مستعد ہیں اور ایسے آدمی بھی کچھ کم نہیں ہیں جن کے نزدیک تمام ترقی تربیت اہل ہند کی صرف وزیکلر پر منحصر ہو اور اہل ہند میں عام ترقی تربیت و شایستگی اور یورپ کی روشن ضمیری بذریعے وزیکلر کے پھیلانے کی ضرورت کا اُن کے دل پر ایسا نقش ہو گیا ہو کہ وہ اپنے ارادوں کے پورا کرنے کے لیے اپنے وقت اور محنت اور رُپے کے بڑے بڑے نقصانوں کے گوارا کرنے پر مستعد اور آمادہ ہیں۔

۶۔ ایسوسی ایشن کا بھی یہ ارادہ نہیں ہو کہ کوئی تدبیر یا درخواست پیش کرنے میں گورنمنٹ کے حالات اور اُن عظیم الشان امور کے ضروری اخراجات پر جن کا بجا لانا گورنمنٹ کو تمام ہندوستان کی امن و آسائش کے لیے ضرور ہوتا ہو خیال نہ کر کر خود غرضانہ کوئی درخواست یا تدبیر پیش کرے پس ایسوسی ایشن نہایت سچے دل سے اس بات کا اقرار کرتی ہو کہ جو کچھ سکریٹری آف اٹلیٹ نے اپنے مراسلے سنہ ۱۸۹۱ء میں لکھا ہو وہ صرف منصفانہ اور بالکل سچ ہو اور بلاشبہ کوئی گورنمنٹ عمدہ تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمے نہیں لے سکتی بلاشبہ اگر ملک کے دولت مند اور ذی علم لوگ اپنا زہر اور اپنا وقت اور اپنا رعب و اب تعلیم کے محل میں کام میں نہ لادیں تو کوئی گورنمنٹ کامیابی کی توقع کر کر تعلیم کا بوجھ بالکل اپنے ذمے نہیں لے سکتی اس لیے ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنمنٹ کو اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ اُس کا یہ مقصد نہیں ہو کہ عام تعلیم کے لیے کوئی خرچ زائد بہ جز اُس کے جو خود گورنمنٹ بہ لحاظ اپنے مالی حالت کے مناسب سمجھے گورنمنٹ پر ڈالنا چاہیے۔

۷۔ جو مشکلات اس تدبیر کے عمل درآمد ہونے میں ہیں اور جن کا بیان اوپر ہوا ان میں سے چوتھی اور پانچویں شکل کچھ زیادہ فکر اور تردد کرنے کے لائق نہیں ہو البتہ پہلی تین باتیں زیادہ فکر و اندیشے کے لائق اور علی ہیں مگر ایسوسی ایشن اور سائنٹی فک سوسائٹی کے ممبر بالاتفاق ان کے رفع کرنے کا بار اپنے ذمے لینے کو مستعد ہیں اور اس بات کو وہ اپنے قابو سے باہر نہیں سمجھتے بشرطہ کہ گورنمنٹ ان کی دل دہی اور تشفی کرے اور ہمت بڑھاوے۔

۸۔ لیکن یہ بات ضرور ہو کہ ایسوسی ایشن اور سائنٹی فک سوسائٹی کے ممبر بدو ایک معین مقصد جس کی حد معلوم ہو ہونا چاہیے کیوں کہ جب تک ایک صریح اور معین نتیجے کی امید نہیں ہوتی ہو تو جو محنت اس کے لیے کی جاتی ہو اس کے رائیگاں جانے کا اندیشہ ہوتا ہو اور جو لوگ اس پر سرگرمی سے کوشش کرتے ہیں اُن

کی ہمت ٹوٹ جاتی ہو اسی وجہ سے ایسوسی ایشن کے ممبر گورنمنٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گورنمنٹ سے بجز اس کے اور کچھ نہیں چاہتے کہ اپنی واجبی عملی تدبیروں سے ہماری سچی ادنیٰ کنکشنوں کی تقویت کرتی ہے اور ہماری پشت پناہ ہو۔

۹۔ ایسوسی ایشن پچھلے دل سے اس بات کی تصدیق کرتی ہو کہ صرف اُن کتابوں کا ترجمہ جو یونیورسٹی خاص کر ہندستانی طالب علموں کے لیے مقرر کرتی ہو اس قدر کافی نہ ہوگا جس سے تدبیرات مجوزہ کے جاری کرنے کی ہمت پڑے کیوں کہ اُس سے صرف طبیعت کو مستعد اور تیار کرنا مقصود ہوتا ہے اور یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں قدم رکھنے کو اور بہت سے عام مضمونوں کی کتابوں کا ترجمہ ہونا ضرور و لابد ہے مگر ایسوسی ایشن سمجھتی ہو کہ ان دونوں سلسلوں کی کتابیں گو وہ کیسی ہی نامحدود ہوں از روئے عمل کے اُن کی تعداد ایک حد پر محدود ہونی ضرور ہے۔

۱۰۔ اس لیے ایسوسی ایشن اس بات کی درخواست کرتی ہو کہ گورنمنٹ حکام مناسب کے ذریعے سے یونیورسٹی کے ہر ایک درجہ امتحان کے لیے حوصلے کتابوں کے قائم کردے ایک وہ سلسلہ جو خاص کر یونیورسٹی کے متعدد درجوں کے درس کے واسطے ہو اور دوسرا وہ سلسلہ جو یونیورسٹی کی خواندگی پوری کرنے کے بعد علم کے دائرے کے فوارخ کرنے کے واسطے ضروری ہو سائنسی فکر سوسائٹی کے ممبر اس بات پر آمادہ ہیں کہ اب جس قدر خرچ گورنمنٹ عام تعلیم کے معاملے میں بہم پہنچاتی ہو اُس پر اُن دونوں سلسلوں کی کتابوں کو درنیکر میں ترجمہ کر کر اور چھاپ کر تیار و موجود کر دے گی اور یہ بات بالکل گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر رہے گی کہ جس قدر رُپیہ گورنمنٹ ہر سال درنیکر تعلیم کی ترقی کے لیے منظور کرتی ہو اُس میں سے جس قدر چاہے اس کام کی مددگاری میں خواہ بہ ذریعے خرید کتب خواہ اور کسی طرح پر محنت کرے چاہے نہ کرے اس بات کا جتنا کچھ ضرور نہیں ہو کہ گورنمنٹ کی تحریک سے اور گورنمنٹ کی طرف سے عمدہ تجویزوں کے جاری ہونے سے ایسی محنتوں کا ثمرہ کس قدر زیادہ ہو جاوے گا۔

۱۱۔ گورنمنٹ کی عملی تدبیروں سے جو ایسوسی ایشن کے ممبر اپنی تقویت بڑھانے کی درخواست کرتے ہیں اُس سے اُن کا مقصد یہ ہو کہ بعد اس کے کہ یونیورسٹی کے ہر ایک درجہ امتحان کے دونوں سلسلوں مذکورہ بالا کی کتابیں معین ہو جاویں اور تیار ہو جاویں تو گورنمنٹ ان کو اپنے مدرسوں اور کالجوں میں ترتیب دار خواندگی کے طور پر جاری کرنا منظور کرے اور اس طرح سے دیسی زبان کے ذریعے سے تمام فرقوں پر یونیورسٹی کے

امتحان کا ذریعہ کنول دیوسے اور علاوہ اس کے جس قدر کتابیں ترجمہ ہوتی جادیں اُن سے اس خواندگی کے سلسلے کو وسعت دیتی رہے۔ ایسی علی تحریک سے اُن سخت محنتوں میں ایک لذت اور تقویت حاصل ہوگی جو سوسائٹی اپنے ذمے پر گوارا کرنے پر آمادہ ہو۔

۱۲۔ اگر گورنمنٹ ایسوسی ایشن کی اس درخواست کو منظور کرے تو ایسوسی ایشن اس بات پر آمادہ ہو کہ اُن دونوں سلسلوں کی کتابوں کی فہرستیں جو بذریعہ دیسی زبان کے یونیورسٹی کے امتحان کے لیے تجویز کی جادیں گورنمنٹ میں منظوری کے لیے پیش کرے اور جو کتابیں دریکٹر کی گریمر اور عروض اور لاجک وغیرہ کی بھی جو انگریزی کتابوں کے ترجمے سے پیدا نہیں ہو سکتیں ہندوستانی اہل علم کی تصنیف کی ہوئی گورنمنٹ کی منظوری کے لیے پیش کرے جب کہ یہ کتابیں پسند اور منظور ہو جادیں گی تو اُن کو یونیورسٹی کی خواندگی میں داخل کیا جاوے گا۔ جس سے دیسی زبان کے طالب علم یونیورسٹی کے اعزاز حاصل کرنے میں غبطہ کریں گے۔

۱۳۔ علاوہ اس کے شاید تھوڑی سی عملی تائید گورنمنٹ سے اور درکار ہوگی جو علاقہ رکھتی ہو تشریح مطالب اکیٹ ۲۰ سنہ ۱۸۶۷ء سے اگر حقیقت اُس کی تشریح یا ترمیم کی ضرورت ہو چناں چہ اس باب میں ایسوسی ایشن نے جداگانہ اپنی عرض داشت گورنمنٹ کی خدمت میں روانہ کی ہو۔

انجام کو ایسوسی ایشن کی درخواست یہ ہو کہ آپ اس چٹھی کو حضور وائسرائے و نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند بہ اجلاس کونسل کے حضور میں مہربانی سے پیش کر کر جو احکام کہ اس پر نافذ ہوں گے اس سے اطلاع بخشیں گے۔

## مراسلہ ایم کیپسن صاحب ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم

(منقول از اخبار سائنٹیٹک سوسائٹی، علی گڑھ، مورخہ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء)

صاحب ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب نے جو چٹھی بنارس انسٹیٹیوٹ کے سکریٹری کے نام لکھی ہو اور جس کا ترجمہ ذیل میں مندرج ہو اس کا مضمون دریافت ہونے سے ہم کو نہایت خوشی ہوئی ہو کہ جو ججوز علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے درباب مقرر ہونے ایک دیسی زبانوں کی یونیورسٹی کے

گورنمنٹ ہند میں پیش کی تھی آخر کار اس پر لحاظ کیا گیا

ناظرین اخبار یہ بھی ملاحظہ فرمائیے گے کہ ممبران بنارس انسٹی ٹیوٹ سے صرف نسبت فوائد قائم ہونے ایسی یونیورسٹی کے جس کی تحریک ہماری ایسوسی ایشن نے کی تھی نہیں پوچھا گیا ہو بلکہ ان اصولوں کی نسبت بھی رائے چاہی گئی ہو جن پر مذکورہ بالا یونیورسٹی قائم ہو۔

بلاشبہ یہ مضمون ہمارے بھی نہایت مفید ہو کچھ شبہ نہیں کہ اگر اُس کا عمل درآمد ہوتا تو ہندستان کے لیے حد سے زیادہ مفید ہوگا پس ہم کو امید صادق اور یقینِ دانش ہو کہ ممبران بنارس انسٹی ٹیوٹ نہایت باعزت راست بازی اور بڑی سچائی اور بے ریائی سے بلا کسی خوف و خطر کے اور بغیر دباؤ کسی عہدہ دار سرشتہ تعلیم کے اپنی اپنی رائے ظاہر کریں گے ورنہ ان کی رائے آزادانہ اور لوگوں کے دلوں کی خواہش بتانے والی تصور نہ ہوگی۔

صاحب ڈائریکٹر کی چٹھی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ممدوح علامہ بنارس انسٹی ٹیوٹ کی رائے کے اور بھی رائیں اس نہایت مفید مضمون پر اس غرض سے جمع فرما رہے ہیں کہ اُن سب کو معہ اپنی تجویز کے گورنمنٹ میں پیش فرمائیے گے ہم کو یقینی امید ہے کہ اور جناب صاحب ڈائریکٹر بہادر کی مہربانی پر بخوبی بھروسہ ہے کہ ایک نقل اُن رایوں کی جو صاحب ممدوح پاس جمع ہوں معہ اپنی تجویزوں کے اذراہ عنایت علی گڑھ ایسوسی ایشن کو بھی مرحمت فرمائیے گے تاکہ وہ ایسوسی ایشن بھی اُس پر اپنی رائے ظاہر کر سکے۔ ۶

برکریاں کارہا دشوار نیست

چٹھی ایم کیمپسن صاحب بہادر ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی

بدنام صاحب سکریٹری بنارس انسٹی ٹیوٹ مقام بنارس مورخہ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۹۷ء

صاحب من -

بالفعل گورنمنٹ ان اضلاع میں دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے کے مسئلے پر بموجب اس تجویز علی گڑھ سوسائٹی کے کہ ایک یونیورسٹی دیسی زبانوں کی ان اضلاع میں قائم کی جاوے اور اس میں انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھائی جاوے نہ یہ کہ عام تعلیم کا ذریعہ گردانی جاوے غور کر رہی ہے مجھ کو

معلوم ہوتا ہے کہ بنارس انسٹی ٹیوٹ میں اس مضمون پر بحث کا ہونا مفید ہوگا اور میں انسٹی ٹیوٹ کی رایوں کو گورنٹ میں پیش کیا چاہتا ہوں اس لیے میں اس عام مضمون کو بطور ایسے مضمون کے پیش کرتا ہوں کہ اس پر تم اپنے انسٹی ٹیوٹ میں جتنی جلد ممکن ہو گفتگو کرو اس مضمون میں متعدد باتیں غور طلب ہیں مثلاً اول اگر عام تعلیم اس ملک کی دیسی زبان کے ذریعے سے ہو تو حال کے طریقہ تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔ دوسرے اگر یونیورسٹی قائم کی جادے تو عموماً اختتام اس کا رکن اصولوں پر ہونا چاہیے تیسرے کس مقام پر یہ یونیورسٹی مقرر ہونی چاہیے چوتھے اس یونیورسٹی کو کون کون سی ڈگری یعنی صوبہ اور خطاب لوگوں کو دینے کے مستحق اور لائق سمجھنا چاہیے پانچویں بہترین وسیلے کتابوں کے (یعنی ترجموں کے) ہم پہنچانے کے جو مطلوب ہوں گے وہ کیا ہوں گے تم کو مضمون مذکور کے ان بڑے مراتب سے ہر ایک سوال مذکور کی نسبت اظہار رائے اور بحث کے لیے بڑی گنجائش حاصل ہوگی۔ میں بھی رائیں جمع کر رہا ہوں اور انسٹی ٹیوٹ کے ممبروں کی رائے کے دریافت کرنے سے بھی خوش ہوں گا۔

ان سب رایوں میں میں بھی ایک رائے اپنی شامل کروں گا جو یوں قیاس کی جاسکتی ہے کہ اگر یونیورسٹی ان اضلاع میں قائم کی جادے تو وہ یونیورسٹی اضلاع ممالک مغربی و شمالی و اودھ و پنجاب سب کے لیے قرار پانی چاہیے اور میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ جہاں یونیورسٹی قائم ہووے وہیں طالب علموں کی سکونت بھی ہوگی یعنی جو شخص تعلیم یونیورسٹی سے مستفید ہونا چاہیں وہ یونیورسٹی کے مقام میں جا کر تعلیم حاصل کیا کریں گے۔

## مراسلہ وزیر ہند

بہ نام دیسراے دگورنر جنرل ہند

مقام لندن دفتر ہند ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۹۸ء نمبری ۵

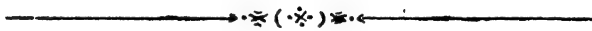
مصلح من

آپ کا مراسلہ بہ اجلاس کونسل نمبری ۱۴ مورخہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۹۷ء معہ اور مراسلات کے بدایں مضمون پہنچا

کہ ہندوستانیوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے ویسی زبانیں ذریعہ گردانی جاویں۔ اُس پر میں نے معہ ارباب کونسل کے بغیر ہی غور کیا۔

مراسلات مذکور کو میں نے ایسے شوق و ذوق سے پڑھا جیسے کہ اُن کے عالی مضامین مستعدی تھے۔ جو رائیں بہ اجلاس کونسل آپ نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے باب میں ظاہر کی ہیں اُن کو پسند کرتا ہوں معلوم ایسا ہوتا ہو کہ آپ کی گورنمنٹ اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن ویسی زبان کا ایسا علم قائم کرنے کے واسطے جو ہندوستانیوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم پر حاوی ہو صرف عمدہ عمدہ انگریزی کتابوں کے ترجمے کو ذریعہ اختیار یا چاہتی ہو پس آغاز حال میں یہ تدبیر معقول ہو مگر میں ایک یہ رائے ظاہر کرتا ہوں جس پر آپ بھی بہ اجلاس و کونسل غور کریں کہ ویسی زبان میں انگریزی اخلاق کی کتابوں میں سے کسی خاص معنون پر کتابوں کی تالیف کرنے کی رغبت اور جرأت دلانی چاہیے یہ تدبیر جیسے کہ طلباء کے حق میں مفید ہو ویسے ہی معلموں کو فائدہ بخش ہو اور جب اس کی ترقی ہوگی تو مولعوں کو ایک بڑی بات یہ حاصل ہو جاوے گی کہ ایک معترف کے بیان کو دوسرے معترف کے بیان سے مطابق کرنے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے اور پسند کرنے کی جہت سے اُن کی طبیعتیں اس امر کی عادی ہو جاویں گی کہ ہر قسم کے خیالات بغیر ویسے اور امداد کے پیدا کر سکیں اس تدبیر سے یہ امید ہو کہ ترجمے اور تالیف کی مشق سے دانا اور تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ہم وطنوں کے لیے انجام کار کتابیں تصنیف کریں گے۔

آپ کا خادم  
اسٹی فورڈ نارتھ کوٹ



## اُردو، ہندوستانی، ہندی

(ایک علمی مقالہ جو جناب پنڈت دتاتریہ صاحب کتفی نے اُردو کانفرنس ناگ پور میں پڑھا)

— (بیڑ) —

یہ جنگِ اعظم اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہے۔ جن کو ہماری نسبت جنگ کے زیادہ صحیح اور اصلی واقعات و کوائف کی خبریں ان کا قیاس ہے کہ اس سال میں یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ کیا اچھا ہو کہ جلد سے جلد خاتمے کو پہنچے۔ ہوگا وہی جو خدا کو منظور ہے۔ مگر انسان نے آخرینی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ یعنی معاشرت کے مختلف شعبوں، اقتصادیات، تعلیم وغیرہ یہاں تک کہ شہروں اور قصبوں کی نوعیاری سے متعلق ابھی سے تگدے بن رہے ہیں کہ جنگ کے بعد فلاں ادارے کی نئی ترتیب کس ڈھنگ پر ہوگی۔ ان تجربوں کی بنا پر جو اس جنگ سے حاصل ہوئے ہیں قوم کے بچوں کی تعلیم کس طرز کی ہوگی، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبے اور ادارے کی تجدید یا نوعیاری اور اصلاح کا پروگرام ابھی سے بننا شروع ہو گیا ہے۔ ہندوستان بھی اس لائحہ عمل سے خارج نہیں ہے۔ آپ نے سنا ہی ہوگا جو پروگرام حکومتِ ہند کے تعلیمی کمشنر نے جنگ کے بعد کی تعلیم سے متعلق تیار کیا ہے جو آپ کے بچوں کو دی جائے گی، اور شعبوں کی تجدید کے بارے میں بھی حکومت سوچ رہی ہے۔ ری کنٹرکشن کمیٹیاں یعنی تجدیدی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں۔ یہ تو ہوا حکومت کا کام۔ مگر آپ کو بھی کچھ کرنا ہے، ہر کام حکومت ہی کے ذمے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ پچھلی صدی کے اعلیٰ مفکر ہربرٹ سپنسر نے اپنی ایک کتاب ’ان الفاظ سے شروع کی تھی :-

”گاؤ کے شراب خانے میں پائپ کے دھنوں کے ہناروں میں ایک مزدور بہت خود اعتمادی کے ساتھ کہتا ہے کہ ہاؤ اور منہ کی بیماریوں کے لیے پارینٹ نے کیا کیا؟“  
 فلسفی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جو کام خود ان کے کرنے کے ہیں وہ بھی حکومت ہی کرے۔

میرے اہل وطن یہ سن کر کہیں گے، تو بتائیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں ابھی اس موضوع پر آتا ہوں۔

میرا خطاب صرف ان مضرات سے نہیں جو اس وقت اس جگہ تشریف رکھتے ہیں بلکہ تمام ہم وطنوں سے ہے۔ ان کا دھرم اور ملت چاہے کچھ ہو اور اپنے گھروں میں وہ چاہے کوئی زبان بولتے ہوں۔ مجھے بو کہنا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ میری درخواست صرف ایک پرانی رسم کو تازہ کرنے سے متعلق ہے۔ اور یہ وہ کام ہے جو خود ہمارے کرنے کا ہے۔

• رزلی ایک انگریزی سیاسی مستف نے لکھا تھا کہ انسانوں کی کوئی جماعت ایک قوم نہیں کہی جاسکتی جب تک اس میں سہ گانہ اتحاد عامل نہ ہو، یعنی مذہبی اتحاد، سیاسی اغراض کا اتحاد اور لسانی یعنی زبان کا اتحاد۔

اس سہ گانہ اتحادی اصول کے تحت جب ہم وطن مالوت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نظر بالکل بائیں نہیں پڑتی، ہندو اور مسلمان مع اپنے شکمی فرقوں اور ملتوں کے صدیوں سے یہاں رہتے ہیں اور رہ رہے ہیں، نہ ایک دوسرے کو مضمر کر گئے نہ ایک دوسرے کو اپنے میں جذب کر لینے پر ضد کرتا ہے۔ ایک شق تو اس مگدّم کی صاف ہو گئی۔ دوسری شق ہے سیاسی اغراض، اس میں تمام ہندستانی متحد ہیں یعنی آزادی اور حریت کے طالب ہیں۔ کرسپس کی تجاویز کا جو حشر ہوا اس اتحاد اغراض کا بین ثبوت ہے۔ اس سے مطلب نہیں کہ جو بواب کرسپس کو یک زبان ہو کر ہندستان نے دیا وہ صحیح اور مناسب تھا یا نہیں۔ اب صرف ایک شق رہی جاتی ہے یعنی لسانی اتحاد، یہ سب سے زیادہ تفصیل طلب ہے در اسی کو اس صحبت کے لیے میرا موضوع سمجھیے۔



گریسن نے تازہ ترین تحقیقات کے بموجب ان زبانوں اور بولیوں کی تعداد جو ہندوستان میں کم و بیش مروج ہیں، دو سو بیس قرار دی ہو۔ اگر ان دو سو بیس زبانوں اور بولیوں کی فہرست ہی پیش کی جائے تو ایک طویل اہل ہوگا۔ خیر یہ تعداد سن کر آپ سرسری طور پر یہ تو کہہ اٹھیں گے کہ اگر لسانی اتحاد قومی ساخت کے لیے لازمی ہو تو ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔ باقی دو اتحاد کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اردو ہندی کا تنازع اپنی جتنی جسامت میں آپ کے سامنے آکھڑا ہوگا۔ میں کہوں گا کہ نہ تو ہمیں مایوس ہونے کا موقع ہو اور نہ اُس جتنی جسامت سے ڈرنے کی ضرورت ہو۔ اردو اور ہندی میں کل تک اتحاد تھا اور اب بھی ہو سکتا ہو۔ اسی بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ان دونوں زبانوں سے متعلق چند لسانیاتی کوائف کا موازنہ کرنا ہو اور اسی لیے موضوع رکھا گیا ہو، اردو، ہندوستانی، ہندی۔ کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو یورپ اور ہندوستان کے عالموں یعنی ہندو مستشرقوں کے اقوال سے استدلال کیا جائے۔

لسانیاتی کوائف ہم کو قدیم زمانے میں لے جائیں گے۔ مجھے امید ہو کہ آپ اس تذکرے کو غور اور توجہ سے سنیں گے۔ میرے لیے تو یہ موضوع نہایت دل چسپ ہو۔ بہر حال اس بارے میں جو کچھ عرض کیا جائے گا غمد کے قابل ہو۔

معلوم ایسا ہوتا ہو کہ اس ملک میں زبانوں کی گڑبڑ ابتدا سے رہی ہو۔ تحقیق سے پتا چلتا ہو کہ آریہ لوگ ہند قدیم میں ایک ہی وقت میں آکر پنجاب کے میدانوں میں نہیں بس گئے تھے۔ وہ راستے میں ٹھہرتے ہوئے آئے تھے اور وہ ٹھہرنا کبھی صدیوں تک لمبا ہو جاتا تھا۔ غرض کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف ٹولیوں میں یہاں آئے چون کہ وہ اپنے خُرج سے چل کر مختلف ملکوں میں ٹھہر ٹھہر کر آئے تھے ان کی بولیاں بھی مختلف ہو گئی تھیں۔ اس لسانی اختلاف کو سب مانتے ہیں، لکھا ہو :-

”کچھ ٹولیاں پہلے کئی بار میں آئیں اور کچھ اُن کے کچھ سمہ کے اُپرانت۔ ان سب ٹولیوں کی بولیوں میں انزاد شیک تھا۔۔۔۔۔ پہلے آنے والی ٹولیوں کی بولی الگ تھی اور پیچھے

آنے والی ٹولیوں کی الگ سیلہ

رگ دید جو کتابوں میں سب سے چرائی کتاب مانی جاتی ہو اس کے متروک کی زبان بھی ایک نہیں بتایا ہو :- ”دھیان دینے سے متروک کی بھاشا میں وبھید دیکھ پڑتا ہو“

ٹولیوں کی جن کا آگے ذکر آیا ہو، بولیاں وہی تھیں جنہیں پراکرت کہتے ہیں۔ انہی پراکرتوں کو صاف اور منظم کر کے سنسکرت بنائی گئی۔ پانینی، پانجلی اور کاتیاہن وغیرہ حضرات سنسکرت کے مدون اور اس کے چلانے والے ہیں لیکن عام بولی کی حیثیت سنسکرت کو حاصل نہیں ہوئی۔ کہا گیا ہو :- ”اب آریوں کی سنسکرت بھاشا کیوں ساہتیہ کی بھاشا ہو گئی“

یہ تاریخی واقعہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے بلکہ بعثت سے بہت پہلے ہندوستان کی زبانوں یعنی پراکرتوں میں فارسی کے لفظ شامل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ بنی اس تنقیح کو یہیں صاف کیے دیتا ہوں۔ حکومت ہند کے آرکیولوجیکل سروس آف انڈیا نمبر ۳۴، مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۹۳ سے معلوم ہوتا ہو کہ بلوچستان کے شمال میں ایک سنگین کتبہ کھروٹھی میں لکھا ہوا ہلا۔ اسے ٹورڈھیری کا کتبہ کہتے ہیں اس میں فارسی لفظ موجود ہو۔ یہ تو ہوئی ظہور اسلام سے بہت پہلے کی بات۔ کتابوں کا جہاں تک تعلق ہو پراکرت یعنی شورسینی پراکرت کی سب سے پرائی کتاب جو ملتی ہو وہ ہر ہاراجا پرتھی راج کے دربار کے شاعر چند برداسے کا پرتھی راج راسو۔ اس میں بے شمار فارسی اور عربی کے لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔

بس سمجھیے کہ اردو کی ابتدا ہو گئی۔ اور وہ ٹورڈھیری کے کتبے کی بنا پر مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پیش تر ہی ہو چکی تھی۔

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا منشا اس مقالے میں اردو ہندی کا جھگڑا اٹھانا ہرگز نہیں، بلکہ یہ ہو کہ تاریخ کی سند سے اور ان کی تحقیقات کی سند سے جو اردو والے نہیں کہے جاسکتے اردو اور دوسری خاص زبانوں کے لسانیاتی کوائف ملک کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ غلط فہمیاں دور

ہو جائیں جو شکلیں پیدا کر رہی ہیں۔

پہلے اُردو کے ناموں کو سمجھ لیا جائے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں :- دہلوی، زبانِ ہندوستان، ہندوی، ریختہ، ہندی، اُردو اور ہندوستانی۔ یہاں صرف آخر کے تین ناموں سے بحث کی جائے گی یعنی اُردو، ہندی اور ہندوستانی۔ اُردو کا نام ہندوستانی فورٹ ولیم کالج نے ڈالا۔ اب تک انگریز اور ایٹلو انڈین اُردو کو ہندوستانی کہے جاتے ہیں۔ میرا تن باغ دہبار کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

”اب خداوندِ نعمت جانِ گلکمرٹ صاحب نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔“

یہ ہندوستانی کا لفظ میرا تن نے اپنے کلمتہ کے خداوندانِ نعمت سے سیکھا چناں چہ ڈاکٹر ڈکن فاربن اسی کتاب باغ دہبار کی نسبت لکھتے ہیں :-

“Bagh-o- Bahar consisting of entertaining tales in Hindustani by Mir Amman of Delhi.”

اس ہندوستانی کے بارے میں ایک بات اور ذکر کے قابل ہو، ممبئی کے اسٹریٹ ڈیکلی مورخ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء میں ایک اشتہار پلین انٹی ٹیوٹ کا لکھا ہو۔ اس کے صرف دو چار لفظ یہاں نقل کیے جائیں گے۔ لکھا ہو :-

“No more bother about learning Hindustani (Urdu)”

کوئی لاکھ بین میکھ نکالے اور ’ایجادِ بندہ‘ سے کام لے مگر مستند بات یہ ہو کہ ہندوستانی نام ہو اُردو ہی کا۔

انساکلو پیڈیا برٹینیکا نے اس بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیا ہو، ملاحظہ ہو :-

“The name Hindustani given by Europeans to the Indo-Aryan dialect,

۱۔ تشریح کے لیے دیکھو میری کتاب کیفیہ ص ۳۳

whose home is in the upper Gangetic Doab and near the city of Delhi, which owing to political causes has become the Linguafranca of modern India. The name is not employed by Indians, except as an imitation of the English nomenclature."

ہندی سے متعلق ملاحظہ ہو۔ مولانا محمد قطب الدین دہلوی کی اُردو کتاب احکام العیدین جو ۱۳۰۵ھ کی تصنیف ہو، نول کشور پریس سے چھپتی ہو۔ اس کے دیباچے کی یہ عبارت غور کے قابل ہو :-  
" اگرچہ یہ شرح زبان ہندی میں کہ اہل علم اس کی طرف التفات نہیں کرتے ہیں بلکہ گئی ۔"

اب چند باتیں اُردو نام کے بارے میں کہی جائیں گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن نے اکثر بے پروائی کا سلوک کیا جاتا ہو۔ اُردو کے معنی بتائے جاتے ہیں لشکر، اور لشکر میں اُجڑ اور اکھڑ آدمی ہی تو ہوا کرتے ہیں، بہت حقارت سے کہا جاتا ہو کہ اُردو تو لشکری بولی ہو، اور لشکر جس میں یہ بولی جاتی تھی باہر کے آدمیوں پر مشتمل تھا، لہذا نہ یہ بھلے مانسوں کی بولی ہو اور نہ دیسی بولی ہو، ایک بدیسی چیز ہو۔ لفظ اُردو میں اصلی حرف آ، ر اور د ہیں۔ یہ تینوں حرف الف کی مختلف حرکتوں کے ساتھ اور غظوں میں بھی آتے ہیں، جیسے اُردی بہشت، اُردواں، اُردیل، اُردشیر وغیرہ، لفظ اُرد کے معنی ہیں مانند، جب اسی اُرد پر داؤ نسبتی بڑھایا تو اُردو بنا، اور معنی ہوئے مماثل اجزا سے مل کر بنی ہوئی چیز، اور یہ نام اس زبان کے لیے جو فارسی اور پراکرت دو آئین زبانوں کے میل سے بنی، بہت مناسب اور موزوں ہو۔

معلوم ہوا ہو کہ جب عربوں کی فتح کے بعد ایران کی زبان میں عربی لفظ آن علیے تو اس عربی آئینہ فارسی کو اُردو کہا گیا تھا۔ مرزا غالب ایک خط میں جو مولوی ضیاء الدین خاں قنیا کے نام ہو اور بُربان قانع کے قفسے کے متعلق ہو، لکھتے ہیں :-

" فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اُردو پیدا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سو بھی جو اکابر فریقین (ایرانی اور

عرب) موجدِ اردو زبان ہوئے تھے وہ تسمیہ قواعدِ فارسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔  
اب یہ واضح ہو گیا کہ اردو، ملی جلی زبان کو کہتے ہیں۔ ناموں کا ذکر ختم کیا جاتا ہو، ناموں کے بارے  
میں تو یہ کیفیت ہو کہ اردو گویا زبانِ حال سے کہ رہی ہو۔

نیا ہو لیجیے جب نام میرا

بہت دھنک ہو میری داستان میں

اب بہنِ اردو کی پیدائش سے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہو اردو شورشینی پراگرت بھاشا اور فارسی  
انہما سے مل کر بنی۔ اس فارسی میں بی نظیر پہلے سے شامل ہو چکے تھے۔ سنسکرت اس وقت ہندو  
عالموں کی ادبی زبان تھی مگر سنسکرت سے یا اسی طرح عربی سے براہِ راست اردو نے استعارہ نہیں  
لیا۔ پارہی پراگرت بھاشائیں یہ ہیں، شورشینی، ہمارا شوری، مالگھی اور اردو مالگھی۔ ان میں شورشینی  
کے میدان میں سب سے زیادہ تھا۔ اس کے عمل میں سارا پنجاب مع سرحدی صوبے کے لہذا سندھ  
جنوب بس کجرات کے شمال اور مشرق میں بہار یا گدھ دس کی مغلیہ سبک اس کے دائرہ عمل میں  
وہاں تھے۔ ان کے زمانہ اور صوبائی کوٹ سنے اس میں بیسیوں مقامی خصوصیات اور امتیاز پیدا کر دیئے  
چنانچہ شورشینی پراگرت مختلف مقامی زبانوں پر تقسیم ہوئی۔ اب بھرنش بھاشائیں کہلاتی ہیں  
نیام سندھ دس جی کہتے ہیں :-

راجپوتانہ کے دوپن سے۔ بتا چلتا ہو کہ میلی کی دوسری یا تیسری شنیدی میں اپ بھرنش

دہلی، نام سے پرستہ ہو، در سندھ، ملتان، تھانہ آتری پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ تہی کی کچھلی

شنیدی میں اس کا نام اپ بھرنش ملتا ہو،

مجھے اس سے پورا اتفاق نہیں کہ پانڈو دہا جو اپ بھرنش کی ایک مستند کتاب ہو وہ اپ بھرنش  
میں ہو اور اس کا مصنف پنجاب، سندھ یا ملتان میں سے کسی جگہ کا رہنے والا نہ تھا۔

ان اپ بھرنش بھاشاؤں میں سے صرف ایک کا ذکر کیا جائے گا یعنی کھڑی بولی کا۔ اس کا

تذکرہ بہت دل چسپ ہو۔ پہلے یہ زبان میرٹھ سے آگے نہیں چلی تھی مگر مسلمان فاتح اس کو ہندستان کے کونے کونے میں لے گئے۔ انھوں نے اس کو اپنایا ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں پھیلایا۔ اور یہ تاریخ بتاتی ہو کہ مسلمانوں کے علم کا پرچم سیت بندرا مشور تک پہنچا تھا، یہ ہونا ہی تھا کہ اس میں فارسی اور عربی کے لفظوں کا خلط ملط ہوا۔ چنانچہ یہ ہوا مگر موزوں تصرف کے عمل کے ساتھ۔ کھڑی بولی کو لڑچیم بھی مسلمانوں سے ملا، کیوں کہ امیر خسرو ہندی کے محققوں کے قول کے مطابق کھڑی بولی کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں، اور یہی اردو کے بھی پہلے شاعر ہیں۔

جس کھڑی بولی کا ابھی ذکر ہوا اس کی حال کی ترقی کی نسبت لکھتے ہیں :-

”برج اور ادھی کے ستھان میں کھڑی بولی اپن پورن اور کھڑی جہاں کی ہو۔“

جناب متعلیٰ سرن گپت اپنی نظموں کے مجوئے پلو کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

”ان میں پچیس برسوں کے چھوٹے سے بچے میں کھڑی بولی کی کوتاہی کے مول دیش کے ہر دے میں کتنے گہرے چلے گئے۔“

گپت جی نے اسی دیباچے میں آگے چل کر کھڑی بولی کا برج بھاشا سے مقابلہ کیا ہو۔

یہ امیر خسرو کی بدت تھی کہ جس بولی کو انھوں نے شاعری کا مٹا دیا تھا آج وہ تلمسی داس

اور سور داس، جالیسی اور بہاری کی زبان کے سامنے خم ٹھوکتی ہو۔

یہاں تک کام ہو چکا تھا اور مسلمان ہندستان میں بس گئے تھے، اور فاتح اور مفتوح کا امتیاز بہت کچھ کم زور پڑ گیا تھا کہ زبان کی تنظیم اور تدوین میں ہندو بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ اردو کی پہلی کتب غزل جو ہم کو ملتی ہو وہ ایک ہندو شاعر ہی کی ہو۔

اس مقالے کے موضوع میں صرف تین نام دیے گئے ہیں یعنی ”اردو، ہندستانی، ہندی۔“ اردو

اور ہندستانی کی نسبت تو آپ اب تک کافی سن چکے ہیں، مگر ہندی کی بابت ابھی تک اتنا ہی کہا

۱۔ ہندی بھاشا کا وکاس ۷۷ ۲۔ تفصیل کے لیے دیکھو کیفیہ ۲۳۳ ۳۔ پراچین اور نوین کاویہ  
دھارا، مصنفہ سوربہ جی سنگھ، ص ۱۶۱۔ ۴۔ تفصیل کے لیے دیکھو کیفیہ ۲۳۳

گیا کہ وہ بھی آرڈو کا ایک نام ہی۔ جیسا ابھی دیے گئے اقتباسوں سے واضح ہوا ہوگا۔ ابھی تک امیر خسرو والی کھڑی بولی کا نام ہی ادب میں لیا جاتا ہے اور اس کا محل ذکر کیا گیا لیکن آج کل عربی عام میں جسے ہندی کہا جاتا ہے اس کے بارے میں غور کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اس ضمن میں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا یہ قول ہے :-

"It (Hindi) was intended to be a Hindustani for the use of Hindus, and was derived from Urdu -"

پنڈت چندر دھر گگیری صاحب کی تحقیق جو اس بارے میں ہے ابھی عرض کی جاتی ہے۔ ہندی دنیا میں اس کا بہت چرچا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

"دھڑی بولی یا پکلی بولی یا ریختہ یا عہدِ حاضر کی ہندی کے ابتدائی زمانے کی نثر اور نظم کو دیکھ کر ہی جان پڑتا ہے کہ آرڈو رچنا (انشا) میں فارسی، عربی، تہسموں یا تدبھوں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تہسم اور تدبھوں کو کھنڈے سے بندری بنائی گئی۔۔۔"

کاشی کی ناگرہری پر چارنی سبھا کے بنیادی سیکرٹری شیم مندر داس جی فرماتے ہیں :-

"آرڈو دھڑی بولی کے رنگتہم ہے"۔

مذہب پرائیوٹ ہندی سہاٹیہ سملین میں جو ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا، شری بھال چندر راؤ نے استقبالیہ خطبے میں فرمایا :-

"ہندی سہاٹیہ کے (متناس) پریدی درشتی ڈالی جائے تو یہ سپشٹ گیات ہوگا کہ ہندی سہاٹیہ کا زبان کسی ایک جاتی نے نہیں کیا، وچتن بھاشا بھاشیوں تھا، وچتن پرائنٹوں کے کوپوں نے ہندی سہاٹیہ کا کاویہ زمانہ کیا ہے، ہندو کوئی، مسلمان کوئی، سنت کوئی، صوفی کوئی، پنجاب، راجستھان،۔۔۔ آدمی پرائنٹوں کے کوپوں نے اس سہاٹیہ کا کاویہ زمانہ کیا ہے"۔

بابو کالی داس کپور لکھتے ہیں :-

”سوتنر بھارت میں - - - ہندی، اُردو کی راشٹریہ اور پرانیتہ بھاشاؤں اور ان کے ساتھ کی پورن رکشا کی جائے گی۔ ہندی اور اُردو ایک ہی بھاشا کے دو ویجن ساتھ ایک روپ ہیں“۔<sup>۱</sup> سہ جناب ’حق پرست‘ کی کتاب ’ہماری زبان‘ پر مؤلف یا مصنف نے جو پیش لفظ لکھوایا ہے وہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :-

”ملک کے مشہور ادیب جناب اختر حسین رائے پوری کا یہ خیال غالباً بالکل درست ہے کہ مسئلہ زیر بحث زبان کا نہیں رسم الخط کا ہے“۔<sup>۲</sup>

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب اُردو ہندی کے جھگڑے سے متعلق ہی اور مصنف کا روس سخن اُردو کے خلاف ہے تو اس اقتباس کی وقعت جو ابھی پیش ہوا اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اُردو نے اور اُردو والوں نے صوبائی زبانوں یا کھڑی بولی سے کبھی سرومہری کا برتاؤ نہیں کیا۔ دور کے زمانے کو رہنے دیکھیے کہ وہ تذکرے تاریخ میں آپکے ہیں۔ سید انشا کے کئی زبانوں کے قصیدوں سے بھی قطع نظر کیجیے جن میں صوبائی بھاشاؤں کا بڑا دخل تھا اور ان کی رانی کیتکی کی کہانی کو بھی سہنے دیکھیے، عہد حاضر پر نظر رکھیے تو بداهت کے ساتھ واضح ہوگا کہ دلیہ کا دیوان ہی نہیں بلکہ بیسیوں شاعر جہاں اُردو نظمیں لکھتے ہیں ہندی میں بھی اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ موجودہ جنگ سے متعلق حکومت ہند نے اپنے مساعی کو ناممکن سمجھا جب تک کہ اُردو کے شاعر سے استمداد نہ کیا گیا۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا اس سے یہ حقیقتیں حاصل ہوتی ہیں :-

۱۔ ہندوستان کی زبانوں میں فارسی لفظوں کی آمیزش اسلام اور مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے ہونے لگی تھی۔

۲۔ کھڑی بولی کو عام رواج اور ادبی حیثیت دینے والے مسلمان تھے۔



۳۔ اُردو کی تدوین و تنظیم میں ہندو مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے۔

۴۔ ہندی کی شاعری اور ادب کے ترقی دینے والوں میں مسلمانوں کا ہتم بالشان حصہ ہے۔

۵۔ ہندوستانی وہ نام ہے جو انگریزوں نے اُردو کو دیا۔

۶۔ آج کل عَرَب عام میں جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہو وہ اُردو سے ماخوذ ہے۔

۷۔ اُردو اور ہندی میں بہت نزدیکی اور یکسانیت ہے۔

۸۔ اُردو اور ہندی میں صرف رسم خط کا امتیاز ہے۔

حضرت اب تک جو عرض کیا گیا اگر التفات کے قابل ہے اور جن آدمیوں اور کتابوں سے مختلف رائیں اور حقائق پیش کیے گئے، وہ قابل قبول ہیں تو کیا آپ کہیں گے کہ یہ اُردو ہندی کے جھگڑے کا بھڑت ملک کے سر سے نہیں اترا جاسکتا۔ یہ اتر سکتا ہے اور اسے اتارنا پڑے گا۔

میں نے شروع میں دکھایا تھا کہ بعد جنگ کی زخمی اور تجدید کا عمل ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اور اسی پروگرام میں زبانوں کا قضیہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم نے یعنی اُردو ہندی والوں نے اب اس جھگڑے کو نہیں نیڑا تو کوئی اور اس کو نیڑے لگا اور یہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں خوش اسلوبی کی پرداز کا ہونا دشوار ہے۔ اس لیے ہم اہل ہند کا فرض ہے کہ اور مختلف فیہ اور متنازعہ معاملوں کے ساتھ زبان کے معاملے میں موجودہ صورت کے ختم کرنے کی جدبھر کوشش کریں۔ بعض اہل غرض نے جو دقتیں دوائے کی شکل میں پیدا کر دی ہیں وہ اصلی نہیں، بے حقیقت ہیں۔ ان کے ساتھ اس مشورے پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

گفتند کہ ایں دؤراں آیا بہ تو می سازد  
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ بہم زن

## سر سید کے لکچر (یعنی تقریریں)

(جناب سید رشید الحسن صاحب ایم اے عثمانیہ)

### (۳) سر سید کی تمدنی اور معاشرتی تقاریر

اس طبقہ تقاریر میں ہم نے سر سید کی چار تقریریں رکھی ہیں۔ جن میں ”تہذیب و شائستگی“ اور ”رسم و رواج“ پر انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہو۔ ان سے ظاہر ہوتا ہو کہ سر سید کا مطالعہ کس قدر وسیع اور قوموں کی تہذیب و شائستگی اور رسم و رواج کے متعلق ان کی معلومات کا ذخیرہ کتنا وافر تھا۔ انھوں نے ان عنوانات میں دنیا کی تمام قوموں کی تہذیب و شائستگی اور رسم و رواج پر ایک تقابلی اور حکیمانہ نظر ڈالی ہو۔ جس میں تاریخی تسلسل بھی باقی ہو۔ یہ استدلال اب بھی اپنی اپنی جگہ درست اور قابل تسلیم ہیں۔ ان میں سے دو تقریریں سر سید کی ابتدائی تقریروں میں ہیں۔ چون کہ سر سید اپنی ابتدائی قومی زندگی میں ایک زبردست محقق اور مصنف کی حیثیت سے روشناس تھے اس لیے ان تقریروں میں بھی ان کی تحقیق اور تفتیش کی شان نظر آتی ہو۔ وہ ایک زبردست عالم کی طرح اپنے بیانات کو کھول کھول کر اور مدلل طریقے پر پیش کرتے ہیں۔ ”تہذیب و شائستگی“ پر جو تقریر کی ہو اس میں سب سے پہلے انگریزی لفظ سولیزیشن کے مشتقات بتائے ہیں اور پھر معنی وغیرہ۔ سب سے دل چسپ حصہ تقریر کا وہ ہو جہاں انھوں نے تہذیب و شائستگی کے اسباب پر بحث کی ہو اور ان کی پانچ قسمیں قرار دی ہیں۔ ان کی تشریح کا خلاصہ سب ذیل ہو :-

تہذیب و شائستگی پیدا کرنے والی یا اس کے روکنے والی پہلی چیز ایک مقام کے قدرتی اسباب ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ جن مقامات پر کھانے پینے کی چیزیں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں وہاں زیادہ لوگ آباد ہو جلتے ہیں اور ان کو اعلیٰ درجے کی شائستگی حاصل کرنے کا موقع ملتا ہو لیکن یہ غلط ہو اس لیے کہ اشیائے خورد و نوش کا آسانی سے بل جانا انسان کو کاہل بناتا ہو اور اس کے بعد طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس امر کی تصدیق کے لیے ہمارے سامنے افریقہ، جنوبی امریکہ اور ہندستان کی نظیر ہو جو اب تک جہالت میں مبتلا ہیں۔ البتہ مصر، شام اور ایران کے زرخیز خطے ایک عرصے تک تہذیب و تمدن کے مرکز رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی ملک کی زرخیزی اور خوبی جہاں اس کی شائستگی کے واسطے کوئی لازمی سبب نہیں وہاں اس کی مزاحم بھی نہیں ہو۔

دوسری چیز قوموں کے آمد و رفت کے ذرائع ہیں۔ جو قومیں اپنے جغرافیائی حالات سے مجبور ہیں کہ ایک دوسرے سے بل جل نہیں سکتیں اور علم و عقل کی روشنی حاصل نہیں کر سکتیں وہ تہذیب و شائستگی سے محروم رہتی ہیں۔ چنانچہ بحر قلزم کے کناروں اور جزائر متعلقہ یونان اور قسطنطنیہ میں جو آمد و رفت ہو یا یورپ و ایشیا و افریقہ و جزائر انگلستان کے باہم جو آمد و رفت ہو اس کی بدولت ان مقامات پر تہذیب کی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔ برغلاف اس کے افریقہ کا ریگستان، تبت و بھوٹان کی پہاڑیاں، بیرونی آمد و رفت کو روکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی قومیں وحشی ہیں۔

تیسری چیز مذہبی امور ہیں۔ مذہبی اعتقادات کی زنجیریں بھی انسان کو اس قدر جکڑ دیتی ہیں کہ جس سے قدیم ڈگر پر بے سوچے سمجھے چلتا ہو اور کبھی جہالت و تاریکی سے نکلنے نہیں پاتا۔ لیکن بعض مذاہب انسان کی صحیح رہبری کرتے ہیں۔ غرض مذہبی امور بھی کسی مقام کے تمدن کے پھیلنے میں مدد یا مزاحم ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز آزادی ہو۔ جن ملکوں میں آزادی ہو وہاں انسان ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہو۔ برغلاف اس کے غلام قوم دوسرے کی تابع ہونے کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتی اور ان کی تہذیب و شائستگی بھی برقرار نہیں رہنے پاتی۔ چنانچہ جب روسیوں میں شہنشاہی قائم ہوئی تو غلام بنانے کے دستور اور آزادی

کے جلتے رہنے سے ان کی شائستگی بالکل معدوم ہو گئی۔ برضلات اس کے یورپ کی تمام آزاد سلطنتیں وِنِ دونی اور رات چوگنی تہذیب و شائستگی حاصل کر رہی ہیں۔

پانچویں چیز مختلف قوموں کی تہذیب کو اخذ کرنے کی صلاحیت ہے۔ بعض قومیں کسی چیز کو جلد اخذ کرتی ہیں اور بعض دیر سے۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گورے رنگ کے لوگ کالوں سے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں۔ گوروں میں تحقیق و تفتیش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ کالے رنگ کی قوموں میں ایجاد یا اختراع کا مادہ کم پایا جاتا ہے۔

سر سید کی ”رسم و رواج“ والی تقریر بھی نہایت مفصل و مبسوط ہے۔ پہلے رسم و رواج کی مختلف تعریفیں کی ہیں ان میں سے ایک قانونی تعریف یہ ہے کہ :-

”رسم ایک ایسا قانون ہے جو کبھی تحریر میں نہیں آتا مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضامندی سے

جاری ہو“

پھر فرماتے ہیں :-

”رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں میں نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر

شخص غلام سے زیادہ اس کی تابع داری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کرنے کا

اندیشہ ہوتا ہے مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔“

پھر ان کی تین قسمیں بتائی ہیں کہ رسم و رواج ایک مذہبی، دوسرے حکومتی اور تیسرے معاشرتی ہوتے

ہیں۔ ان تینوں قسموں کے تحت اس کے موافق اور مخالف مختلف یورپی مصنفین کے اقتباسات

درج کیے ہیں اور آخر میں خود اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ رسم و رواج کا تبدیل کرنا اور ان کو ترقی

دینا معاشرت کے لیے ضروری ہے اور ایک منطقی دلیل یوں پیش کی ہے کہ :-

”رسمیں نتیجہ ہیں زمانے کی حالت کا اور زمانے کی حالت ہمیشہ قابلِ تغیر ہے پس رسمیں بھی قابلِ

تغیر ہیں“

رسومات کی اصلاح نہ کر کے ہمیشہ ایک ہی بات کے پیچھے پڑے اور لکیر کے فقیر بنے رہنے سے

انسان کی عقل سوچاتی ہو اور قوتِ ایجاد باقی نہیں رہتی جس کے سبب قومی تنزّل شروع ہو جاتا ہو۔ زمانہ اور تعلیم و تربیت خود بخود انسان کو اچھی اور بُری رسموں میں فرق دکھاتا ہو اور بُری رسمیں از خود مٹ جاتی ہیں۔ جس شخص کے دل میں اصلاحِ رسوم کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ وہ نہایت استقلال اور پامردی کے ساتھ قوم سے اختلاف کرے۔ گو شروع شروع قوم اسے نکو بنائے گی لیکن رفتہ رفتہ اسی کی پیروی کرنے لگے گی۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سقراط نے برب اپنی قوم کی بد رسموں کی اصلاح چاہی تو اسی کی قوم نے اس پر دیوتاؤں کے بُرا کہنے اور ایجنٹ کے نوجوانوں کو ہلکانے کا الزام لگایا اور آخر میں زہر کا پیالہ پلا کر مار ڈالا۔ مگر پسند روزِ نبی : نزرے تھے کہ اہل ایجنٹ نے اس کا ماتم کیا۔ اسی طرح لوتھر نے بھی عیسائی گرجا کی تمام بُری رسموں کا مقابلہ کیا اور اپنی سچائی پر نہایت استقلال سے قائم رہا۔ مسلمانوں میں غزالی نے مسائلِ اسلام بیان کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کی اس پر سلائے زمانہ نے کفر کے فتوے لگائے اور اس کی کتاب ”احیائے علوم“ کے جلانے کا حکم دیا یہاں تک کہ قتل کا حکم جاری کر دیا مگر بالآخر وہی امامِ خزانہ اور حُجۃ الاسلام کے لقب سے بھکارا گیا۔

سر سید بعض مذہبی رسومات کے دل سے قائل تھے۔ جن میں سے ایک رسم بسم اللہ ہو جس پر انھوں نے سید مسعود کی بسم اللہ کے موقع پر نہایت ہی مدلل بحث کی ہو۔ انھوں نے پہلے رسوم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک شعائرِ اسلام یا شعائر اللہ۔ دوسری شعائرِ المسلمین۔

”شعائرِ اسلام وہ جن کے کرنے کو رسول نے فرمایا اور خدا نے اس کو شعائرِ اسلام گردانا اور اس کے کرنے کا حکم دیا“

اس میں نہ کسی قسم کی کمی ہو سکتی ہو نہ زیادتی۔

”شعائرِ مسلمین وہ ہیں جو آں حضرت کے قول و فعل سے ماخوذ ہیں۔ اس کے کرنے کا قول کوئی حکم

نہیں ہو۔ لیکن گروہ در گروہ مسلمان اس کو مدت دراز سے کرتے آئے ہیں۔“

شعائرِ المسلمین میں سے ایک مستحکم رسم بسم اللہ کی ہو۔

بسم اللہ کی رسم نہ فرض ہو نہ سنت نہ واجب مگر کیا اچھا شعارِ مسلمین ہو کہ جب بچہ اس حد تک پہنچ جاتا ہو کہ کلام کو دُہرا سکے تو اس وقت کی یادگار میں جب کہ خدا نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ اقراء باسم ربك الذی خلق تو اس سے بھی کہلویا جاتا ہو اور دوستوں اور مسلمانوں کے سامنے اس کی خوشی منائی جاتی ہو۔“

مگر سر سید نے اس قسم کی اچھی رسموں میں بے جا خرچ سے بچنے کی نصیحت کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے قوم کی بھلائی کے کاموں کو نقصان ہوتا ہو۔

آخر میں ہمارا بہ لکھنا نہایت ضروری ہو کہ سر سید نے بحیثیت ایک رفارمر کے کیا کام کیا۔ اگرچہ سر سید کے زمانے میں راجا رام موہن رائے، بابو کشید چندر سین، ایثور چندر ودیا ساگر، سریش چندر بھٹاچاریہ رام نولا ہیٹری، سوامی دیانند وغیرہ نے ہندو کی اصلاح کی کوشش کی۔

دو مگر مسلمانوں میں ظاہر دو شخصوں کے رسوا کہ دونوں دلی کی خاک سے اٹھے تھے کسی نے

اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسماعیل اور دوسرے سید احمد خاں“

حالی کا یہ قول صحیح ہو۔ سر سید نے اس خصوص میں جو بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے معاشری حالات میں جو سمندر حائل تھا اس کو پاٹا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اسلام اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، ان کا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور ان کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا ہو۔ سر سید کا قول تھا کہ جس طرح مسلمانوں کی سیاسی حالت درست کرنے کے لیے مغربی تعلیم کی اشاعت ضروری ہو اسی طرح حاکم قوم سے معاشری تعلقات کو بھی مستحکم کرنا ان کا فرض ہو۔ اس دُشور گزار کام میں جو کام بنی ہوئی اور جو کام انھوں نے کیا وہ کسی اور شخص سے ناممکن تھا۔ سر سید کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے

”نبھائے اس کے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں

کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہو کوشش کی۔ سب سے پہلے انھوں نے

مذہبی خیالات و ادہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیوں کہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھتے ہیں ان کا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہو جاتا ہے۔ دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حُسن معاشرت میں تمام دُنیا میں فائق کر دیا ہے۔“

سر سید نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ قوم کا اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے۔ بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کے لائق نہیں رہتا۔

سر سید اپنے قول کے بڑے پابند تھے جو وہ کہتے وہی کرتے۔

”رسم و رواج کی پابندی کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور عید تہوار میں جو

فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سر سید کے گھر میں کہیں اُن کا نام و نشان نہ تھا۔“

سر سید کا قول ہے کہ

”نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے سن و طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرتا ہے۔“

## ۴، سر سید کی تنقیدی تقریریں

ابتدا ہی سے سر سید کو تحقیقاتی کاموں کا شوق تھا۔ چنانچہ حالی لکھتے ہیں کہ :-

”سر سید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔“

اس تحقیقی کام کے لیے بعض وقت جان جھکوں میں ڈالتے تھے۔ حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ سرستید قطبِ صاحب کی لائٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کی وجہ سے پڑے نہ جاتے اس کے پڑھنے کے لیے وہ ایک پھینکے کے ذریعے اُپر جاتے اور اس میں بیٹھ کر گفتگوں کتوں کا چربہ اُتارا کرتے۔

اس کے بعد سرستید کا ایک مشہور کام ”تاریخ سرکشی بجنور“ ہے۔ جس کے ترتیب دینے کے لیے باوجود اس کے کہ ملک میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی اور خود سرستید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے وہ اپنی یادداشتوں اور ضروری کاغذات کو مرتب کرتے جاتے تھے۔ ان کا رسالہ اسبابِ بغاوت بھی اسی قسم کے تحقیقی کام کا نتیجہ ہے۔

سرستید اپنی تقریروں میں ہمیشہ علمائے اسلام سے خطاب کر کے کہا کرتے کہ وہ اپنے اسلام کی طرح اس زمانے میں بھی مخالف اسلام تحریکوں کو دبانے کے لیے علمِ کلام کی طرح ایک اور علم ایجاد کریں اور خود بھی اکثر مذہبی تحقیقات میں مصروف رہا کرتے۔ حالی نے لکھا ہے کہ سرستید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں زمانہٴ حال کے شبہات جو لوگوں میں اسلام کی نسبت پیدا ہوئے ان کو دُور کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

”اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خدا داد ملکہ جو سرستید کی طبیعت میں ودیعت تھا اس کا ثبوت ان کی ہر ایک تحریر میں جو غدر کے بعد ان کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے مگر تفسیرِ القرآن جس میں گویا نئے کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہو سب سے عمدہ نمونہ ان کی تحقیقات کا ہے۔“

تقریروں کی طرح سرستید کی تقریریں بھی ہر قسم کی تحقیقات اور تنقیدات سے ملوث ہیں۔ سرستید علاجِ ہومیو پیتھک کے بڑے حامی تھے۔ انہوں نے بنارس میں سنہ ۱۸۷۶ء میں ایک طویل لکچر ہومیو پیتھک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول و طریقہٴ علاج پر دیا جس کے دیکھنے سے ان کی تحقیق کی عظمتِ دل میں بیٹھتی ہے۔ چنانچہ اس تقریر میں وہ ایلوپتھی اور ہومیو پیتھی کا



مقابلہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایلوپتھی دو یونانی لفظ سے مرکب ہو جس کو یونانی حکیم علاج بالصد کہتے ہیں اسی طرح ہومیوپیثی بھی دو یونانی لفظوں کا مرکب ہو جس کے معنی علاج بالمثل یا علاج بالشبہ کے ہیں۔ جب سے الوپتھی کا وجود ہوا اسی وقت سے ہومیوپیثی کے اصول بھی لوگوں کو معلوم تھے جو متعدد بیماریوں کے علاج میں مروج تھے۔

اس بحث کے ساتھ ساتھ وہ حوالے بھی دیتے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کالی داس اپنے سنسکرت کے ایک قصیدہ ”سنگارتنک“ کے ایک شعر میں ہومیوپیثی کے اصول تمثیلاً بیان کرتا ہے:-  
 ”پرانے زمانے کی بات اس دنیا میں یوں مٹی گئی کہ زہر خود زہر کے لیے علاج ہو“  
 ہپوکریٹس بیان کرتا ہے:-

”جس قسم کی چیزوں سے بیماری پیدا ہوتی ہے اسی قسم کی چیزیں بیمار کو دی جاتی ہیں تو وہی چیزیں ان بیماریوں کا علاج بن جاتی ہیں“

آگے چل کر اپنے نظریے کی تائید میں کہتے ہیں کہ ڈاکٹر مہنسن جو اس علاج ہومیوپیثی کا موجد ہے اس نے ان اصولوں کی ایجاد نہیں کی بلکہ ان کو اختیار کیا ہے۔ اول اول یہ اصول یورپ کے ایک جی اخبار (سنہ ۱۸۹۶ء) میں مشہور ہوئے اور بعد میں ہزاروں عالموں اور محالجوں نے ان سے علاج شروع کیا۔

ہندستان میں صنعتی تعلیم کے نہ پھیلانے کے لیے جو دلیلیں سرستہ نے اپنی ایک تقریر میں پیش کی ہیں وہ ایک بڑے محقق اور دانش مند کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ایک دلیل انھوں نے یہ بیان کی کہ صنعتی تعلیم کی خواہش اور تقاضا اسی ملک میں ہو سکتا ہے جہاں ہر قسم کے خانگی کارخانے کثرت سے ہوں اور فی الواقع ان کارخانوں کو صنعتی تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہو۔ ہندستان کی حالت یہ ہے کہ یہاں کسی قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ صنعتی تعلیم یافتوں کی مانگ ہے اسی صورت میں ملک کو صنعتی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ہندستان کے محدودے چند کارخانے مثلاً ریلوے یا چند کارخانوں کے

مزدوروں کے متعلق دیکھا گیا ہو کہ انھوں نے کسی مدرسے میں مشین یا اسٹیم یا فزکس کی اصولی تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ صرف عملی تعلیم سے ان سب کاموں کے کرنے کی لیاقت پیدا ہوئی۔ غرض عملی تعلیم و حقیقت اصلی صنعتی تعلیم ہو۔ بری اصولی تعلیم بے فائدہ اور عمر کا ضائع کرنا ہو۔

سرستید زبان اور اس کے ادب کے متعلق اعداد و قسم کی معلومات رکھتے تھے۔ وہ اُردو زبان کے معمار اور محسن ہیں۔ انھوں نے اُردو کو ستورا اور اس میں بے شمار راہیں نکالیں۔ اُردو شاعری جس کی صورت کو رائے تقلید کی وجہ سے سخی ہو رہی تھی اس کو نثر بخشنے والے ہی بزرگ ہیں۔

سرستید چل کر اُردو کو ہندستان کی مشترکہ زبان قرار دیتے تھے اور اس کو ہندو مسلم اتحاد کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی وسعت اور اشاعت عام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں جب بنارس کے سربراہ ہندو حضرات نے یہ تحریک شروع کر دی کہ سرکاری عدالتوں سے اُردو زبان کو بحال کر ہندی زبان رائج کی جائے تو سرستید بہت غمخیز ہوئے۔ انھوں نے اس تحریک کے لیے اُردو زبان کو دھکا دیا اور اُردو زبان کو دھکا دیا تو ملک کی متحدہ قوت پارہ پارہ ہو جائے گی اس لیے وہ اُردو زبان کی اصلاح اور ترویج میں اور زیادہ منہمک ہو گئے۔ خوش قسمتی سے ان کو جاتی جیسا ذہین اور متبحر شخص ملا جس نے ان کی تحریک کی رُوح کو سمجھا اور اس کو کامیاب بنانے میں بڑا ہمد و معاون ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی شاعری سرستید کی اصلاحی تحریکات کا ایک جز ہو۔ یہی وجہ ہو کہ سرستید حالی اور ان کے دیگر معاونین کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک ایڈریس کے جواب میں جس میں ان کی ابدی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا سرستید نے نذیر احمد کے ساتھ ساتھ حالی کو اس طرح سراہا ہو :-

”ایک ہی دن گزرا ہو کہ آپ نے ہمارے دلی کے فخر نذیر احمد کا اُردو لکچر سنا ہو شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو کہ ایسا فصیح لکچر دے جس میں اُردو کی فصاحت اور مولویانہ دونوں اضداد جمع ہوں۔ یہ دلی کے روڑے ہیں شاعر نہیں مگر چند اُردو کے اشعار جو انھوں نے پڑھے آپ نے سنے کہ کس فصاحت کے تھے۔ مولانا حالی کا مدرس سب صاحبوں نے سنا ہوگا۔ قوم کا ایک مرثیہ ہو

جو زبان سے نکلتا ہو اور دل میں بیٹھتا ہو۔ یہ سب لوگ آفتاب ہیں جنہوں نے زبان کی دہی پر توبہ کی ہو نہیں تو ان لوگوں کا جھوٹا کھانے والا اور خوشچیں ہوں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔“  
 حالی کی ”مدو جزیر اسلام“ جیسا کہ معروف ہو سرسید کے کہنے پر لکھی گئی تھی۔ سرسید نے جب دیکھا کہ حالی کی نظموں میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو انہوں نے اُردو شاعری کے قالب کو بدلنے کے لیے پیش کی تھیں تو بہت خوش ہوئے اور حالی ہی کو جدید اُردو شاعری کا بانی و موجد قرار دیا۔ ایک اور تقریر میں سرسید حالی کی تعریف میں اس طرح گویا ہیں :-

”شاعری جو مدت سے ہندستان میں جاری ہو وہ سب لوگ یقین کریں گے کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کانوں کو ہوتی ہو مگر دل میں اثر کرنے والی نہیں ہوتی لیکن جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہو وہ ایسا مشکل ہو کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہو۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہو۔“

اس ضمن میں سرسید کی ایک تقریر ”تعلیم زبان فارسی“ کے دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہو کہ سرسید انسانیت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا مطالعہ ہر قسم کے ادب پر حاوی تھا۔ جس زمانے میں ہندوؤں نے فارسی کو نصاب سے نکالنے کے لیے بہت سے شلخ سائے نکالے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ فارسی کو کلاسل نہیں سمجھتے تھے اور جیسا کہ سرسید نے کہا ہو وہ شاید کسی مردہ زبان ہی کو کلاسل سمجھتے ہوں لیکن سرسید نے پہلے اس لفظ کی تحقیق کی اور بتایا کہ کلاسلکس لیٹن کے لفظ کلاسلکو سے نکلا ہو اور یہ لفظ روم کے اعلا درجے کے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس صفت نے آگے چل کر اعلا درجے یا مستند کا مفہوم پیدا کر لیا۔ اور لٹریچر اور آرٹ میں اس کا اطلاق ہونے لگا۔

کلاسلکس کے مفہوم کو سمجھانے کے بعد سرسید یہ ثابت کرتے ہیں کہ فارسی زبان بھی ایک کلاسلکس زبان ہو۔ اس کی شیرینی تمام دنیا میں مسلم ہو۔

”اس کی شاعری کیا بہ اعتبارِ نازک خیالی، کیا بہ لحاظِ علمِ اخلاق اور کیا بہ اعتبارِ تمام فنونِ شاعری کے ایسی اعلیٰ درجے پر پہنچی ہوئی ہو کہ بڑے بڑے لیٹن اور گریک کے شاعروں کی ہمہری سے بھی کسی قدر بلند ہوگئی ہو“

عمر خیام کی رباعیات، فردوسی کی مثنوی (شاه نامہ)، حافظ کی غزلیات سب کو دنیا کی شاعری میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اسی طرح سعدی، نظامی، جامی، خسرو، انوری و خاقانی وغیرہ۔ فارسی کے نہایت بلند پایہ اور مستند استاد گزرے ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی ایک علمی زبان بھی ہے۔ اس میں فلسفہ، علمِ الاخلاق، سیاست، تمدن، ہیئت، ریاضی، تاریخ، طب وغیرہ کا ایک دافرِ فیر ہے۔ یہ زبان ایسی طاقت ور اور فصیح ہے کہ ہر قسم کے علمی مسائل ادا کیے جاسکتے ہیں۔

سرستید فرماتے ہیں کہ فارسی ایک اعلیٰ درجے کی اور کلاسیکل زبان ہونے کے علاوہ ہندستان کے مسلمانوں سے ہمیشہ متعلق رہی ہے اس میں ان کی تاریخ، تمدن اور اخلاق مدون ہوا ہے اور فارسی زبان ہی نے ہندستان کے لوگوں کو تہذیب اور محسنِ معاشرت سکھایا اور یہاں کی ذہنی اور دماغی نشوونما کا کام اسی نے کیا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہاں کے مسلمان فارسی زبان کو فراموش نہیں کر سکتے۔

ایک مقام پر سرستید نے فارسی زبان میں عربی الفاظ کے متعل ہونے کے وجوہات پر بڑی دل چسپ بحث چھیڑی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب عربوں نے ایران فتح کیا اور وہاں ایک عرصہ دراز تک حکومت کرتے رہے تو لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی زبان میں جو فارسی قبی بہت سے عربی الفاظ داخل ہوئے جس طرح اب اردو زبان میں انگریزی کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح گھل مل گئے کہ اسی زبان کے الفاظ معلوم ہونے لگے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ تین قسم کے ہیں :-

اول: قرآن کی بے مثل فصیح دلیغ آیتیں جو فارس کے چپے چپے پر پڑھی جاتی تھیں ایسی

دل کش تھیں کہ کوئی دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے ان آیتیں

کے اور مذہب اسلام کے خاص الفاظ فارسی میں داخل ہوئے۔“

دوم: فاتح قوم کی زبان کے وہ الفاظ جو اموری سلطنت سے متعلق ہوتے ہیں مفتوح قوم کی زبان

میں قدرتی طور پر داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فارسی میں بھی یہی ہوا۔

سوم۔ ان تمام علوم کے الفاظ جو عرب فارس میں لائے وہ بھی ہلاکسی جبر و اکراہ کے فارسی

میں شامل ہوئے۔

غرض یہ تین قسم کے عربی الفاظ اب فارسی کے جزو بدن ہو گئے ہیں ان کو اس سے علاحدہ

نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے علاوہ جتنے غیر مانوس عربی کے الفاظ ہیں وہ یقیناً فارسی سے خارج

کر دیے جاسکتے ہیں تاکہ اس میں اس کا اصلی لوج باقی رہے۔

## (۵) سرستید کی سیاسی تقریریں

سرستید کی سیاسی قابلیت | سرستید کی سیاسی قابلیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہو۔ غدر کے بعد  
”رسالہ اسباب بغاوت“ لکھ کر انھوں نے ثابت کیا کہ غدر ایک

سرکشی تھی جس کا

”اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول مکی تھی جس نے رفتہ رفتہ ان عام غلط فہمیوں کے سبب

جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ملکی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔“

اور پارلیمنٹ کا ان غلط فہمیوں کو مان لینا یقیناً سرستید کی زبردست سیاسی قابلیت پر دلالت کرتا ہو۔

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ”اور اڈین مسلمانز“ کی تردید میں سرستید کا ایک جامع کتاب لکھنا ان کی

اعلا سیاسی قابلیت کی دوسری دلیل ہو۔ سب سے زبردست ثبوت ان کی سیاسی قابلیت کا محمدن

کلچ کے قیام کا ہو جن کے متعلق حالی نے لکھا ہو کہ:-

اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پوٹیکل بے وقتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں ان کا اعتبار نہیہ

کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندستان کی چھو کرڈر رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے۔

تو وہ بھی محض کالج ہو سکتا ہو۔

اس کے متعلق مسٹر کین نے لکھا ہو :-

”دودو ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر پولیٹیکل جوش پھیلانے والا ہو۔“

سب سے آخری چیز ان کے وہ دلائل ہیں جو کانگریس کی مخالفت میں دیئے گئے ہیں جن پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔

سرئید کے دل میں حریت کا جذبہ بحیثیت مسلمان موج زن تھا۔ ان کا خیال **سرئید کی سیاست** تھا کہ آزادی کی تڑپ مسلمان کو دراثا ملتی ہو۔ ان کی ایک تحریر ملخصہ فرمائیے جس میں انھوں نے ان خیالات کی وضاحت کی ہو :-

”فیث مسلمان ہوں ہندستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انھی دو باتوں سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں کوئی اور ان پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطان ترکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے دیوان اور پتھرے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اوٹ چراتے ہیں، بوریے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ انڈینیوں کا دودو پیٹے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔“

اسی تحریر میں آگے چل کر اسلام کی جہوریت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ اسلام :-  
”ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہو اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور لیٹڈ مانا کی کو ماننا ہو بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہو۔ ایک پریسیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہو۔“

”لیکن ہمارا مذہب جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے ہیں اس نے اور باتیں بھی سکھائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہو، انصاف سے ہم پر حکم رانی کرتی ہو، ملک میں امن و امان قائم رکھتی ہو اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہو۔ تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابع دار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جب کہ زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو۔“

متذکرہ بالا اقتباس کا آخری جملہ قابل غور ہو۔ ہندستان کی عام حالت جو کچھ اس زمانے میں تھی وہ نہایت اتر تھی۔ تعلیم کا فقدان تھا، قوتیں متفرق ہو چکی تھیں، مغربی کی بلا پھیل چکی تھی۔ اور اس وقت تو کیا اب تک بھی قوم میں وہ تمام چیزیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بل بوتے پر آزادی کے تقاضے بجائے جائیں۔ زمانے کی حالت جب اس قدر بُری تھی تو پھر کیسے یہ توقع رکھ سکتے تھے کہ ہندستانی اپنے ملک پر خود حکومت کرنے کے قابل تھے۔

انگلستان سے ایک خط میں انھوں نے انگریز اور ہندی کا اس طرح موازنہ کیا ہو :-  
 ”اس سب کا خلاصہ یہ ہو کہ ہندستان میں انگریزوں کی بد اخلاقی اور ہندوؤں کو جانوروں سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے نزدیک قابل معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے نادانیت کی بنا پر وہ لوگ ایسا کرتے ہیں اور میرا تو خیال یہ ہو کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے انھوں نے قائم کی ہو وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہو۔ انگریزوں کی بے جا تعریف کیے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندستانی خواہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے، سوداگر ہوں یا سہولی مکان دار، تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل جب ان کا مقابلہ تعلیم، اخلاق اور ایمان داری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہی نسبت ہو جو ایک گندے جانور کو ایک خوب صورت اور لائق انسان سے ہوتی ہو۔“

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ذلیل ہو چکے تھے۔ ان میں کردار نام کو نہ تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے غلامی کا طوق پہن لیا تھا۔ ہندو ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے محکوم تھے اور جب تک ان کے محکوم رہے انھی سے عزت و جاہ کے خواست گار رہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے ان سے اعلا مرتبے پاتے رہے۔ جب مسلمانوں کی غلامی سے بھل کر انگریزوں کے ماتحت ہو گئے تو مغربی علوم سیکھ کر مسلمانوں بلکہ خود انگریزوں سے ہم سمری کا دعویٰ کرنے لگے۔ مسلمانوں کے سر سے ابھی حکومت کا نشہ نہیں اُترا تھا وہ ابھی اپنے خوابِ گزاں میں بے خبر تھے۔ ان کا وہ اعلا کردار جاتا رہا تھا جو کسی زمانے میں ان کو دنیا کی ساری قوموں سے ممتاز کرتا تھا۔ سرستید اس خیال کے حامی تھے کہ پہلے ہم اپنی خامیوں کو دُور کر کے تہذیب یافتہ قوموں کے برابر ہو جائیں اور ان موافق حالات کے منتظر رہیں یا ان کو پیدا کریں جن کے ہم خواہاں ہیں۔ سرستید انگریزوں کے اعلا کردار کے مداح تھے اور جب وہ انگلستان گئے اور وہاں کی سوسائٹی کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو ان کے اس خیال کو اور تقویت ہوئی۔

یہی بات کہ سرستید انگریزی حکومت کو کیوں پسند کرتے تھے اس کے کئی وجوہات ہیں۔ اس کی سب سے پہلی اور اہم وجہ سرستید یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان انگریزوں کی آمد سے پہلے ایک عرصے تک چند جابر اور غاصب بادشاہوں کے ہاتھ سے ماتحت و تاراج ہوتا رہا اس کے بعد :

” خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ہندوستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا طرزِ حکومت زیادہ تر قانونِ عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالیٰ کی تھی کیوں کہ جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ آباد تھے تو اس خدا کو جو کرپن کا بھی ایسا ہی خدا ہو جیسا کہ ہندو مسلمان کا، ضرور ایسی حکومت ہندوستان میں قائم کرنی چاہیے تھی جو زیادہ تر عقلی قوانین حکومت کی پابند ہو۔“



اسی طرح سرسید اور جگہ فرماتے ہیں :-

”گو ہندستان کی حکومت کرنے میں انگریزی حکومت کو متعدد لوازمات لڑائی پڑی ہوں مگر حقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بذور ماحصل کی اور نہ مکرو فریب سے بلکہ درحقیقت ہندستان کو کسی حاکم کی اس کے ادنیٰ معنی میں ضرورت تھی سو اس کی ضرورت نے ہندستان کو اُن کا مقدم بنایا۔“

دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی انگریز ہی ہو سکتے تھے چنانچہ سرسید نے کئی مرتبہ کہا :-

”میں ہندستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی مبرا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے بچ سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی ۔ دولت بچ سکتے ہیں۔“

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

”اب زمانے نے پلٹا دکھایا ہے۔ خدا نے انگریزوں کو ہم پر حکومت دی ہو۔ علم کے خزانوں کی کئی پھرتی پھرتی ان کے ہاتھ پڑی ہو۔ پس اب تم کو نہایت احسان مندی سے علوم و فنون کو ان سے لینا چاہیے اگر احسان مندی سے نہیں لینا چاہتے ہو تو اپنے باپ دادا کا قرضہ ہی واصل کرلو۔ اگر تم نے آج نہیں کیا تو حاقث ثابت ہوتی ہو۔“

تیسری وجہ سرسید کے نزدیک یہ تھی کہ چوں کہ انگریزوں کے پاؤں ہندستان میں جم چکے تھے اور وہ اپنی دولت اور طاقت میں بہت بڑے ہوئے تھے اس لیے ہندوستانیوں کا اُن کے مقابلے میں کسرے ہونا پانی میں رہ کر گمرچھ سے بیہ رکھنے کے برابر تھا۔

چوتھی وجہ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت نے ہندستان کے سب مذاہب کو آزادی دے رکھی ہے ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور اپنی دانش مندی اور قوتِ بازو سے ملک

میں امن و امان قائم رکھا ہے۔ ان تمام چیزوں کے ہونے کے باوجود ان کو نکالنے کی کوشش کرنا ملک میں بے چینی اور انتشار پیدا کرنا ہے۔ سر سید مسلمانوں سے خاص طور پر مخاطب ہو کر کہتے کہ انگریزوں کا دورِ حکومت ہی ان کے لیے پُر امن زمانہ ہے جس میں وہ اطمینان سے علم و فضل حاصل کر کے مہذب قوموں کے صف بہ صف کھڑے ہو سکتے ہیں۔

پنٹ جواہر لال نہرو نے سر سید پر یہ الزام لگایا ہے کہ :-

”سر سید نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر شروع کیا تھا۔

اور اس لیے وہ کوئی ایسا قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ انھوں نے نوزائیدہ نیشنل کانگریس کو پس پشت ڈالا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت ہی چاہتی تھی اور اس لیے ان کی پوری حمایت کی۔“

یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ سر سید نے ایک نہیں متعدد جگہ اس خیال کو دہرایا ہے کہ :-

”گورنمنٹ کی مدد ہمارے آزادانہ انتظام میں کچھ نہ کچھ مخل ہوتی ہے۔ جو ہم کرنا چاہتے ہیں اس میں بہت سی پابندیاں کرنی پڑتی ہیں۔ تمھاری ذاتی مدد میں تم کو کسی کی پروا نہ ہوگی۔“

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

”قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک کہ ہم اپنی

تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام

مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ قومی کاموں میں صرف گورنمنٹ پر بوجھ ڈالنا اور اسی کا ہتھ تکیے رہنا

نہایت بزدلی اور بے عزتی کا کام ہے۔“

اگرچہ سنہ ۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس اس غرض سے قائم کی گئی  
**کانگریس کی مخالفت** کہ وہ حکومت ہند سے اپنے جائز مطالبات پیش کر کے ان کو حاصل کرے لیکن اس سے کئی سال قبل سنہ ۱۸۶۶ء میں سر سید نے بھی اسی قسم کی ایک انجمن کی

بنا ”برٹش انڈین ایسوسی ایشن“ کے نام سے ڈالی

”جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درود دل اور اپنی شکایتوں کے

اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس جس جذبے کے ساتھ قائم ہوئی تھی بالکل اسی قسم کے جذبات سرسید کے دل میں پہلے ہی سے موج زن تھے۔ انھوں نے بھی کانگریس کے قیام سے قبل ”برٹش انڈین ایسوسی ایشن“ کے ذریعے بعض ایسی تحریکات حکومت ہند کو روانہ کیں جو ان سے بطور شکایت کے تھیں۔ اس کے علاوہ ”رسالہ اسباب بغاوت“ میں جو سخت اعتراضات حکومت ہند پر کیے تھے اس میں بھی سرسید کی یہی ذہنیت کام کر رہی تھی جس کے متعلق حالی لکھتے ہیں :-

”سر سید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگریس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی۔“

لیکن آگے چل کر حالی کانگریس اور سرسید کا مقابلہ اس طرح کر کے دکھاتے ہیں :-

”سر سید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگریس سے مختلف تھی۔ سر سید نے جو الزامات گورنمنٹ

پر عائد کیے تھے ان کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی شخص کو نہیں ہوئی

اور کانگریس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے ان کی تمام ملک میں منادی کی گئی۔ سر سید نے رعایا اور

گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دُور کرنے کی کوشش کی اور کانگریس نے غلط فہمیوں کو پھیلانے میں۔ سر سید

نے اُن باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگریس نے زیادہ تر اُن

باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سر سید کی تمام خواہشوں

میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصلح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگریس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ

کی مصلح ملکی کے برخلاف تھیں۔“

سرسید کانگریس اور خود کے اس تفاوت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کانگریس کے قیام کے بعد تقریباً

تین سال تک سرسید اس کی کارروائیوں کو دیکھتے رہے جب ان پر اچھی طرح غور کر لیا تو انھیں

معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا نہایت مفقرت رسالہ ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۷ ع میں انھوں نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کانگریس کی تمام کارروائیوں اور اس کے نتیجے سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور کانگریس میں شریک ہونے سے باز رکھا۔ کانگریس نے جو اعتراضات حکومت پر کیے تھے ان میں سے بعض کے جوابات تقریر میں دیے۔ سب سے بڑا اعتراض کانگریس کا یہ تھا کہ کوئین وکٹوریہ کے اس اعلان کے مطابق کہ :-

”تمام رعایا خواہ گوری ہو یا کالی، خواہ یورپین ہو یا کوئی، سب مساوی ہیں اور عہدے پانے کے مستحق ہیں۔“

”غیر متہند“ عہدوں کا امتحان عام مقابلے کے لحاظ سے ہو۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق نکال دیا جائے اور وہ امتحان بجائے انگلستان کے ہندوستان ہی میں ہوا کرے۔

اس اعتراض کا جواب سرحدیوں دیتے ہیں کہ اس ملک کے افراد جہاں موچی سے لے کر ڈیوک تک ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مقابلے کا امتحان جاری کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہو لیکن جس ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں جیسا کہ ہندوستان ہو مقابلے کا امتحان ایک دشوار امر ہے۔

”ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی بڑبڑیاد سے واقف ہیں، اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گی۔“

ایک دقت ہندوستانیوں کے لیے یہ بھی ہو کہ یہاں کی سب قومیں بہ اعتبارِ لیاقت، تعلیم اور دولت کے برابر نہیں ہیں۔ بنگالی علم و لیاقت میں سب سے بڑے ہوئے ہیں۔ اگر مقابلے کے امتحان میں سب کے سب بنگالی آجائیں اور ان میں سے ایک کسی راجپوت یا پنجابی علاقے میں حکومت کرنا چاہے تو ناممکن ہو۔

”پس مقابلے کا امتحان نہ صرف ملک کی کسی خاص قوم کے لیے مسر ہو بلکہ امن کے لیے بھی مضر ہو۔“

کانگریس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ :-

”دائسرائے کی کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں - وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح لندن میں ہوس آف کانٹس اور ہوس آف لارڈز ہو اسی طرح ہندستان میں بھی اس کی نقل بنائی جائے اور جوائنٹن سے مقرر ہوں وہ بطور ہوس آف کانٹس کے ہوں اور جو ممبر گورنمنٹ کے ملازم ہیں وہ دائسرائے کے بطور ہوس آف لارڈز کے ہوں“

اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہندو چوں کہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں اس لیے ایک دوٹ مسلمان ممبر کے لیے ہوگا اور چار ہندو کے لیے

”پس مسلمانوں کا ٹھکانا ہندوؤں کے مقابل کہاں رہے گا اور جوے کے اصول کے مطابق

چار پائے ہندوؤں کے لیے اور ایک پائے ہمارے لیے ہوگا“

اس کے علاوہ اگر ایکٹر کے لیے دولت کی شرط لگائی جائے تو مسلمان تو کہیں کے نہ رہیں گے اور ہندوؤں میں بھی سوائے بنگالیوں کے کوئی منتخب نہ ہو سکے گا۔ اور اگر اس کے سوا ایک تعداد معتین ہندوؤں کی اور ایک مسلمانوں کی بھی مقرر کی جائے تو بھی مردم شماری کی رو سے ایک مسلمان ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور اگر طریقہ انتخاب فرقہ واری کی بنا پر ہوگا تو بھی :-

”تمام قوم میں ایک مسلمان بھی نہ نکلیے گا جو دائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو“

تیسرا اعتراض کانگریس کا یہ تھا کہ ہندستان کا بجٹ ان کی رائے سے منظور ہو لیکن سرحد کہتے ہیں کہ ہندستان کا بجٹ خواہ وہ کسی سیاسی امور کے متعلق ہو یا فوج وغیرہ کا اس کا اندازہ ہندستانی نہیں کر سکتے اس لیے ان سے اس معاملے میں رائے لینا بے سود ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہو جب کہ حاکم د محکوم دونوں ایک قوم سے ہوں :-

”انگریزوں نے ہندستان اور اس کے ساتھ ہم کو فتح کر لیا ہو۔ پھر کیا یہ اصول سلطنت کے مطابق ہو کہ وہ ہم سے پوچھیں کہ ہم برا جاکر لڑیں یا نہ لڑیں۔ ہندستان میں گورنمنٹ کا ذمہ

ہو کہ وہ خود اپنی سلطنت تھامے اور جس طرح مناسب سمجھے اپنی فوج اور سلطنت کا خرچ پیدا کرے۔“

سرسید کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے جتنے مقاصد تھے سب کے سب ہندوؤں کے فائدے کے تھے۔ مسلمانوں کی اس میں کوئی خاص بہتری نہیں تھی۔ ہندو چاہتے تھے کہ وطنیت (Nationalism) کے نام سے مسلمانوں کو جو مغربی تعلیم اور دولت میں ان سے پیچھے رہ گئے تھے اپنے میں ضم کریں۔ اس چیز کو جواہر لال نہرو نے اپنے خاص رنگ میں اس طرح پیش کیا ہو :-

”سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہو کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی مضبوط تھے۔“

اس ذہنیت کی بنا پر کانگریس نے ابتدا ہی سے بعض مسلمانوں کو رُپے پیسے اور شہرت کا طعمہ دے کر اپنے زمرے میں شریک کر لیا۔ سرسید کانگریس کے اس منشا سے آگاہ ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے سنہ ۱۸۸۸ء کے میرٹھ کے لکچر میں مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا کہ وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں کیوں کہ وہی ان کی تباہی کا باعث ہوگی۔ سرسید نے ان چند مسلمانوں کے متعلق جو کانگریس میں شریک ہو چکے تھے کہا کہ :-

”ان کی حقیقت بجز اس کے کہ کراے کے آدمی ہیں اور کچھ نہیں۔“

یہ گنتی کے دو چار مسلمان تمام مسلمانوں کے خیالات کے نمائندے نہیں ہو سکتے۔

”جھوٹ بات بیان کر کے کہ یہ فلاں ضلع کے رئیس ہیں اور فلاں مقام کے نواب ہیں اور ہماری قوم کا غلط ارادہ ظاہر کرنا کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک رہیں ہماری قوم پر ناوابج

دست اندازی ہو“

مسلمانوں کو تو کیا سرستید ہندوؤں کو بھی کانگریس میں شریک ہونے سے منع کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے :-

”ہمارے ملک کے ہندوؤں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی حالت گو مسلمانوں سے کسی قدر اچھی ہو لیکن ایسی اچھی نہیں ہو کہ وہ دودھ کر ہم سے آگے بھل جائیں گے۔ ہم سب ایک ملک کے رہنے والے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ہیں کہ ان میں مسلمانوں کی عادتیں گھس گئی ہیں جیسے کہ ہمارے دوست کا سینٹھ صاحب ہیں ان کی عادت اور ان کی حالت ہم سے کچھ زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہو اور ہندو بھی کچھ ہم سے بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ جو کچھ ہمارا حال ہوگا وہی حال اس ملک کے ہندوؤں کا بھی ہوگا۔“

سرستید کانگریس کو بنگالیوں کی ان مختلف تحریکیوں یا سازشوں میں سے ایک تصور کرتے تھے جو انھوں نے انگریزوں کے دورِ حکومت کی ابتدا ہی سے انگریزی تعلیم حاصل کر کے شروع کی تھیں۔ اس لیے وہ ہندوؤں کو بھی روکتے تھے اور کہتے تھے کہ :-

”یہ تجویزیں کانگریس کی ایسے ملک کے لیے جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں۔ ایک کنویں سے پانی پیتے ہیں، ایک شہر کی ہوا کھاتے ہیں، ایک کی زندگی دوسری پر منحصر ہو۔ نہایت بداندیشی کی تجویزیں ہیں۔ ایک دوسرے میں عداوت پیدا کر دینا نہ امن کے لیے مفید ہو نہ ملک کے لیے نہ شہر کے لیے۔“

سرستید خاص کر مسلمانوں کو بنگالیوں کی اس قسم کی سازشوں میں شریک ہونے سے ہر وقت منع کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ غدر میں جو کچھ نقصان مسلمانوں کا ہوا وہ کچھ کم نہ تھا۔

”سرستید ایک چٹّی میں جو انھوں نے بدرالدین طیب جی کے نام لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں امریکہ میں اڈل اسی قسم کا ایگیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہاں تک نہایت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا۔ ”نیکیشن وِڈ آؤٹ ریٹینشن“ پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی

طاقت ہو وہ اس کانگریس کے ایجنٹوں میں شریک ہوں ورنہ ہندوؤں کی طرح تالیاں بجاتی چاہئیں۔“

پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں :-

”غدر میں کیا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو لنگا

ہنا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔“

سرستید نے سیاسی معاملات میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو قوم کی بھلائی میں ہر وقت مفید

اور کارآمد ثابت ہو۔ آخر زمانے میں مسلمانوں نے ان کی ہر بات اور ہر تحریک پر بھروسہ کیا چنانچہ مولوی حالی کہتے ہیں :-

وہ اگرچہ سرستید کو مسلمانوں نے عموماً مذہبی پیتوا نہیں مانا لیکن شاید ہندستان میں ایسا ایک مسلمان بھی

نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں ان کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک آواز پر

بہ اشتیاق وعدے چند، ہندستان کے تمام مسلمان کیسٹھی، کیا شیعہ، کیا وہابی کیا غیر وہابی،

کیا پڑھے لکھے اور کیا اُن پڑھے۔ کیا وہ لوگ جو ان کی پارٹی میں گئے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت

کثیر جو ان کی ہر بات کی مخالفت کرتی تھی سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے صرف اس بنا پر

علاحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھو کھا

مسلمانوں نے ان کا غدد پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیے جو پیٹریارک الیوسی ایشن نے اس بات

کے اظہار کے لیے دلالت بھیجے تھے کہ ہندستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔“

متذکرہ بالا اقتباس اور دیگر سوانح سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرستید اپنے وقت کے ایک

بڑے سیاست تھے اور ان میں وہ تمام اوصاف اور خوبیاں موجود تھیں جو آج کل کے ماہرین سیاست

میں پائی جاتی ہیں۔

## (۶) سرستید کی قانونی تقریریں

سنہ ۱۸۷۸ ع میں سرستید پہلی مرتبہ کونسل کی ممبری کے لیے منتخب ہوئے۔ قانونی کونسل



میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی تحریک سب سے پہلے سر سید ہی نے کی۔  
 ”انھوں نے اپنے رسالہ ”اسباب بغاوت“ میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں  
 ہندوستانیوں کی بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بے خبر رہنے کو قرار دیا تھا۔“

ف-۱۔ ہندوستانیوں میں سر سید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانے میں ہندوستانیوں کی  
 بھلائی کے لیے قانون بنایا۔ وہ چار برس مستقل ڈائریکٹر کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصے  
 میں انھوں نے دو سو دو کونسل میں پیش کیے۔ چچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے  
 تقرر کا قانون۔ یہ دونوں سو دوے پاس ہو گئے۔“

کونسل کی ممبری کے زمانے کی بہت سی تقریروں میں سے ان کی صرف چار تقاریر ہمارے سامنے  
 ہیں جو ”مجموعہ کچھ سر سید“ میں پائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے سنہ ۱۸۷۹ ع کے قانون ٹیکہ چچک کی تقریر جو جس میں انھوں نے نہایت  
 خوبی سے بحث کی جو کہ ملک میں ٹیکے کا جبری قانون جاری کرنے سے شخصی آزادی میں کسی قسم  
 کی مداخلت نہیں ہونے پاتی۔ کہتے ہیں :-

”کوئی ذاتی رعایت یا ذاتی آزادی اس مضرت کو جائز قرار نہیں دے سکتی جو وہ اس بیماری کے  
 انتقال سے اپنے ہمساویوں کو پہنچاتا ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ٹیکے کے لازمی کر دینے کی تجویز  
 سے معصوم بچوں کی جانوں کی ان کے والدین کی بے وقوفی کے نتائج سے محافظت عمل میں  
 آئے گی۔“

اس کے ساتھ ایک سہولت اس سو دوے میں یہ بھی رکھی گئی تھی :-

”ہندوستان کے بعض اقطاع ایسے بھی ہیں جن کی حالت بالفعل اس قانون کے اجرا کے مناسب  
 نہیں ہو۔ اس واسطے قانون مجوزہ عام طور پر لازمی نہ ہوگا۔ یہ قانون صرف ان حصہ جات

ہندستان کے متعلق ہوگا جہاں لوکل لجس لچر نہیں ہو اور اس کا عمل درآمد برٹش انڈیا کی ان میونسپلٹیوں اور چھادیوں پر محدود ہوگا جن سے لوکل گورنٹیں اس قانون کا متعلق کرنا اپنے نزدیک مناسب سمجھیں۔“ اس کے بعد چیپک کے ٹیکے کی اہمیت پر زور دیا ہو کہ یہ مرض ہندستان میں متعدی ہو اور جس سے ہر نیچے کو گزرنا پڑتا ہو۔ اگر اس سے بچ بھی جائیں تو چہرے کے داغ یا آنکھ کا نقصان ضرور برداشت کرنا پڑتا ہو۔

”ایسا قانون جس کا منشا ہندستان کی آئندہ نسلوں کو ایسی عام اور سخت بلا سے محفوظ رکھنے کا ہو اگر مناسب طور سے عمل میں آئے گا تو بجائے اس کے کہ غیر مانوس ہو اس ملک کے لوگ اس کو ایک غیر مترقبہ نعمت خیال کریں گے۔“

اس مسودے کی عمدہ ترتیب اور بحث سرستید کی اعلیٰ قابلیت کا پتا دیتی ہو۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ قانون سے سرستید کو ہمیشہ تعلق رہا اور ایک عرصہ دراز تک جی کرتے آئے تھے۔ ان کی قانونی قابلیت کو ان کے حکام بالادست نے بار بار تسلیم کیا ہو۔ بنارس کا ایک رنج ان کے متعلق لکھتا ہو :-

”اس کے (یعنی سرستید کے) فیصلے نہایت غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں، وہ مقدمے کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب اس طرح غور کرتا ہو کہ عدالت اپیل کے فیصلے کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان کے اس بہت بڑے تجربے سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں ان کو حاصل ہو میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہو۔“

گو سرستید ری پری زینیشن کے اصول کے موافق تھے لیکن وہ اپنے تجربے کی بنا پر ہندستان کے لیے جہاں بہت سی قومیں، مختلف قابلیت، مختلف مذاہب اور مختلف درجوں کی بستی ہیں، نامناسب تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مسودہ قانون ”لوکل سیلف گورنمنٹ“ متعلقہ اضلاع متوسط کی تائید میں تقریر کرتے وقت کہا کہ لوکل بورڈوں میں دو ٹلٹ ممبر انتخاب سے اور ایک ٹلٹ نامزدگی سے مقرر

کیے جائیں۔

”جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزوِ اعظم رہے گا ملحدان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے متعلق ہیں ان کے باشندوں پر اثر ڈالے گا اس وقت تک ایکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجائے گی جن کے باعث قوم اور مذہب کے اختلافات بنیبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہو جائیں گے۔“

اپنے وسیع تجربے کے متعلق خود سرسید نے قانونِ حقوقِ استفادہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ یہ بل ایک ایسا قانون ہو جس کی ضرورت ملک کو بہت عرصے سے ہو۔

”میرا اپنے ذاتی تجربے کی وجہ سے یہ خیال ہو کہ بڑے بڑے شہروں میں حقوقِ استفادہ بڑی قدر و

قیمت کے حقوق خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے اکثر مقدمات بازی ہوتی ہو۔“

اس بحث کے آخری حصے میں یہ بھی بتایا ہو کہ حقوقِ استفادہ اہل اسلام کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہو بلکہ یہ وہی جو جن کو فقہائے اسلام نے حقوق کے نام سے تعبیر کیا ہو۔

باوجود اس کے کہ سرسید انگریزوں کو ہندوستانیوں سے ممتاز قوم سمجھتے تھے لیکن انھوں نے قانون

کے مقابلے میں ہمیشہ دونوں کو برابر اور ہم رتبہ سمجھا۔ حکومتِ ہند نے انگریزوں کو ضابطہٴ فوج داری میں

ایک امتیاز دے رکھا تھا مگر سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ سنہ ۱۸۸۳ء میں مسودہٴ قانونِ ترمیم

مجموعہٴ فوج داری پر ایک طویل بحث کرتے ہوئے یہ بتایا کہ قانونی حقوق کے معاملے میں قانون کی نگاہ

میں قوم و مذہب کے امتیازات کی کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں حکومت نے ہندستان کے تمام

باشندوں کو ہندو کیا مسلمان کیا انگریز سب کو مساویانہ حقوق دینے کا اعلان کر کے دنیا کی تاریخ میں ایک

مثال قائم کی ہو وہاں قانون کی نظر میں انگریز کو بزرگی عطا کرنا انصاف کے خلاف ہو۔ اس طرح کا امتیاز

کسی قوم کو دے دینا آپس کے تعلقات کا خراب کرنا ہو۔

”انگریزی حکومت کے ڈپٹی سوبرس گزر جانے سے ہم اب شائستگی کے اس درجے کو پہنچ گئے ہیں

جب کہ قومی امتیازات کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔“

## (۷) سر سید کی متفرق تقریریں

سر سید کی متفرق تقریروں میں سوائے دو ایک کے سب کی سب وہ صریح تقریریں جمع کی گئی ہیں جو انہوں نے مختلف ایڈریسوں کے پیش کیے جانے پر کی تھیں۔ سر سید نے اپنی طبیعت کے جوش اور مختلف کاموں کے کرنے کی لیاقت کے باعث قوم کی درستی کے لیے اتنے کثیر کام انجام دیے اور قوم کو اس قدر ابھارا کہ سارا ہندوستان انہی کی تحریکوں سے گونج اٹھا اور پھر ایک حقیقت ہو کہ قوم کے تعمیری کام میں از ابتدا تا انتہا انہیں کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ مولوی حالی کہتے ہیں :-

”سر سید کو اس سمار کی طرح جو تعمیر کئے لیے آپ اپنی انیشیں یکائے، آپ ہی سالہ تیار کرے، آپ ہی

ماہ ہند سے آپ ہی ٹوکری بھڑے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی سمارت چنے ایک سر اور ہزار

سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔“

مسٹر آرنلڈ نے سر سید کی وفات کے بعد اپنی ایسیج میں یہ مقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے :-

”دنیا میں بڑے آدمی کثرت سے گزرے ہیں مگر ان میں سے ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ

یرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم

کا سوشل ریفرمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔“

ان تمام اوصاف کے ہونے کے بعد قوم سے یہ نامکن تھا کہ وہ سر سید کے مختلف احسانات کو فراموش کرتی۔ ساری قوم میں عام اس سے کہ وہ ہندو بھول یا مسلمان۔ ہر جہان کی قومی کسی، مذہبی خدمات اور دیگر اصلاحی کاموں کا اعتراف کیا گیا اور مختلف جماعتوں اور انجمنوں نے ان کی سالیں میں ایڈریس پیش کیے ذیل میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان ایڈریسوں کے بعض حصے اور اس کے ساتھ سر سید کے جوابات درج کریں تاکہ سر سید کے بعض ان مشہور و مقبول کاموں پر روشنی پڑ سکے جو ان کی زندگی ہی میں قوم

نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھ لیا۔

ان ایڈرسوں کے مطالعے میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والے اور سرستہ مرحوم کی عظمت کو دلوں میں منقش کرنے والے وہ الفاظ ہیں جن میں قوم نے ان کے فنانی القوم ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ انجمن مفید عام لودھیانہ نے اپنے ایک ایڈریس میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں :-

”بغیر کسی مبالغے کے کہنا درست ہے کہ انھوں نے فنانی القوم کا رتبہ اپنی ذات کے لیے خاص کر لیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے سامعین کے سامنے بھی ایک تازہ واقعہ ظاہر کروینا کافی ہوگا کہ انھوں نے جناب نواب گھنیز تہزل بہادر وائسرائے ہند کی کونسل کی ممبری سے بہ عذر عید الفرمی تار پر استعفا دے کر اس فقرے کا کوئی بھی مستثنیٰ باقی نہ رکھا تھا کہ ”حضرت کے تمام اوقات صرف قوم کی خدمت اور ہم دردی میں صرف ہوتے ہیں۔“

آگے چل کر ارباب انجمن کہتے ہیں :-

”ستہ صاحب، گو یہ اعتبار لقب آپ کو بخم الہند کہا جاتا ہو لیکن آپ نے اس بر اعظم کے باشندوں کی طبیعتوں کو اپنے نورانی خیالات کی کرنوں سے روشن کرنے کے سبب نہ ستارہ ہند بلکہ نیر اعظم ہند ہونے کا واقعی منصب حاصل کیا۔“

اس قسم کی تعریفوں کا سرستہ اس طرح جواب دیتے ہیں :-

”اگر میں نے قوم کی کوئی خدمت ایسی کی ہو جس کو قوم پسند کرتی ہو تو میری نسبت صرف اسی قدر کہا جاسکتا تھا جتنا کہ ایک آقا اپنے خادم کی خدمت سے خوش ہو کر اس کو کچھ کہتا ہو۔“

ایک اور جگہ قوم کی حق شناسی پر اس طرح گویا ہیں :-

”ہماری قوم میں اب یہ بات پیدا ہو چلی ہو کہ وہ جس شخص کو اپنے خیال میں ملک کی بھلائی یا قوم کی خیر خواہی کرنے والا سمجھتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں مگر اس جوش سے جو اس وقت ظاہر کیا گیا ہو، میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس عزت کے مستحق ہوں گے۔“

صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی سرستید کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں طلباء جانندھرا سکول کی جانب سے ایک ہندو لڑکے نے اپنے ایڈریس میں لکھا ہے :-

”جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک خاص نسل کے ہی مددگار نہیں ہیں کہ وہ جب ماہ کشیش چندر سین اور سری سوامی دیانند سرستی کے پیروں کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ خاص مسلمانوں ہی کے معاون نہیں ہیں بلکہ وہ کل ملک کے مددگار کل ہندوستان کے ہاں تار ہیں۔“

انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسے میں اس کے پریزیڈنٹ دیل سنگھ اس طرح تم طراز ہیں :-  
”آپ واجبہ طور پر رعایاے ہندوستان کے تمام فزق کی طرف سے قدر و منزلت و احسان مندی کے مستحق ہیں۔ ہماری ایسوسی ایشن جس میں اس صوبے کے تمام اقوام، مذاہب کے لوگ شامل ہیں، نہایت خوشی سے آپ کی ان اعلیٰ رتبے کی خدمتوں کی تصدیق کرتی ہے جو آپ نے عام کے حق میں کی ہیں۔ آپ کا پرتاؤ ابتدا سے انتہا تک تعصب یا خود رای کے دھبے سے بالکل مبرا رہا ہے۔“  
سرستید کی متحدہ قومیت کی مساعی جملہ کی تعریف یوں کی گئی ہے :-

”ہمارے وہ بزرگ آج ہمارے سامنے موجود ہیں جو تھوڑا عرصہ گزرا کہ مقام پٹنہ میں ایک بے غمضہ کے سامنے بہادری بلند ہندو اور مسلمانوں کو ہندوستان کی وطن کی دوسیلی آنکھیں قرار دے کر اس کی خوبی اور قدر و منزلت کے لیے یہ ضروری تصور فرماتے تھے کہ برابر دونوں کی خور و پرداخت رہے برابر دونوں کو فروغ ہو۔“

سرستید کا بلند ترین مقصد علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام اور اس کا استحکام تھا۔ اس عظیم کام میں جو صوبتیں اور محنتیں سرستید نے کھینچیں اس کو قوم تسلیم کرتی ہے اور اس کو قوم کی ترقی میں ایک دلیل راہ اور قومی زندگی کے سمندر میں ایک منارہ تصور کرتی ہے۔

”آپ نے مدرستہ العلوم کی نگرانی میں گرمی کی دھوپ اور سرا کی سردی اٹھائی۔ حالت پیری ہیں بھی آپ نے قوم کا غم کھایا۔ آپ کی قومی محبت کی یہ یادگار ہمیشہ سحر روزگار رہے گی۔“

”مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنا اور اس کا عدم سے حالت موجودہ تک پہنچنا اور اس کی آئندہ ترقی میں بدول و جان ساری رہنا قوم پر وہ بھاری احسان ہو کہ نہ صرف موجودہ مصلوں کے لیے بلکہ ابد الآباد تک قوم کی خوش حالی — روحانی نعمتوں کا ذخیرہ لازوال آپ نے جیتا کر دیا۔“

”آپ نے ایسا دارالعلوم بنایا جس کو قوم کے لیے تمام ترقیوں کی بنا اور تمام کمالات کی بنیاد تصور کرنا چاہیے۔“

سرسید اس کا جواب یوں دیا کرتے :-

”آپ نے مدرسۃ العلوم کا کچھ ذکر کیا ہے اور میری کوششوں کا کچھ بیان کر کے مجھ کو اس کا بانی قرار دیا جو مگر حقیقت میں میر اس کا مستحق نہیں ہوں۔ کیوں کہ میں نے تنہا کچھ نہیں کیا اور نہ کر سکتا تھا اس تعریف کے مستحق اور بانی ہونے کے لقب کے اور بہت سے لوگ مستحق ہیں جنہوں نے اس میں کوشش کی اور مدد دی۔“

سرسید کی دیگر ترمیمی، ملکی اور مذہبی خدمات کا بھی قوم نے ہر وقت اقرار کیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو -  
کونسل کی ممبری کے متعلق :-

”آپ نے ممبر کونسل ہونے کے زمانے میں بھی قوم کو فراموش نہیں کیا۔ ٹیکہ اور قاضیوں کا ایکٹ اس امر پر کافی دلیل ہے۔“

”ممبر کونسل ہونے کے زمانے میں جو رائیں ملکی معاملات میں آپ ظاہر فرماتے رہے ہیں اکثر اہل ہندو ان کی قدر کرتے رہے ہیں بلکہ بعض ہندو اہل الرائے اپنے ہم مذہب ممبروں پر آپ کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔“

”ہم اسے بچپن کرڈر ہندوستانیوں کے وہ فصیح البیان خیر خواہ کنج بہاں تشریف فرما ہیں جو اپنے ملک کے وکیل جوکر کونسل ہال میں کمرے ہو کر بے دھڑک اپنے بے زبان موکلوں کی وکالت کرتے تھے۔ ان کے متوق کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلاتے تھے۔“

”ہندستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اس کی نسبت یہاں سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہو اور آپ ہو اس زمانے میں جب کہ آپ مجلس مذکور میں کام کرتے تھے بلطفِ دارانہ طہ پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دیرری اور راست بازی کے ساتھ اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مضامین کا خیال رکھتے تھے۔“

سرستید کا جواب :-

”جس زمانے میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم (یعنی ہندستان) کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔ مجھے اس بات سے نہایت مسرت ہوتی ہو کہ آپ میری ناچیز خدمتوں کی اس قدر وقعت کرتے ہیں۔“

تحریریں اور تقریروں کے متعلق اعتراف :

”وہ پتے خیرخواہ ہمارے سامنے موجود ہیں جو اپنے قلمِ جادو رقم سے لارڈ مکالے کی روح میں جان ڈالتے ہیں اور اپنی تحریروں سے ان لوگوں کی تحریروں اور تقریروں کو مدد کرتے ہیں جو اہلِ منہ کی تعلیم کو مشرقی علوم کی مستند کتابوں اور پرائے اور نامکمل خیالات پر محدود رکھنا چاہتے ہیں۔“

”اپنی تحریر و تقریر کے پرزور اثر سے ہندو مسلمان بلکہ بڑے بڑے مقتدر فاتح قوم کے اراکین سے بھی بلا قیدِ مذہب چندہ لے کر مقامِ علی گڑھ میں عالی شان اور مشہور و معروف کالج قائم کیا۔“

سرستید کا جواب :-

”آپ نے اپنے ایڈریس میں میری پچھلی تصنیفات کا کچھ ذکر کیا ہو وہ میری تصنیفات اس سے زیادہ کچھ مرتبہ نہیں رکھتی تھیں جو ایک طالبِ علم اپنے زمانہ طالبِ علمی میں اپنے کچھ علم اور کچھ زبان میں کچھ لکھتا ہو لیکن آپ نے اس کی بھی قدر کی میں اس کا شکر گزار ہوں۔“

”آثارِ الصنادید“ کے ذکر پر سرستید کا جواب :

”وہ کتاب ”آثارِ الصنادید“ ہو جس میں دلی کی پرانی عمارت کا عالی شان مکانات کا اور ان کے کتبوں کا ذکر ہو۔ یہ وہ یادگاریں ہیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں جن سے ان کی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی مگر اس زمانے میں وہ سب افسوس اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لائق ہیں۔ مگر ہماری قوم کے لوگ اس کو توجہ سے پڑھیں گے اور اس سے عبرت پکڑیں گے۔“



”رسالہ اسباب بغاوت“ کے ذکر پر سر سید کا جواب :-

”غدر کے حالات پر میں نے لکھا تھا اس سبب سے کہ میں بھی ہندوستان کا باشندہ ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جو غلط خیال ہندو کے دلوں میں اس خراب زمانے کی نسبت جم گئے تھے ان کو مٹاؤں اور سچے واقعات ظاہر کروں۔“

”تہذیب الاخلاق“ کے ذکر پر سر سید کا جواب :-

”تہذیب الاخلاق“ کا پرچہ ابتدا میں اسی واسطے جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مُردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔ اس نے اپنا کچھ کام کیا۔ اب تحریک پیدا ہو گئی ہو۔ ہندوستانیوں کی زبانوں اور قلوبوں سے قوی ترقی اور ہم دردی کے الفاظ نکلنے لگے ہیں۔“

مذہبی خدمات کی تعریف پر سید صاحب کا جواب :

”میں نے یہ کوشش بین دو دنیا میں کسی صلہ پانے کی امید پر نہیں کی ہو۔ میرا قدرتی جوش اس کا متقاضی تھا کہ میں اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کوشش کریوں۔ جو لوگ گالیاں دیتے ہیں، جو لوگ تکلیف دیتے ہیں، جو لوگ بُرا کہتے ہیں میرا جوش بڑھتا جاتا ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتے۔“

انجی ایڈریسوں کے سلسلے میں ہم سر سید کے انتہائی خلوص کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ایڈریس میں جب سر سید کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے کہ :-

”جو جو کوششیں آپ نے ہماری قوم کی بھلائی کے واسطے کیں اس کے شکریہ ادا کرنے کے واسطے ہم کو الفاظ نہیں ملتے اور ناممکن ہو کہ کسی طرح ہم اس کا صلہ ادا کریں بجز اس کے کہ ہم دعا مانگیں کہ خدا اس کا صلہ آپ کو دے۔“

سید صاحب نے آپ دیدہ ہو کر کہا :-

”مجھ کو اس کا صلہ نہیں چاہیے۔ خدا اس کا صلہ قوم ہی کو دے۔“

انجمنوں کے قیام کے متعلق :-

”سید صاحب، ہند کی انجمنوں نے جو آپ کے ہی مقدس ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے

ہیں، اپنی اپنی لیاقت کے موافق آپ کی خدمت میں اڈریس پیش کیے ہوں گے اور کرسٹے ہیں مگر حق یہ ہو کہ نہ آپ کی عنایت اور اوصاف کا بیان اس میں ہو سکتا ہو نہ ہوا اور نہ آپ کی ذاتِ بابرکات اس کی محتاج ہو۔“

سب سے متاثر کن عورتوں کے وہ جذبات ہیں جن کو انھوں نے ایک ایڈریس میں ظاہر کیا جو جس میں ہندو اور عیسائی عورتیں بھی شامل ہیں۔

”سید۔ آج وہ دن ہو کہ ہم اپنی بے بسی اور قوم کی حالت دیکھ کر آنسوؤں کو ضبط نہیں کر سکتیں۔ اسی خدا ایک وہ زمانہ تھا کہ خاتونانِ عرب دہند اپنے گھر کے مردوں کی قوی ترقی اور تعلیم کے معاملات میں اس قدر حوصلہ اور ہم ددی ظاہر کرتی تھیں آج ہم جو انھی کی اولاد ہیں ایک بزرگ محسن قوم کے شریکے کے لیے چند موزوں الفاظ بھی نہیں سوچ سکتیں۔“

جوابی ایڈریس میں سر سید نے اس طرح شروع کیا :-

”آج کی رات میرے لیے شبِ قدر سے کچھ کم نذر کی نہیں۔ جو ایڈریس تمھاری طرف سے مجھ کو دی گئی وہ میرے لیے ایک عزت ہو جو آج تک ہندستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی تمھاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔“

”اومیری ہندو اور عیسائی بہنوں تم نے جو اپنی محبت اور وطنی چٹانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے عزیز طالب علموں کو دی گئی ہو شرکت کی وہ ایک نمونہ تمھاری محبت و چٹانگت کا ہو۔ میں دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

بعد از قرونِ اڈلا کس نے کیا بتاؤ

سید نے کام آکر جو قوم میں کیا ہو (دہلی)

حالی کی حیاتِ جاوید سر سید کی زندگی کا ایک ایسا رکارڈ ہو جس پر اب تک اضافہ نہیں کیا **خاتمہ** گیا۔ سید کی حیات کے اکثر واقعات اور بڑے بڑے کام حالی نے اس بے مثل سوانح عمری میں درج کیے ہیں۔ باوجود اس کے سر سید کے اندرون اور اصل طبع کے عمق میں رسائی پانا ایک

وقت طلب امر ہو۔ حیاتِ جاوید تو کیا خود سرسید کی تمام تعانیف سرسید کو بے نقاب کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی ”اثرالنسادیہ“ دلی کے کھنڈروں پر ایک تحقیقاتی کام ہو جو مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ یاد دلاتی ہو۔ ”تاریخِ بجنور“ اور ”رسالہ اسبابِ بغاوت“ مسلمانوں کو حکومت کے خلاف باغی ہونے کے الزام سے بری کرتی ہو۔ ہنٹر کی کتاب کا جواب بلادِ مغرب میں مسلمانوں کا صحیح موقف معلوم کرنا ہو اور ان کی تفسیرِ قولِ حالی مسلمانوں کا جدید علمِ کلام ہو۔ مگر ان میں سرسید کی تصویر صاف طور پر نظر نہیں آتی۔ البتہ سرسید کے لکچروں میں سید صاحب اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہیں۔ گو حیاتِ جاوید سرسید کو کھولنے کی ایک کلید ہو لیکن حیاتِ جاوید میں ایک دوسرا شخص ان کے گمن گار رہا ہو اور سرسید کے لکچر ان کے دل کا منوج ہیں۔

حالی کا منشا یہی تھا کہ وہ سید کی قائدانہ شان اور ان کے کمال کو پوری آب و تاب کے ساتھ لوگوں پر عیاں اور واضح کر دیں۔ انھوں نے سرسید کی ”ان تمام جولانیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیان کیا جو سرسید نے سیاسی، لٹری، اور مذہبی خدمات کے میدان میں سرانجام دیں لیکن ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ”حیاتِ جاوید“ میں سرسید ہم کو ایک واسطے کے ساتھ نظر آتے ہیں اور اپنے لکچروں میں ہو پڑے۔ حالی کہتے ہیں کہ سرسید نے فلاں فلاں قومی و مذہبی خدمات انجام دیں اور سرسید اپنے لکچروں میں اپنی آواز سے ان خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ حالی نے کہا ہو کہ سرسید سیاست کے مرد میدان تھے لیکن وہ خود بنفس نفیس میدانِ سیاست اور قانونی مجلسوں میں بڑے شور سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نہض اگر سرسید کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنی ہو تو ہمیں ان کے لکچروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ خطوط کے متفق عام طور سے یہ بات چل چکی ہو کہ وہ کاتب کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کاتب کی سچ دمج اس کی طبیعت کے خط وخال اور ان کی سیرت کے تیور ان میں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خطوط میں بے نقاب ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزی ادیب اور عالموں کے ادبی خطوط مثلاً سودے Southey

کوپر Cowper اور مکالے Macaulay کے مکاتیب کے دیباچوں میں اسی قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں اور ان کا بیان کرنا کچھ فیشن میں داخل ہو گیا ہو۔ ہمارے ملک کے انگریزی داں

حضرات ان دیباچوں کو پڑھ پڑھ کر ان کے مطالب کو اُردو کے خطوط پر صادق کرتے ہیں۔ غالب کے رعات کے دیباچوں میں یا مولوی حالی کے مکاتیب کے مقدمے میں بے سوچے سمجھے اور یورپین مصنفین کی تقلید میں اسی قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہو کہ غالب کے خطوط میں ان کا دل لطیف ہو اور کوئی حالی کے مکاتیب میں یہ فرماتا ہو کہ اگر ان کے دل کا دیوتا دیکھنا ہو اور اس کی پرستش کی خواہش ہو تو ان کے مکاتیب کے جملہ میں داخل ہونا چاہیے۔ ایسے بیانات میں کچھ نہ کچھ صحت پائی تو جاتی ہو مگر ہمارے نزدیک وہ مبالغہ اور بے جا تحیل سے پاک نہیں۔

خطوط خواہ کیسے ہی برجستہ لکھے جائیں ان میں دل ضرور لگایا جاتا ہو اور قلم بھی سنبھالا جاتا ہو اور جب ایسا ہو تو بناوٹ اور تصنع کی راہیں کھلنے لگتی ہیں اور خود کاتب چُپھنے لگتا ہو مگر تقریریں ان عیوب کا آنا شکل بلکہ محال ہو۔

یہی حال سر سید کے لکچروں کا ہو جس میں سر سید بے حجاب ہیں۔ لکچر پڑھتے پڑھتے لکچرار کی نبض ہاتھ میں آجاتی ہو۔ ممکن ہو کہ ایک دو لکچر میں کسی کی شخصیت نمایاں نہ ہو لیکن یہاں تو لکچروں کا ایک وافر ذخیرہ ہو جس میں سر سید کا پورا اندرون مقید و محفوظ ہو۔ ان کے برجستہ حالات کو دیکھنا ہو تو اسی میں دیکھنا چاہیے۔ ان کے احساسات و جذبات ان کے جوش و خروش اور قوم کے ساتھ محبت و ہم وردی۔ ان کی بے تکان سماعی اور مسامحی کی صداقت و خلوص غرض سر سید کو ہم جس طرح چاہیں ان کی تقریروں میں سمجھ لے سکتے ہیں۔

## کتابیات

- ۱۔ مجموعہ لکچرز سر سید -
- ۲۔ حیات جاوید (حالی) -
- ۳۔ تواریخ کانگریس -
- ۴۔ میری کہانی (جواہر لال نہرو) -

(۵۱)۔ حیاتِ سعدی (عالی)

(۵۲)۔ مضامین شرر۔

(۵۳)۔ لکچر سید محمود (سنہ ۱۸۹۳ ع)

(۵۴)۔ رسالہ اُردو۔ جلد دوم جنوری سنہ ۱۹۲۲ ع۔

(۹)۔ **Effective Speeches by Dwight E. Watkins. A. M.**

Professor. California University.

(۱۰)۔ **Sir Syed's Life & Work by Graham Baily.** (۱۱) **Encyclopedia Britanica.**

(۱۲)۔ **Life of Macaulay by Traveyan.**

**Induence of English Literature on Urdu Literature, Dr. Latif.**

## نشی اقبال و رما سحر ہنگامی

( یہ قلم جناب بابو راج بہادر ملگوڑہ ایم اے، ال ال بی )

سحر جی کی وفات ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو اتنی مختصر علالت کے بعد یکایک ہوئی کہ بہت سے ارمان جیوں کے تیوں رہ گئے۔ میں آخری ملاقات کے لیے نہ پہنچ سکا اور نہ مرحوم کی کسی ادبی وصیت سے بہرہ ور ہو سکا۔ انھیں خود بھی کوئی گمان موت کا نہ تھا ایک ہفتہ قبل جو دستی رقعہ مجھے ملا تھا اس میں وہی ادبی دل چسپیاں، وہی علمی یاد دہانیاں تھیں گویا دنیا سے علم و ادب کے باہر نہ کوئی زمین ہو نہ آسمان، نہ کوئی پیشہ ہو نہ مشغولیت۔ شکوہ تھا تو بھی وہی کہ ماڈھری بھیجنا غالباً ایڈیٹر صاحب نے ناخوشی کی وجہ سے بند کر دیا۔ مانگ تھی تو اسی کی کہ پڑھنے کے لیے بھیج دوں۔ جواب بھی میں نے وہی حسب عادت دیے تھے کچھ وعدے کیے، کچھ معذرتیں۔ پر کیا سمجھتا تھا کہ یہ آخری رقعہ ہو، انھیں تو یادگار کے طور پر رکھ ہی لیتا۔

ہم دونوں سنہ ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء میں ہم سبق رہے تھے اور دونوں نے گورنمنٹ اسکول فتح پور کے فٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کیا تھا۔ پنڈت سری دھرا دگورے کا مبارک باد دینے والا فقرہ ہم دونوں کو کبھی نہیں بھولا:-

“Both the Bahadurs have passed in the first Division.”

گویا اسی اتفاق نے ہی ہماری ادبی زندگیوں کو توأم کر دیا اور ایک دوسرے کا اتنا رفیق و ہم دم و ہم راز بنا دیا کہ مجھے تو سحر کے بغیر ادبی زندگی دوجہری معلوم ہو ہی ہو۔ خود مذاق نہیں کرتے تھے مگر

بچ ہر وہ فطرت سے سبق حاصل کرنا چاہتے تھے، اور ان کی فطرت ہی ان کی مسلم تھی۔ پھر تعلیم کی بندشوں سے ان کو کیوں نہ اُٹھن ہوتی۔ دنیائے ادب میں درس گاہوں کے بھگوڑوں نے اکثر نام کیا ہے۔ انگریزی ادب میں بھی شیلی اور بائرن اس کی مثالیں ہیں۔ انٹرنس تک کی تعلیم بھی منشی — مرحوم اور ان کے لڑکے کنور بہادر صاحب وکیل کے دباؤ اور کوشش کا نتیجہ تھی۔ بابو کنور بہادر صاحب سحر جی کے پھوپھا زاد بھائی ہیں۔ اور بہ عمر قریب ستر سال فتح پور کے نام آدر وکیل ہیں۔ دونوں بھائیوں میں ایسی محبت رہی ہے جو حقیقی بھائیوں میں بھی کم دیکھی جاتی ہے۔

حساب سے سخت اُٹھن تھی۔ لیکن ادبی دل چسپی شروع سے ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میرا ساتھ سنہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوا۔ کتنے ہی دیوان ہم لوگوں نے منگائے اور پڑھے۔ مومن سے اس وقت سحر جی کو خاص دل چسپی تھی۔ لیکن بعد کو غالب ہی کے دل دادہ رہے، گو مومن کے تغزل کی تعریف ہمیشہ کرتے تھے۔ انگریزی میں اس وقت رینالڈس کے ناولوں کے پڑھنے کی مومن تھی۔ میں نے کبھی کبھی آدھی رات تک مٹی کے تیل کی ڈبی (دلپ نہیں) کی دھیمی روشنی میں انھیں باریک حروف کے رینالڈس کے ناولوں کو اس محویت کے ساتھ پڑھتے دیکھا ہے کہ انھیں دنیا کی خبر نہیں رہتی تھی۔ امتحان کے قریب بھی ایک پارسل آیا تھا۔ بابو گریش چندر دیب صاحب ہیڈ ماسٹر کو شک ہو گیا اور انھوں نے پارسل بھین لیا۔ کھول کر دیکھا تو رینالڈس کے ناول تھے۔ ہنس کر کہا کہ ”اقبال بہادر! تمہارا خط امتحان کے قریب بھی بند نہ ہوگا۔ اچھا۔ امتحان تک یہ کتابیں ضبط۔“ اسی خط کا اثر یہ تھا کہ انگریزی کی قابلیت اچھے گریجویٹ سے کم نہ تھی۔ میری عادت عجلت کے ساتھ لکھنے کی ہے۔ اور عجلت میں سہو ہو جانا کون مشکل ہے؟ اسی لیے میں اپنے انگریزی مضامین کو بھی ان کے حوالے کر دیتا تھا کہ ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ غلطی پاکر ہنس دیتے تھے اور کہتے تھے۔ ”جناب تمہیں کس نے انگریزی ایم۔ اے کی ڈگری دے دی ہے۔ ایسی ٹھوکر لیتے ہو کہ خدا حافظ۔“ میں نے بھی جواب گھڑ لیا تھا اور کہہ دیا کرتا تھا ”قلم ہو منشیوں کا یا کوئی رہ دو ہے بیڑ کا۔“ بھائی! بگ ٹنٹ دڈ میں ٹھوکر لینا کیا مشکل ہے۔ جاے استاد خالی ست۔“

شاعری کا آغاز | شاعری بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ اور اسی لیے مولوی رضی الدین صاحب ہیڈ

مولوی، سحر جی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ہاں خود پسند طبیعت نے کسی کا تلمذ کبھی گوارا نہیں کیا۔ اصلاح تو مولوی رضی الدین صاحب سے اور خاص کر مولوی فضل حسن صاحب ہنگاہی سے اکثر لے لیا کرتے تھے۔ فاری کی مہارت بھی خاصی تھی۔ حوصلہ افزائی کے طرز پر مولوی رضی الدین صاحب کہا کرتے تھے۔ ”منشی جی آپ کے ترجمے پر قلم لگانا تو مشکل ہے۔ مشورے کے طے پر کچھ اصلاح تجویز کرتا ہوں، مناسب ہو تو کر لیجیے۔“ ایسے فقرے یاد کر کے ہم دونوں کی آنکھوں میں اب بھی اکثر مولوی صاحب کو یاد کر کے آنسو بھرتے تھے کہ موجودہ زمانے میں اب ایسے استاد کہاں؟

اس زمانے میں قصیدہ لکھنے سے بھی عار نہ تھا۔ حالانکہ بعد کو قومی خیالات اور حب الوطنی کا جوش اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کسی حاکم دغیرہ کی مدح سراہی گوارا نہ تھی اور بہت اصرار پر بھی ٹال جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں جو قطعہ پرنس آف ولز (ملک معظم جارج پنجم آں جہانی) کی تشریف آوری پر لکھا تھا اس کے چند شعر یادداشت سے اپنے خود نوشت حالات میں بھی لکھے ہیں سے

ہر ہزم میں ہو دھوم ترے آنے کی شاہ	ہر سمت نگاہوں میں کھلا جلوہ راحت
وزارتِ زمیں مرد کب چشم بنے ہیں	ہر نقشِ قدم آنکھ ہو ہنگامِ سیاحت
تاروں کو منظم ہو سپیدی سحر کا	رکتا ہو ترا حُسن صبح ایسی صباحت
تو صاف دلی سے ہو اگر داغِ زشتی	اندازِ لطافت سے بدل جائے قباحت
تو شورشِ دریا کو جو دریا سے کرے سلب	مصری کا ذخیرہ ہو ہر اک کا بنِ ملاح

طبیعت کی جدت کے ساتھ زبان کی صفائی کس قدر صاف جھلک رہی ہے۔ ہونہار برداں کے ہوت چیکنے پات۔

میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ ہنس مکھ بہت تھے۔ ابتدائے زمانہ میں ان کے ہنسی خوشی میں شریک دوستوں میں بچو بابا (منشی رام نراین) اور چند کا چاچا بہت ہی عزیز تھے۔ اکثر ان کے آپس کے مذاق کے لطیفے اب بھی سنایا کرتے تھے۔ اور ہتھبہ لگا کر ہنسا کرتے تھے۔ بچو بابا پر تو ایک مذاق کا قصیدہ بھی اسی زمانے میں لکھ ڈالا تھا۔ جس کے چند اشعار مجھے یاد ہیں سے



خاک اُلاتی ہو ہر قدم پر ڈھیر      وہ حضرت کی شوخی رفتار !

چوک میں یوں بگاہ چلتی ہو      جیسے میدان جنگ میں تلوار

سر بڑا قد پہ یوں ہوا موزوں      جیسے سوتلے پہ ہو گھرے کا بھار

عمر کا تقاضا تھا۔ عشقیہ مضامین اور غزلیں بھی لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ بعد کو جب آریہ سماج کے بانی رشی دیانند کا اثر غالب ہوا تو قدرتا تعزّل میں ایک اخلاقی دھبہ نظر آیا۔ اور پہلے کے کلام کو چاک کر ڈالا۔ اسی زمانے میں گلزارِ نسیم کے طرز پر ایک شہسوار لکھی تھی۔ جس کے متعلق خود نوشت حالات میں خود تحریر فرماتے ہیں :-

سنہ ۱۹۰۹ء میں سنسکرت کے زندہ جاوید شاعر کالی داس کے مشہور و معروف ناولگ شکنتلا کے ترجمے کو

ختم کیا جو پہلے سنہ ۱۹۰۹ء میں زمانہ پریس کان پور، بعد ازاں سنہ ۱۹۲۵ء میں ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع

ہوا تھا۔ حقیقتاً اسے ترجمہ نہیں بلکہ ایک ایسی طبع زاد شہسوار کہنی چاہیے جو اس ناولگ پر مبنی ہو۔

مجھے اس شہسوار کے متعلق زیادہ وضاحت کے ساتھ آگے چل کر لکھنا ہو کیوں کہ اسی نے تہجری کو خود زندہ جاوید بنا دیا ہو۔ اس لیے یہاں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں ایک طرف آریہ سماج کا اثر یہ ہوا کہ تہجری کے حسن و عشق پرست مزاج کو ایک سادگی پسند سنجہ اور نیم سے منظم سچے آریہ اخلاق میں بدل دیا، وہاں ان کے مزاج میں خشکی پیدا کر دی، جس نے ان کی شامی پر بھی اثر کیا۔ اور پھر وہ ایسی دوسری شہسوار نہ لکھ سکے۔

اسی انقلاب کا اثر تھا جو تہجری اپنے خود نوشت حالات میں فرماتے ہیں کہ ”بہت سا ابتدائی کلام چاک کر ڈالا، جس کا اب انوس ہو۔“ وہ شہسوار بھی چاک کیے ڈالتے تھے مگر میں نے جین لی اور دوستانہ سنجی کے ساتھ کہا۔ ”بھائی۔ سماجی ہو جانے کے معنی خطی ہو جانا نہیں ہیں۔ کیا سوامی جی نے راماین اور مہابھارت کا احترام کرنے کو نہیں کہا اور کیا تمھاری شہسوار کا اصلی قصہ مہابھارت میں موجود نہیں ہو۔ یاد رکھو۔ اس شہسوار پر تمھاری شہرت کا دار و مدار ہوگا۔“ بہت ناخوش ہونے پر بھی ساہا سال تک اسے اپنے پاس رکھا۔ سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں جب میں دہرودون میں ڈی۔ اے۔ دی ہائی اسکول کا اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھا تو سخن فہم ڈاکٹر سری رام سے کچھ ادبی دوستانہ ہو گیا تھا۔ انھیں میں نہایت ذوق و شوق سے شہسوار مذکور سنایا کرتا تھا۔

ان پر تو ایک مجذوب کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی اور ان کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی تھیں۔ وہ کہتے تھے بھائی اسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور کہتے تھے کہ شہزی میں نیم کا طرز نکھار دیا گیا ہے۔ اس میں تو دہلی اور کھنؤ کا مشترک رنگ ہے۔ دونوں جگہ کی زبانوں کی خوبیاں موجود ہیں۔ مگر نقائص میں نہ تو کھنؤ کا تصنع ہے اور نہ دہلی کا اکھڑ پن۔ میں نے وکالت سنہ ۱۹۱۴ء میں شروء کی اور تب انھیں وہ قلمی نسخہ واپس کیا۔ تب تک طبیعت میں اعتدال آگیا تھا۔ شاعری کا رخ اخلاقی ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن جذبات بھی کافی ابھر آئے تھے۔ اور مزاج کی خشکی بھی رخن ہو گئی تھی۔ میرے اصرار پر اس کی نظر ثانی ہوئی اور وہ چھپی۔ ان واقعات کو یاد کر کے مجھے خوشی ہے کہ اس بے بہا نظم کو میں تلف ہونے سے بچا سکا۔ اس شہزی کے تعلق کا ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ جب میں سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر آگرہ کے قیام کے لیے دہرہ دون سے آیا۔ اور منشی سرن شکر شائق صاحب اکبر آبادی کی شفقت برادرانہ کے زیر سایہ پھر رہنے کا موقع ملا تو اس شہزی کو انھیں بھی سنایا۔ وہ بھی مفتون ہو گئے۔ اور انھوں نے کل شہزی کا ایک نسخہ بھی صاف کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا جو اب بھی ان کے لڑکے کے پاس محفوظ ہے۔ دونوں میں پھر تو ایسی گہری ادبی دوستی ہو گئی تھی کہ خط و کتابت کے ذریعے سے بھائی سرن شکر صاحب اکثر اصلاح لیا کرتے تھے۔ اور جب ایک بار میں نے دونوں کو آگرہ میں بلایا تو شعر و سخن میں ہی دونوں نے قریب قریب رات کی رات گزار دی۔ شاعری کی دُنیا میں وقت کا اختیار کہاں؟ جگہ کی طرح غالباً شاعر بھی جب دُنیا سوتی ہے تب جاگتا ہے۔ اور شاید جب دُنیا جاگتی ہے تو سو جاتا ہے۔

دجہ تو اڈ پر لکھ ہی چکا ہوں اور ادبی دُنیا میں جہاں منطق |  
 شاعری اور ادبی دل چسپی میں انقلاب | کا زور ہوا کہ نشر نے زور پکڑا اور نظم کو نیچا دیکھنا پڑا۔

پیورٹن (Puritan) تحریک نے نائیک اور شاعری سب کو ہی دھکا پہنچایا تھا۔ آریہ سماج کا بھی یہی اثر ہوا۔ ہمارے ممدوح کی طبیعت پر بھی وہی انقلاب پیدا ہوا اور نشر کا آغاز ہوا۔ مگر شاعری ایک فطری جذبہ ہے، جسے دبانا بھی مشکل ہے اور جس نے پیورٹن زمانے میں بھی ملٹن (Milton) جیسا نام آور

شاعر پیدا ہی کر دیا اس جذبے نے گو طبیعت کا رجحان دیکھ کر نیا جام پہنا مگر اس نئے جامے میں بھی وہ پھولا نہ سایا کہ سحر کی جادو بیانی کا اُسے فائدہ مل گیا۔ تنزل کو خیر یاد کہ کر اب نظموں کی طرف رجحان ہوا اور نثر نگاری کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ سحر جی خود نوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔ ”غزل لکھنا قریب قریب ترک ہوا اور نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کم و بیش اب بھی جاری ہے۔“

مہرا برگزیدہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ نہیں آریہ سماج کی تحریک کے خلاف ہوں۔ میں تو اس کا دل دادہ ہوں۔ حالانکہ خود ساتن دھری ہوں۔ سوامی درشناند کے (پنشدوں کے ترجمے اور دیدانت بھاشیہ کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ سام دید کا میڈٹ۔ جو دیو شرما کا کیا ہوا ترجمہ تو میرے روز کے مذہبی مطالعہ کا جڑ ہے، اور شاید ۲-۳ مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ ہندی کا ستیا تھ پرکاش بھی تین مرتبہ پڑھا ہے اور دو مرتبہ انگریزی والا۔ سوامی جی کی زندگی کے حالات اور ان کی صداقت کی جستجو کی دہ سے میرے خیالات ان کے متعلق اس بات سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا نام بھی روزانہ رشی ترپن کے وقت لیتا ہوں۔ پنڈت گردوت کی کتابیں بھی احترام کے ساتھ پڑھی ہیں اور رگ دید بھاشیہ بھومکا نے جو انقلاب ویدک ترجمے میں کیا ہے اس کا بہت کچھ جزو میری نظر میں سوامی جی کی خاص عنایت تھی ورنہ دیدور کا ایک نسخہ ہی غائب ہو گیا ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اسے ایک ہی پہلو سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے ساتن دھرم کا نام دیا جاتا ہے۔ اول پوچھیے تو ناموں کا فرق ہی اختلاف کی جڑ ہے ورنہ دونوں ایک ہی مذہب کے دو رخ ہیں۔ جیسے کسی ڈھال کے دو پہلو یا کسی کتے کے دو رخ مگر میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا کہ یہ منطقی ادھیان کی تحریک بذاتِ کم اُس مُقت تک پہنچے کہ جہاں جاکر وہ بھی شمریت کے رنگ میں رنگ جائے ستیا تھ پرکاش کا ایک منظم ترجمہ سحر جی کے پاس آیا تھا تب انھوں نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی اور کہا تھا کہ بھائی، یہ تو کوری تک بندی ہے شاعری نہیں۔ اگر زندہ رہا تو سوامی جی کی سوانح عمری کو نظم کروں گا۔ مگر وہ وقت ہی نہ آیا اور سحر جی چل بے۔ پدم سنگھ جی شرما بھی آریہ سماجی تھے۔ لیکن شاعری کی دنیا میں وہ بہاری ہی جیسے مجنوںوں میں سے تھے۔

سنہ ۱۹۱۱ ع سے سحر جی کا کلام زمانہ (کان پور) اور ادیب (الہ آباد) میں شائع ہونے لگا۔ غزلیات

کے نمونے میں نہیں دیتا کیوں کہ وہ ان کی شاعری کا خاص جزو نہیں ہیں۔ اور ان کے غزلیات کے بہترین نمونے دی ہیں جو شنوی شکستہ کے اندر جا بجا موجود ہیں۔ ہاں۔ دو چار شعر البتہ یہاں دے رہا ہوں۔

۱۔ بکبل میں ہر جو نغمہ تو گل میں شمیم ہو      کتنا وہ بے حجاب ہو کہ حجاب میں

جب میں ایسے اشعار پر دوستانہ مذاق میں یہ فقرہ کستا تھا کہ آخر دیانت شاعری میں تو موجود ہی ہو تو مسکرا کر کہہ دیتے تھے بھائی دویت دیدانت نو سوامی جی نے مانا ہی ہو فرق اننا ہی ہو کہ ”ہم اوست“ ٹھیک ہو کہ ”ہم ازوست“ اور جب میں کہتا تھا کہ وہاں تو تین ہیں جیو، برہمہ اور پرکرتی، تو کہتے تھے کہ ایک دوسرے میں چلی دامن کا ساتھ سمجھو۔

۲۔ تری خوشی سے ہو دنیا میں اپنی آمد و رفت      نہ رنج ہو ہمیں آنے میں اور نہ جانے میں

اسے ان کے عقیدوں کا عطر سمجھیے۔ اتنے کٹر بھوک دادی تھے کہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس بات میں میں سوامی درشناند جی کا پیرو ہوں کہ انسان کو جو بھوگنا ہو وہ بھوگنا پڑے گا۔ اگر میں ٹوک دیتا کہ

پتا کہیں حکم بن ہلا ہو      بے وقت کسی کو کچھ ہلا ہو

تو بس یہی کہتے کہ اس میں صرف اتنا اضافہ کر دو کہ یہ حکم خدا اس کے انصاف اور ہمارے اعمال پر مبنی ہوتا ہو۔

۳۔ ہوتوں سے کام رہا آخری زمانے تک      خدا سے کام پڑا آخری زمانے میں

اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس میں انھوں نے دنیا کی دلاویزی کی گم راہی کو نظم کیا ہو جسے ہم سناتی مایا کہا کرتے ہیں۔ اور ایثار کا انصاف اسی کی سزا کی شکل میں ہماری پریشانی کا باعث ہوتا ہو جو آخری مصرع میں ایک عجب انداز سے دکھایا گیا ہو۔

۴۔ عیاں ہو مجھ پہ تعلق سے کل نظام کا حال      جو ایک راز ہو دنیا تو ایک راز ہوں میں

جب میں کہتا تھا کہ جو اندر جیو ہو وہی باہر برہمہ ہو تو کہہ دیتے کہ دراصل ”راز“ ہو کون جانے ہو کیا۔ آخر شاعر بھی تو علمی قیاس ہو۔ رہا شرقی وہاں بھی دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مجھے ٹیگور جی کی بات یاد آتی ہو کہ واقعی یہ ایک راز ہو، کیوں کہ مایا کا لفظ استعمال کرنے سے راز کھل تو نہیں جاتا۔ ہاں۔ تغزل

کے تصوف والے رُخ کی غزلوں کو پڑھتے اخیر تک رہے، اور ہمیشہ پسند کرتے رہے۔ دیوان حافظ کا ترجمہ کرنے کی بالکل ٹھان ہی لی تھی۔ اور یہ طو کر لیا تھا کہ اب کے جاٹوں میں دُلموں میں رو کر یہ کام کریں گے۔ مگر زندگی نے جواب دیا اور یہ ادبی خدمت باقی رہ گئی۔ کچھ زمانے سے تو تغزل کے جذبات اتنے ابھر آئے تھے کہ شاعری کی دُنیا میں بوشِ بلبلِ بہادی کے کلام پر فدا تھے کہ خوب لکھتا ہو اور بڑے مزے سے اکثر اشعار سُنا یا کرتے تھے۔

**نظمیں** | شروع میں مدرسے کے بھگیزو تو تھے ہی اس لیے مناظرِ فطرت سے زیادہ دل چسپی تھی۔ ان کے تخیل کی نشوونما بھی وہیں ہوئی تھی۔ جنگام کے چاروں طرف بہت دُور تک بلکہ یوں کہیے کہ ریلوے اسٹیشن کے مقام کھا کا تک ڈھاک کا جنگل زیادہ ہو اور موسمِ بہار میں جو فضا وہاں ہوتی ہو بیان سے باہر ہو۔ ”ٹیسو کے بن“ والی نظم سے دیکھیے۔

یہ ٹیسو کا سماں برگِ سبز کے رنگِ شامل سے  
نمایں ہو مگر گردوں سے ننھا سا دھنک کوئی  
کہ اک ننھا سا شعلہ منتقلِ آہن سے اٹھتا ہو  
یہ تیغِ خوں چکوں ہو یا کسی کے دستِ نازک میں  
زباں یا آشکارا ہو مسمیٰ مالیدہ ہونٹوں سے  
گہن کے رنگ میں یا مہرِ نور مبتلا ہو کر  
کھیدِ عیش بن کر یا ہو کوشاں ناخنِ قدرت  
شرابِ سُرخ یا نیم کے پیالوں سے چھلکتی ہو  
دکھانا ہو جہاں کو یا تماشا دلِ ربائی کا  
نظر آتا ہو چاروں سمت اک عالمِ چراغاں کا  
برستی ہو جوانی شاہدِ قدرت پہ سرتاپا  
تنبیہات اور استعارات کی افزائش آپ نے ملاحظہ کی گویا شاعری کی جوانی ٹیسو کے بن کی شکل میں نمودار ہو۔

شاعر کی طبیعت کے پیالے سے ”شرابِ سرخ“ کیسے جرعات بن کر چھلک رہی ہے۔ سچ ہو شاعر خود ”اہلِ نظر“ کے مانند ”رندانِ غافل“ کی طرح ”وجد میں ہو“ تغزل کا رنگ یہاں بھی پھوٹنا پڑتا ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ یہ رنگ بعد کو کچھ دب گیا۔ لیکن قدرت اور فطرت سے شاعر کا چولی دامن کا ساتھ ہو۔ وہ کیسے چھوٹتا؟ بیرہوٹی والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

اگر میرے چھوٹے سے کیڑے! کچھ کہے جا اپنا حال

کس کی دھن ہو؟ کیوں نہیں میری طرح تجھ کو قرار

اپنے قلبِ خوں چکاں کی آد تجھ میں ہو مثال!

شاعر نے ناصح بن کر اپنے سکون سے بیرہوٹی کی بے قراری کا تضاد دکھا کر اسے نصیحت کرنا چاہا۔ لیکن ذرا ہی دیر میں یہ ناصح خشک کی نصیحت والی دھاک بٹ گئی۔ بیرہوٹی میں اپنے قلبِ خوں چکاں کا نمونہ دیکھ کر شاعر مفتوں ہو گیا۔ اور سینے سے لگا کر پیار کرنے کی تنہا ہی اصلی وجہ نکلی اور سکون و قرار کا تضاد صرف بردنی چلنے پھرنے یا سکون کی ہی میں شکل میں رہ گیا۔ مگر دیکھیے تو سہی کس پیار سے شاعر نشتے سے کیڑے کو ٹھیرانا چاہتا ہے۔ لڑکوں کی طرح زبردستی پکڑا کر نہیں

دل رہا ہو غنچہ گل سا ترا رنگِ جمال

خوش نما ہو کس قدر تیری شبیمِ طرح دار

خون، شیدائی کا کرتا ہو ترا یہ سرخ شال

لائی تجھ کو بہرِ زیباشِ عروسِ برشکال

لال بیندی سے فزوں کرنے کو چہرے کی بہار

آہ یہ منظر ترا خوش کن، یہ جوشِ سبزہ زار

آہ یہ منظر ترا خوش کن، یہ جوشِ سبزہ زار

پہلے مصرع میں ہندستان کی وطنیت دولہا دولہن کے تغزل کے ساتھ ظاہر ہو اور لال بیندی کی تشبیہ مزہ

دے رہی ہے۔ اور دوسرے شعر میں تو خطِ گل زار گویا گل زارِ نسیم کی زبان میں ہی لکھا ہے

آ۔ اٹھالوں۔ آہ، ساکت ہو گئی تو شکلِ خال

یہ محبت سے مرا لینا ہی تجھ کو ناگوار چھوڑ دوں۔ اچھا ستاؤں گا نہ تجھ کو زینہار

جا زمیں پر کھیل خوش خوش ہاتھ پیر اپنے نکال

ذرا سا چھونے سے بیرہوئی اپنے ہاتھ پیر سکڑ لیتی ہے گویا وہ ایک پلتی پھرتی چھوٹی موٹی ہے۔ یہ دونوں شعر ہیں کہ جذباتِ فطرت کی جان۔ جذبات کتنے بے تصنع مگر کتنے پُر لطف اور پاک ہیں !

دور ہی سے دیکھ لوں میں حُسن کا تیرے جاں

محو ہو کر بس کروں دل ہی میں دِصغِ کردگار . . . . .

فضا سے خدا کی طرف رجوع، صنعت سے صانع کی طرف رجحان، سحر صاحب کے حسن قدرت کی معنوی کا اکثر خاص بزد ہے اور وہ یہاں صاف عیاں ہے۔

دیکھ لوں جی بھر، کہ دورِ ہستی ناپائدار . . . . .

پھر دکھائے گا نہ مجھ کو تیری صورت ایک سال

دسال کے چند لمحے کس مزے سے استعمال کیے جاتے ہیں کیوں کہ آئندہ ایک سال کے ہجر کا خوف ہے!

اب پورے ناصح (مگر خشک نہیں بلکہ پُر درد) کی شکل میں شاعر کو دیکھیے

راہ رو رکھ بر قدم کو خُوب کر کے دیکھ بھال

خوں نہ ہو جائے کسی معصوم کا دل ہو شیار اس قدر ہو جن پہ ہر دم شفقتِ پروردگار

یوں حقارت سے انھیں دیکھے بشر کی یہ مجال

شاعر کا جذبہ ہم دردی میں اذپر کے اشعار کی روح رواں ہے۔

حب الوطنی کا جذبہ سحر میں اتنا تھا کہ اسی کے جوش میں اور ادبی خدمات کی دل چسپی کی وجہ سے ہمیشہ

فختاری کو خیر باد کہا اور ایک ادبی سنیا سی کی سی زندگی قبول کی۔ لیکن ہمارے ملک کی تقدیر میں ایسے جذبہ

شاعری کو مایوسی اور مرثیہ نویسی ہی نصیب ہے۔ سحر کی وہ نظمیں جن میں لوگ نانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے،

سوامی شردھنند اور گنیش شکر ددیارتھی کے نوسے ہیں، درد، سوز و گداز سے بھری ہیں۔ اور پکار پکار کر اپنے

ہر لفظ سے کہتی ہیں

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں غریب قوم کا ہر مرثیہ فسانہ نہیں

نمونے ملاحظہ ہوں سے

### لالہ لاجپت رائے مرحوم

پھٹ پڑا قوم کے سر پر غم و آفت کا پہاڑ اپنی حالت میں زیادہ نظر آتا ہو بگاڑ  
ہو گیا سوگ سے ہر خانہ آباد اُجاڑ شیر پنجاب کی باقی نہ رہی آج دھاڑ

صاف اعدا کو جو کر دے تہ و بالا نہ رہا

کھیلے جو موت سے وہ کھیلنے والا نہ رہا

جلوہ زاب نہیں وہ ناز وہ اندازِ وطن جان سے اپنی گیا عاشق جاں بازِ وطن

دفعاً ٹوٹ کے بے ساز ہوا سازِ وطن اگلے لہجے میں اب اُٹھتی نہیں آوازِ وطن

بھیلے جو دہریں ہر سمت فسانہ ہو کر

گوخ اُٹھے ہند کی عظمت کا ترانہ ہو کر

ای اہل، ای ستم ایجاد! تجھے کچھ ہو خبر تو نے اک ساتھ کیے کتنے مظالم ہم پر

آج مٹ مٹ کے رہے تیرے ہی ہاتھوں یکسر دم و خم اوج و شرف فیض و کرم علم و ہنر

کیسے آسودگی خاطر ناشاد کریں

مرنے والے تری کیا کیا صفتیں یاد کریں

### سوامی شردھانند مرحوم

آہ سوامی! یہ اک آفت ہو تری موت نہیں قوم پہ گونہ مصیبت ہو تری موت نہیں

مایہ صد غم و حسرت ہو تری موت نہیں پھر بھی بے شبہ شہادت ہو تری موت نہیں

گہر ملایا، گہے در پردہ ہنسایا سب کو

ہاں تری موت نے دیوانہ بنایا سب کو



(اس آخری شعر کی تو تعریف ہی نہیں کرتے بلقی۔ جذبات کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔) ۷  
 تھا شرادہ مگر آتش کی حرارت تھی نہاں      قطرہ تھا، تجھ میں مگر بھر کی دست تھی نہاں  
 تھا تماشا مگر آرایشِ قدرت تھی نہاں      ذرہ تھا، تجھ میں مگر مہر کی جدت تھی نہاں

ایک جاں تھی تری صدِ مجمعِ جاں کے قابل

ایک ہستی تھی تری ایک جہاں کے قابل

(حضرت انیس بھی بے ساختہ بہشت میں بول اُٹھے ہوں گے "خوب")

اب تو گوشت کے رہی ہستی فانی تیری      پر مٹے گی نہ کبھی زندہ نشانی تیری  
 آن ہر آن یہاں جاے گی مانی تیری      مائیں بچوں کو سنائیں گی کہانی تیری  
 جس سے رو ہوگا عمل خواہشِ نفسانی کا  
 آئے گا جذبہِ دلِ قوم میں قربانی کا

### سری جت گنیش شنکر ودیار تھی مرحوم

تجھ کو ای ودیار تھی محرومیِ جاں کی قسم      اپنے دل کے درد کی اور اس کے دریاں کی قسم  
 جس پہ تو مٹ مٹ گیا اسرِ عہدِ پنہاں کی قسم      تجھ کو اپنے دین کی اور اپنے ایمان کی قسم

چ بتا، وہ کون سا تھا اک خیالِ پُر امید

جو بنا کر ہی رہا آخر تجھے اپنا شہید ؟

ہندو دسمل کے بل جانے کا تو حامی رہا      میل کے خاطر ہی تو نے آہ کتنا دکھ سہا

آپ تو اپنے ولیِ جذبات کی رو میں بہا      جان ہی دے کر کیا پورا اُسے، جو کچھ کہا

آج ہم سب کے لیے یوں ای فداے اتحاد

ہو کے قرباں بن گیا تو رہنماے اتحاد

گرچہ تھا اپنا ہی اُجڑا گاؤ تیرا بھی وطن      اپنی کیتائی سے تھا تو واقعی فخرِ زمن

گو ہر تیری موت سے دل وقفِ آلامِ دامن پھر بھی یہ اک بات تسکین کا سبب جاتی ہو جن

باخبر ہو کر جیا اور باخبر ہو کر مرا

تو مرا لیکن حقیقت میں امر ہو کر مرا

مجھے اور سحر جی کو تو پرتاپ کے ایڈیٹر مل مضافین اس قدر پسند تھے کہ ہفتہ وار پرتاپ پڑھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ منشی دیا زین نغم صاحب مرحوم کے زمانہ کے متعلق جو مضمون زمانہ کی سلاسلِ جہلی نمبر کے موقع پر پرتاپ میں نکلا تھا آج بھی میرے کمرے میں شیشے میں لگا ہے۔

تین بڑی نظموں کے متعلق یعنی شکوئی شکستہ، رباعیات عمر خیام اور کریا کے متعلق مضمون ہذا کا بالکل ایک علاحدہ جزو محفوظ کیا جا رہا ہے، اس وجہ سے ان کے متعلق یہاں لکھنا ضروری نہیں، ہاں - یہ ضرور کہہ دینا ہو کہ سحر جی اپنا نام شاعری کی دنیا میں ان تین نظموں کی شکل میں زندہ جاوید کر گئے ہیں۔ اور سحر جی کی وفات کی خبر پاتے ہی میرے بھائی کے پوتے بابو اندر موہن لگوڑہ نے جو شعر لکھ بھیجا تھا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔

تمہیں کہتا ہوں مردہ کون، تم زندوں سے بہتر ہو

تمہاری نیکیاں زندہ، تمہاری خوبیاں باقی

**وضع قطع** | خود نوشت حالات میں خود سحر جی تحریر فرماتے ہیں :-

”ہر چیز کو ٹھیک جگہ پر رکھنے اور دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ جس میں پوری صفائی کا بھی خیال رہتا ہے۔

زندگی بھی کچھ قاعدے کے ساتھ چل رہی ہے۔ سادہ کھانا، سادہ رہنا، اپنے کسی کپڑے پر کسی رنگ کی

ایک لکیر بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ کپڑے کھدے کے ہی ہوتے ہیں۔“

سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات کا وہ ایک مرتع تھے۔ اسی لیے تو میں نے ان کو ”اوبی سنیا سی“ کہا ہے۔ سنیا سی

کے معنی ہیں تمام طرف سے خیالات کو ہٹا کر مرکزی بنالینا۔ اور انھیں کسی ایک رُخ میں کر کے (ایشور کے اپن وقف)

۱۔ ہفتہ وار اخبار کان پور صاحب موصوف جس کے ایڈیٹر تھے

۲۔ یہ شعر مولانا حالی کے مرثیہ حسن الملک سے منقول ہے۔ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے :

”تمہیں کہتا ہوں مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو“

(مدیرِ اردو)

کردینا۔ سحر جی کی دنیا دنیا سے ادب تھی اور بقیہ امور سے انھوں نے زیادہ تر سنیاں لے لیا تھا۔ ہاں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے بے خبر تھے۔ جو کچھ بھی تھوڑا بہت ملتا تھا وہ ان کے پاس ٹکے نہ پاتا تھا۔ لڑکی کی شادی اور اپنے دونوں لڑکوں کی تعلیم میں کافی صرف کیا۔ خاندان، ملک و ملت و قوم کے غم بھی ان کے پیسے سے فیض یاب رہتے تھے۔ بہار میں زلزلہ آیا اور سحر جی پرانے کپڑے اور چندہ و اناج اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ گروہوال میں قحط ہوا اور سحر جی در بہ در بیک مانگتے دیکھے گئے۔ بتول چکیت سے

”جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں  
 طبع میں دولت دنیا کے یہ اسیر نہیں“

اپنے لیے تو گداے متکبر ہی تھے۔ پیسے کی ضرورت رہتی تھی۔ مگر رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان کی بے اتفاقی ساتھ ہی ساتھ تھی۔ جھجھلا کر اس تعلق سے ایک مضمون بھی سروسٹی میں شائع کرا دیا۔ مگر اپنی شان کبھی نہ چھوڑی۔ نثر کے مضامین بلا معاوضہ نہیں لکھتے تھے۔ مگر نظیں بلا معاوضہ ہی دے دیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ”بھائی نثر کا ہی کیا معاوضہ ملتا ہے جو نظم فروشی کر کے اس کی مٹی پیدا کروں“ اسی لیے سوائے ان نظموں کے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب ہی بلا معاوضہ رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی ہیں

قدرت سے اس قدر انس تھا کہ علاج بھی زیادہ تر لونی کوہنی کا ہی پسند تھا۔ یا بہت ہوا تو ہومیو پتی۔ مگر یونانی اور ویدک کی ادویات سے بھی دل چسپی تھی۔ کیوں کہ ان میں زیادہ تر نمینسپتی ہی شامل ہیں۔ ہاں ایلو پتی ناپسند تھا۔ کئی باریہ کوشش کی کہ بھگولیا ہوا کچا گیہوں یا چنا، منٹی یا کشش، یا ننگ اور پھل کھا کر زندگی بسر کریں مگر کام یاب نہ ہوئے۔

ستپائی، سادگی اور خودداری ان کی زندگی کے جوہر تھے۔ خوشاں بالکل پسند نہ تھی اس لیے

**سیاست** | سوائے شروع کے پھر حکام کی خوش نودی کے لیے نظیں نہیں لکھیں۔ حب الوطنی کی وجہ سے ہی پیشہ مختاری چھوڑا اور کھد رپوش ہوئے۔ مگر تصنع اور ظاہر داری سے اس قدر نفرت تھی کہ کانگریس کے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی جہاں اس میں ہلڑ بازی شروع ہوئی وہاں اسے بھی خیرباد کہا۔ اور آخر میں چار آنے والے مہر بھی نہ رہ گئے۔ اتنا ہی نہیں، ایک کہانی بھی عام دیہاتی کانگریسیوں کی بدعتوں پر لکھ ڈالی جو سروسٹی میں بلا معاوضہ

پچاس زپڑ (ص ۶) شائع ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ بلا خاص تربیت اور اخلاقی تعلیم و خوفِ خدا ہر کس و نا کس کو والٹیر بنا کر اہنسا کی خدمت سپرد کرنا سخت غلطی ہو۔

ایک بڑا مضمون کانگرس کی تاریخ پر لکھا تھا۔ جو غالباً ماڈھری میں شائع ہوا تھا۔ اخبارات سے نوٹ کر لینے کے اس قدر عادی تھے کہ میرے خیال میں پوتھے کے پوتھے موجود ہوں گے۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۴۱ء تک کے نوٹ تو میں نے خود اپنے یہاں ہی ان کو برابر لیتے ہوئے دیکھا تھا۔

**مذہب**

بڑے پکے آریہ سماجی تھے اور سب ہی تصانیف اس فرقے کی پڑھی تھیں۔ سوامی درشانند جی کے منطقی نقطہ نظر کے خاص دلدادہ تھے اور انہی کی تقلید میں کٹر جھوگ وادی تھے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ ہنگام کی آریہ سماج کے سالہا سال سے پردھان (صدر) تھے۔ سب ہی درشن پرٹھے تھے۔ اور خاص اصول بھی زبانی یاد تھے۔ یم اور ینیم کے خود بھی بہت پابند تھے اور انہیں مذہب کی عملی شکل کی بنیاد مانتے تھے۔ لیکن دو باتیں ناپسند تھیں۔ ایک تو دوسروں کی مذمت اور دوسری خیرات میں کجوبی۔ کبھی کبھی جھنجھلا کر کہہ دیتے تھے کہ سماجی لینا جانا ہو دینا نہیں۔ سندھیا اور اشان دونوں وقت ضرور کرتے تھے چاہے معمولی بخاری کیوں نہ ہو۔ کوتاہ نظری نہ تھی۔ درنہ مجھ جیسے سناتنی سے گہری دوستی کیسے بنتی۔ یہ نہ تھا کہ ہم دونوں آپس میں مذاق اور رویتے پر نکتہ چینی نہ کرتے ہوں مگر وہیں تک جہاں تک ہنسی آئے۔ مثلاً میں اکثر کہتا۔ ”میاں، آنکھ بند کر کے سندھیا میں کیا دیکھتے ہو وہی اندھیالا، ہمارے راجا رام کو دکھو۔“ تو ہنس دیتے۔ اور ایک مرتبہ تو کہا کہ ”بھائی کہتے تو صبح ہو مگر کیا کروں لا محدود کو محدود دیکھنے میں ہچک ہوئی ہے۔“ میرے بڑے بھائی ست زاین کی کتھا کے بعد جو چرنامرت اور پیجری منگا کر دیتے اسے بڑے شوق سے کھاتے مگر یہ کہہ کر کہ ”آپ چرنامرت سمجھیں، میں تو اسے پچنامرت سمجھ کر پیتا ہوں۔“ اور زور سے تہقہہ لگاتے۔

میں اکثر مذاق میں کہتا کہ تم ایسے ہو کہ چلو بھر ترپن کی بھی امید نہیں تو ہنس کر کہتے ”میاں گھڑوں پانی ڈھلکا دوں گا ایلے تو لے لینا۔“ آہ! آج وقت پلٹ گیا اور اٹا ترپن کرنا مجھے نصیب ہوا۔ جو حسبِ قاعدہ دوزخ تہرجی کے لیے بھی کرتا ہوں۔

خود نوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں ”دُرد، ہندی، انگریزی نظم و نثر کی ہزاروں کتابیں درس و تدریس پڑھ چکا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ شروع سے کتابوں کے نام کہیں نوٹ کرتا جاتا تو اچھا تھا۔“ ان کا ہاتھ نہ کبھی لکھنے میں تھکتا تھا اور نہ دماغ پڑھنے سے۔ زور سے پڑھنے کے عادی نہ تھے اور اسی وجہ سے بہت تیز پڑھتے تھے۔ جو کتاب لی شروع سے آخر تک چاٹ گئے۔ میں مذاق میں کہا کرتا تھا کہ لوگ سوختے کو ”روشنائی چاٹ“ کہتے ہیں مگر تم تو بھائی ”کتاب چاٹ“ ہو۔ جس شاعر پر مضمون لکھتے تھے، کیا مجال کہ اس کے مجوزے کا ایک بھی شعر پڑھنے سے رہ جائے۔ ہفتوں پڑھنا اور نشان لگانا، پھر رسالوں میں اسی شاعر کے متعلق مضامین پڑھنا اور نوٹ لینا اور تب ہی قلم اٹھانا۔ یہ ان کی تکمیل پسند طبیعت کا ایک خاص رُخ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب معاوضہ کم ملتا تھا، تاخیر یا وعدہ خلافی ہوتی تھی تو انہیں جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ خطوط میں سخت الفاظ بھی لکھ دیتے تھے۔ ان کی مشنوت کیے، رفیق کیے، کتابیں اور رسالے ہی تھے۔ Southey کے حسب ذیل اشعار ان پر صادق آتے ہیں:-

My hope, arc with the Dead; anon

My place with them will be,

And I with them shall travel on

Through all Futurily

Yet leaning have a name, I trust

That will not ~~perish~~ in the dust.

دردگی کے شائبے میں دو واقعات یہاں لکھنا ضروری ہو۔ وفات سے ایک یا دو دن پہلے انھوں نے اپنے بڑے صاحب زادے سٹر کیلاش درما شائق سے، جو خود بھی ایک مہنہ دار ادبی خادم ہیں، کہا کہ مجھے اپنے کتب خانے کی الماری کے پاس لے چلو۔ جب وہاں پہنچے تو ایک حسرت کی نگاہ نکل کتابوں پر ڈالی اور کچھ عرصے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اپنے بستر پر لوٹ آئے۔ ضبط کا مادہ تو بہت تھا ہی پوچھنے پر مثال مثال کا جواب دیا۔ مگر لڑکے کا دل کھٹک گیا اور اس نے اپنے چچا بابو نرسنگھ بہادر دیل کو بلانے

کے لیے آدمی فتح پور بھیج دیا۔ مجھے تو اس واقعے سے یقین ہو کہ سحر جی ادبی خدمت کے لیے ہمارے ملک میں پھر تشریف لائیں گے۔

سنہ ۱۹۴۱ء کے بڑے دن کی چھٹی میں جب میں اچودھیا جی جانے لگا تو میرے گرد دیو کی علمی خدمات و ادبی تجربے کے قابل ہونے کی وجہ سے مجھ سے یہ درخواست کی کہ ایک جڑی کھڑاؤ لے کر گرد مہراج سے کہنا کہ اپنے قدموں سے چھو کر مجھے دے دیں۔ میں انھیں بطور یادگار پہنا کر دے گا۔ اس سچے جذبے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرے گرد دیو سری انجی نندن سرن جی ہیں۔ جنھوں نے دس جلدوں میں راماین کی تنقید اور ٹیکا لکھی ہو اور تمام ہی سنسکرت کے راماینوں اور دیگر علما کے تلمیذ داس کی راماین کے متعلق خیالات کو جمع کر دیا ہو۔ ہم دونوں کا یہ خیال ہو کہ اس سے بہتر تنقیدی کتاب دیناے ادب میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ جب میں نے گرد جی سے یہ عرض کیا اور کھڑاؤ سامنے رکھے تو انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ ”بھائی“ میں تو آریہ بھائیوں کو بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ بھگوان نے خود گیانی کو **प्रायः तनय** کہا ہو۔ مگر ہم تو بچے ہیں۔ بھگوان کے سگن روپ کے آپاسک۔ ہمارے لیے وہ راستہ تلوار کی دھار ہو۔ ہاں، ایک ہی بات مجھے نا پسند ہو کہ وہ ہم بچوں کے صدق محبت پر شبہ کر کے کبھی کبھی سخت کلامی اور مذمت کرنے لگتے ہیں۔ جو خاص کر بڑے بھائی کے شایان شان نہیں ہو۔ سحر جی سے کہنا کہ میں اس بات کا ادھکاری نہیں ہوں کہ اپنے چرنوں سے لگا کر کھڑاؤ دوں۔ ہاں، لویہ کھڑاؤ بھگوان کے چرنوں میں لگا کر اپنے سر سے جھلا کر حوالے کرتا ہوں۔“

سحر جی نے یہ پرشاد بڑی محبت سے لیا اور چند آؤں کے کھڑاؤ کو ایکٹ پیش بہا یادگار سمجھ کر لے گئے اور استعمال کرتے رہے۔ دونوں جانب کی انکساری اور قدردانی ہی اس واقعے کی جان ہو۔

ایک روز اتفاقاً یہ گفتگو چھڑ گئی کہ حضرت نیاز فتح پوری کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو، ہندی، ہندستانی | کو اُردو کسنی نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ نیاز صاحب تو میرے بڑے بھائی بابو مینی بہادر درما کے ہم سبق رہے ہیں۔ لڑکپن میں ان کے یہاں کی بڑی بوڑھی عورتیں ہمارے یہاں آتی تھیں اور ہمارے یہاں کی عورتیں بھی ان کے یہاں جاتی تھیں۔ خیر، یہ تو کسی تقریب کے موقع

پر ہوتا تھا لیکن جاڑوں میں دوپہر کو اور گرمیوں میں چاندنی رات یا شام کو اکثر دونوں طرف کی عورتوں میں چھتوں پر سے خوب بات ہوتی تھی (نیاز صاحب کا گھر سارے گھر کے پیچھے تھا اور چھتیں ملی ہوئی تھیں) میں بھی لڑکپن میں اکثر ان روزانہ کی مسکوتوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ خاص کر صغرا دی مجھے بہت پیار کرتی تھیں مگر مجھے تو اپنے یہاں کی اور نیاز صاحب کے گھر کی عورتوں میں زبان کا بہت بڑا فرق نہیں معلوم سوتا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ اُدھر سے ”اللہ اللہ“ ”خدا جانے“ وغیرہ سنائی دیتے تھے تو اُدھر سے ”رام رام“ اور ”رام جانے“ مگر ظنین کو اس میں بھی پورا یقین تھا کہ اللہ اور رام اور خدا ایک ہی معبود ہے۔ دو نہیں۔ کبھی تو محبت یا رحم کے جوش میں نابا ہمدردی کا وہ اُبھار ہوتا تھا کہ صغرا دادی کے منہ سے ”رام رام، نکل جاتا اور میری ماں کے منہ سے ”خدا جانے“ اس پر سحر صاحب لے فرمایا کہ ”بھائی۔ اب نیاز صاحب نام کے فتح پڑی رہ گئے ہیں۔ ورنہ اب دراصل لکھنوی ہیں۔ اور ان کے رسالہ نگار کو بلاغت پڑھنا شکل ہے۔“ تب میں نے بات کاٹ کر کہا کہ ان کی جذبات بھاشا پڑھ کر سب سے تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ ہماری مادری زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ میں تو اسے اپنی چھوٹی سی لائبریری میں ایک یا دو کی طرح پر اب بھی محفوظ رکھے ہوں۔ سحر جی کا جواب تھا کہ ”اب پاکستان کا زمانہ ہے اور ہم لوگ ناپاک ہیں نہ وہ پُرانے دن رہ گئے اور نہ وہ پُرانے لوگ۔“ گفتگو کا سلسلہ بڑی دیر تک چلا رہا۔ آخر میں انھوں نے مجھے اپنے خیالات ایک نمونہ کی شکل میں اُردو میں شائع کرائے کی اسے دی۔ پہلے تو میرا ہی جواب تھا کہ میں اس بھنٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا تو وہی خیال ہے۔ یہ سے استاد مولوی نیاز محمد صاحب رٹائرڈ ماسٹر نائل اسکول الہ آباد کا ہے اور جرہ کی تعلیم انھوں نے مجھے اسی صدی کے آغاز میں دی تھی کہ ہماری مادری زبان ہندی ہمارے ملک کا نام ہند یا ہندوستان ہے۔ کیوں کہ اسی نام سے ہم ہندی کہہ کر عرب فارس اور مصر میں بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ہاں شاہی دربار کے تعلق رکھنے والوں میں ایک پدی زبان مستعمل ہونے لگی تھی جس کو اُردو نام بعد کو دیا گیا۔ اور اسی کا شائبہ اب بھی زبان کے ایک طائر تحریر اور تقریر میں موجود ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مذہب کے تعلق سے اہل اسلام عربی اور فارسی پڑھتے ہیں۔ اور ہندو سنسکرت۔ اس لیے دونوں کی تحریر و تقریر میں اپنے اپنے مطالعات کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن جب واحد جمع بنانے کے طریقے ایک

اسا کی تذکر و تانیث ایک سی ، اور افعال کی بناوٹ ایک سی تو زبانیں دو کیسے کہی جاسکتی ہیں ۔ دیکھیے نہ ، انگریزی میں بھی جو لوگ لاطینی زبان پڑھتے تھے ان کی انگریزی اور طرح کی ہوتی تھی اور جو یونانی زبان پڑھتے تھے ان کی اور طرح کی ۔ پھر فرانس کی زبان کا اثر بھی تھا ۔ الغرض اب بھی انگریزی ادبیات میں ملتن کی زبان اور بارتن یا درڈس درتھ کی زبان میں فرق ہو رہی لیکن اس بنا پر کوئی دو باتیں انگریزی زبان میں نہیں کہتا ۔ اور معمولی روزمرہ کا کام چلانے کے لیے اور اخبارات وغیرہ کے لیے ایک سی زبان بن گئی ہو جسے سب سمجھتے ہیں اور آسانی سے بولتے ہیں ۔ یہی ہندستان میں بھی ہونا چاہیے ۔ روزانہ کاموں کے لیے عام زبان ہندستانی سب بولیں اور لکھیں اور سمجھیں ۔ رہا علمی اور ادبی تقاضات سے اگر کچھ فرق رہے تو بھی منسلک نہیں ۔ جہاں ایک ہونے کی خواہش ہوگی وہاں اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ سب سمجھ سکیں اور سرف طرز تحریر اور طرز مکالمہ کا فرق رہ جائے اب بھی اکثر مسلمان صاحبان پنڈت کو آنے دیکھ کر ” براہیے “ کہہ دیتے ہیں اور ہندو صاحبان مسلمان کو دیکھ کر ” تشریف لائیے “ الفاظ کا اضافہ تو اچھی چیز ہو ۔ ہمارے علمی اور ادبی مزانے میں غالب مومن ، نقیر اکبر آبادی ، ملک محمد جاسی ، رحیم ، رکھان ، تلسی داس سب ہی ان مول جواہرات ہیں ، کسے لکھ لیں ، کسے رکھیں ؟“

تحریر نے جب دیا کہ انھیں خیالات کی ترویج درکار ہو ۔ میر نے مطالعہ شروع کیا اور کئی رسالوں پر ہر تحریر نے عطا کیے تھے نشانات لگائے ۔ آخر میں انھوں نے نہیں میری یادداشت کی کتاب میں اپنے دست مبارک سے لکھ دیا ۔ میں بولتا باتا تھا اور وہ لکھتے جاتے تھے ۔ یہ کام ۱۶ جون سنہ ۱۹۴۲ ع کو ختم ہوا ۔ میری صحت گرمی اور برسات میں بہ وہ دمہ خراب رہتی ہو ۔ تسلی میں یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہو پایا اور آخری خط میں بھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس کا تقاضا تھا ۔ خیر ۔ اب دیکھیے کب یہ کام ہونا ہو ، یا نہیں ہوتا ۔ البتہ ان کے خیالات کا لب باب غرر یہاں دے دینا مناسب ہو ۔ ان کے خیالات مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خیالات ۔ یہ بہت ملتے جلتے ہیں جن کا اظہار انھوں نے جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع کے زمانہ میں ” اردو ہندی تفسیر “ کے عنوان والے مضمون میں کر دیا ہو ۔ اس لیے ذیل کہ اقتباس دیا ہوتا ہو :-



”جو اپنے کو اُردو ہندی کا ادیب کہتے ہیں یہ فرق انتہا درجے کی ضد اور تعصب سے کام لے کر دراصل دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا رہا ہو۔۔۔۔۔ مگر زیادہ سرزنش کے قابل اُردو کے حامی خصوصاً ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔۔۔۔۔ اب تو اخبارات میں بھی غیر مانوس عربی، ترکی وغیرہ کے نئے الفاظ ٹھونسنے جاتے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے میں بڑی دقت ہوگئی ہو۔۔۔۔۔ ان الفاظ کو جو عرصہ دراز سے اُردو میں داخل ہو گئے تھے نکال کر پھینک دیا ہو۔ مثلاً ایڈیٹر کا لفظ کیا اُردو کیا بنگالی مرہٹی وغیرہ زبان میں بھی استعمال ہونے لگا تھا اور لائین اور اسٹیشن کی طرح اُردو میں کھپ گیا تھا۔ لیکن اب مدیر ٹھونس دیا گیا ہو۔ خزانچی کے بجائے خازن۔۔۔۔۔ میں نے خود اخباروں میں پڑھے ہیں“۔۔۔۔۔

”اس طرح ہندو مجبور اور تنگ کیے جانے لگے۔۔۔۔۔ جواب میں ہندی میں بھی سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہونے لگی۔۔۔۔۔ میرا سوال ہے کہ آپ نے ہندوؤں کو ملک کی واحد مشترکہ زبان سمجھنے سے کیوں محروم کر دیا؟ اصلی رونا ذہنیت کا ہے (ضلع جون پور میں تعلیم یافتہ مسلمان نے ڈیڑھ گوانی کو سرکاری کاغذات میں کچ گوانی لکھا ہی دیا) یہ ذہنیت مسلمانوں خصوصاً ادیبوں میں پھیلی ہوئی ہو۔۔۔۔۔ اگر یہ خیال ہو تو دعوے چھوڑ دیجیے کہ اُردو دونوں کی مشترکہ زبان ہو۔“

جو اصحاب سحر جی کے خیالات کو زیادہ وضاحت سے جاننا چاہیں وہ ان کے پدم سنگھ شرا دالے مضمون میں جو اپریل سنہ ۱۹۴۱ کے اُردو میں شائع ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

ایک رخ اس تحریک کا یہ بھی ہو کہ اُردو کی خدمت کرنے والے ہندو اصحاب کی قدردانی تو درکنار، کبھی کبھی مذمت کی جاتی ہو۔ سحر جی بھی اس کا شکار ہوئے۔ میں نے سوائے دس پانچ اشعار کے اور ان کے کلام کا کوئی جز کسی اسکول میں پڑھائی جانے والی کتاب میں اپنے صوبے میں نہ دیکھا۔ حالانکہ مٹا ہو کہ حیدرآباد میں ان کی شہسوئی کے اقتباسات اکثر کتابوں میں لیے گئے ہیں۔ خیر، یہ سنی ہوئی بات ہو مجھے جو بات کھٹکی ہو اسے یہاں ضرور لکھوں گا۔ گو اختصار کے ساتھ کیوں کہ مشترکہ جواب کا موقع نہیں ہو۔ اُردو چوں کہ اپنے کو فارسی اور عربی کا وارث سمجھتی ہو اس وجہ سے وہیں کے راگ الاپتی ہو۔ اس میں ہندستان کی وطنیت کم پائی جاتی ہو۔ مٹے ہوئے مناظر کا کھنا اور باندھنا تفتش سے خالی کیسے ہو سکتا ہو؟ وہیں لنگا جی کے کنارے اور کریں ذکر فرائد اور دجلہ کا تو وہ بات کیسے پیدا ہو سکتی ہو؟ ایک رخ اس خامی کا یہ ہو کہ سب لکیر کے فقیر بنے ہیں۔ جو لفظ بھی ہو کسی استاد کا اُدھار لیا ہونا چاہیے۔ جو طرز تحریر ہو

کسی استاد کی تمثیل کی بنیاد پر۔ بس اسی کا نتیجہ ہو کہ ہم فطرت سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ سحر جی نے انصافِ جہاں گیری کے اس واقعے کو نظم کیا تھا جس میں نور جہاں نے جلالت میں بجائے مچھلی کے ایک دھوبی کو اپنے پٹنچے کا نشانہ بنایا۔ دھوبن کی فریاد پر جہاں گیر نے اپنا سینہ اس کے سامنے کھول دیا اور کہا کہ بیگم کی معقول سزا یہی ہو کہ تو مجھے پٹنچے کا نشانہ بنا۔ تاکہ وہ بھی بیوہ ہو جائے۔ اپنی ”تاریخ و تنقید ادبیاتِ اردو“ میں جناب خالد حسین قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے کتنے ہی نقائص اس نظم میں نکالے ہیں اور بنیاد نکتہ چینی کی دہی ہو جس کا ذکر اڈپر کیا گیا ہو۔ اور جسے میں لکیر کا فقیر ہونا کہتا ہوں۔ ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہو کہ ہمیں یہاں سب کا جواب دینا منظور نہیں، صرف ایک نکتہ چینی کا جواب دینا ہو جس کا تعلق خاص طور سے فطرت سے ہو۔ سحر جی کا شعر ہو۔

لیکن انوس کہ چاہی ہوئی مچھلی کے بجائے ایک دھوبی پہ پڑا جا کے نشانے کا اثر  
اعتراض یہ ہو کہ تاکی ہوئی کی جگہ چاہی ہوئی (یعنی جس کو نشانہ بنانا چاہا تھا) روزمرہ کے خلاف ہو۔ پروفیسر صاحب خود سحر جی کو ”سن رسیدہ اور کہنہ شق شاعر“ تسلیم کرتے ہیں۔

چوں کہ اس ”چاہی ہوئی“ ترکیب کی میں نے سحر جی سے پہلے بڑی تعریف کی تھی اس وجہ سے سحر جی نے مجھے یہ تنقید دکھائی اور کہا کہ جسے تم بہت پسند کرتے تھے اور جس پر مفتون ہو رہے تھے وہی ترکیب میری مذمت کا باعث ہوئی۔ مجھے تعجب ہوا اور غاص کر اس وجہ سے کہ میرے ہی کالج کے پروفیسر کے قلم سے یہ تنقید نکلی تھی۔ مجھے اس سنٹ جانس کالج کے اپنے تعلیم والے زمانے کا ایک ادبی واقعہ یاد آگیا اور اس کی بنا پر میں نے سحر جی سے بھی عرض کیا تھا اور یہاں بھی لکھتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے مناظرہ کی فطرت کو محاورے پر قربان کر دیا ہو اور یہ نہیں سمجھا کہ محاورہ بھی مشاہدہ عام کا نتیجہ ہوتا ہو۔ لیکن مشاہدہ خاص میں باریک امتیاز بلا محاورہ روزمرہ سے انحراف کیے ہوئے منظوم نہیں ہو سکتا۔

میں ایم۔ اے کلاس میں پڑھتا تھا۔ اور یونیورسٹی ڈرنٹ صاحب جو بعد کو لاہور کے لارڈ بشپ ہوئے پروفیسر تھے اور علم ادب میں نہایت ہی قابل تھے۔ ورڈس درتھ کی مشہور نظم ”Ballad of the Poet“ پڑھا رہے تھے اس میں پھولوں کی کثرت کا بیان کرتے ہوئے ایک جگہ ”Cavalier“ تحریر ہو اور کسی شارح نے اعتراض

کہا ہو کہ اس خوب صورتی کے منظر میں یہ در بے ترتیب جھنڈ“ کا خیال ناموزوں ہو۔ مگر میرے دل نے گواہی دی کہ یہ تفسیر غلط ہو۔ خیر۔ کالج میں بھی پروفیسر نے بھی اسی شارح کے خیالات کی بنا پر سخت تنقید کی اور جب میں نے کوئی احساس ظاہر نہ کیا تو جھنجھلائے کہ تم لوگ ادبی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔ میں نے دبی زبان میں کہا کہ پروفیسر جی میں اس تنقید نگار سے شفق نہیں ہوں کیوں کہ اس نے فطرت کے مشاہدے اور دل کے جذبات کی باریکی کے پہلو کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ اور صرف لفظی اُدیٹریں میں پڑ گیا ہو۔ پروفیسر صاحب چونکے اور کہا کہ اپنا خیال اور وضاحت کے ساتھ بیان کرو۔ تب میں نے عرض کیا کہ رسکن نے یہ اصول قائم کیا ہو کہ جب کوئی بڑا شاعر ہمیں خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہو تو محاورے وغیرہ میں ایسی تبدیلی کر دیتا ہو کہ ہم چونک جائیں۔ اور غور کرنے لگیں۔ بس جہاں غور کیا گیا، جذبات یا فطری مناظر کی باریکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور بڑا مزہ آتا ہو۔ مثلاً اس نے مثال دی ہو کہ ملٹن نے پیٹو پادریوں کے لیے ایک جگہ Blind mouths (اندھے منہ) لکھ دیا ہو۔ جب ہم چونکتے ہیں تو معلوم ہوتا ہو کہ ٹھیک لکھا ہو کیوں کہ وہ علیت میں اندھے ہیں تو رہبری کون کرے۔ مگر پیٹو تو ہیں ہی اور سب منہ میں رکھ لینا چاہتے ہیں، ورنہ کہیں منہ اندھا ہو سکتا ہو۔

زرا غور فرمائیے کہ ایک شخص جو رنجیدہ ہو یا اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو رہا ہو۔ اسے عمدہ سے عمدہ بالترتیب باغ بھی جن میں گلاب ہی گلاب لگے ہوئے ہوں، گلاب کے کانٹوں سے ہی بھرا دکھائی دے گا۔ تو پھر حبیب کے کنارے کے جنگلی ڈیفنڈل اگر اسے ”بے ترتیب جھنڈ“ معلوم ہوتے ہیں تو بات ہی کیا لیکن شاعر یہ دکھانا چاہتا ہو کہ فطرت کی فتح بھی فوری ہی تھی کہ اس نے بھٹ سے Crowd کا لفظ بدل کر Host کا لفظ استعمال کر دیا جس میں ترتیب کا خیال آگیا۔ اور جہاں ایک مرتبہ ادبیات فطرت نے فتح پائی کہ اس کا دل خوش ہونے لگا۔ اور اخیر میں اسے وہ پھول ناچتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اتنا ہی نہیں، نظم کے آخر میں شاعر نے یہاں تک لکھا ہو کہ اس کے دماغ پر اس منظر کا یہ اثر ہو کہ یاد کر کے بعد میں بھی اس کا دل خوشی سے بھر جاتا ہو اور ڈیفنڈل پھولوں کے ساتھ ناچنے لگتا ہو۔ پروفیسر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور مجھے شاباشی دی اور کہا کہ تنقید کرنے والے مفسر ابھی

زندہ ہیں۔ میں انہیں لکھوں گا۔ اس فیاض طبیعت مفسر نے بھی میری رائے پسند کی۔ اور وعدہ کیا کہ دوسرے ایڈیشن میں وہ اپنی رائے بدل دیں گے۔ یہ ہی فیاضانہ ادبی قدردانی۔ اب اس نقطہ نظر سے سحر جی کے شعر پر نظر ڈالیے۔ انھوں نے ”تاکی ہوئی“ کے بجائے ”چاہی ہوئی“ کیوں لکھا؟ میرا دل تو مشاہدے کی اس باریکی پر پھڑک اٹھتا ہو۔ ایک تو مچھلی پانی کے اوپر مرغابی کی طرح دیر تک تو تیرتی نہیں زرا بھل کر پھر ڈوب جاتی ہو۔ تاک کر نشانہ لگانے کا موقع ہی کہاں تھا۔ پھر نور جہاں کی غفلت کا نقشہ بھی تو دکھلا دینا تھا کہ مچھلی کو چاہا اور جھٹ طنچہ داغ دیا تاک کر نشانہ نہ لگایا۔ اور بھی سوچیے۔ نشانہ اگر تاک کر لگایا جاتا تو خطا کرنا مشکل ہی تھا۔ ادھر مچھلی کے غائب ہو جانے کا خوف اور یہ خواہش کہ وہ ہل جائے۔ اور ادھر جذبات کی غفلت۔ پس جلدی ہو گئی اور تعمیل کار شیاطین بود کا مقولہ سچ نکلا۔ نور جہاں کے طنچے کا شکار مچھلی نہ ہوئی بلکہ بے چارہ دھوبی۔ آہ! ہماری خواہش اور غفلت کتنی بڑی غلطی کر ادیتی ہو۔ تبھی تو اسے شیطننت کہا جاتا ہو۔ نزاکت پسند شاعر نے غضب کیا ہو۔ نشانہ لگنے کے بجائے ”پڑا جا کے نشانے کا اثر“ لکھا ہو۔ ”جا کے“ کے لفظ پر غور کیجیے۔ کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کس کو؟ نشانے کے اثر کر۔ نشانہ چاہا تھا لگانا کدھر اور اس کا اثر جا کے پڑا کدھر۔ پھر سحر جی نے نسیم کے طرز پر ایک شہزی ہی لکھ ڈالی ہو تو ان کی شاعری پر اس طرز کا اثر ہونا ایک ممضی بات ہو۔ ”چاہی“ اور ”مچھلی“ اور ”دھوبی“ کے تلازمے کا لطف اور ادھر ”بجائے“ اور ”جائے“ کے تلازمے کا لطف شعر کو عجب رنگت دے دیتا ہو اور وہ ان مول ہو جاتا ہو۔

یہی ناقد شناسی تھی، جس نے پریم چند اور سحر کو اردو سے ہٹا کر ہندی کی طرف مائل کیا اور دونوں کی ہندی میں اچھی قدر ہوئی۔ ہاں۔ پریم چند زیادہ خوش نصیب تھے کہ اردو نے بھی بالآخر کچھ ان کی قدر کی۔ قصہ مختصر سحر جی نے دونوں زبانوں میں کمال دکھایا۔ وہ اپنے خودنوشت حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”پریم چند آں جہانی نے متعدد قصے اور کئی ناول ہندی سے اردو میں ترجمہ کیے جو چھپ چکے ہیں۔ چند ناولوں کے نام یہ ہیں۔ رنگ بھوم، کرم بھوم، پریم آشرم، گودان وغیرہ۔ اسی طرح ہندوستانی اکیڈمی یو۔ پی۔ الہ آباد نے بھی تلسی داس نامی ہندی کتاب مجھے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے دی تھی، ترجمہ نیچے

ہوئے تو کئی سال ہو گئے مگر کتاب اب تک نہ چھپی۔

کتنے ہی اُردو شاعروں پر ہندی میں مضمون لکھے اور اسی طرح ہندی کے مشاہیر پر اُردو میں مضمون لکھے۔ سعدی کی کریکا کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ اور عمر خیام کی ۴۴۴ رباعیات کا ہندی میں ترجمہ اس سچ دج سے انڈین پریس الہ آباد نے چھاپا ہے کہ باید و شاید ان کی بڑی نظموں کے متعلق کچھ زیادہ علاحدہ علاحدہ لکھنے کا ارادہ ہے اس وجہ سے اس جزو میں زیادہ عرض نہیں کیا جاتا۔

## ثنوی سحر المعروف بہ شکنتلا

میں اڈ پر عرض کر چکا ہوں کہ یہ ثنوی مجھے بہت پسند رہی ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں اسے تلف ہونے سے بچا سکا ہوں اور اسی وجہ سے میں نے اس کی واضح تنقید بھی لکھی جو اگرچہ کالج میگزین میں شائع ہوئی۔ تنقید سحر جی کو اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے وہ پرچہ بڑی حفاظت سے رکھا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ اس میں چوں کہ سر تیج بہادر صاحب کے ایک ادبی سوال کا جواب ہے اور ثنوی کی بہترین تنقید ہے اس وجہ سے اب تیسرے ایڈیشن میں میں اسے بطور خاص دیباچے کے ضرور شائع کروں گا۔ اور پہلے دیباچے کو اس کے بعد جگہ دوں گا۔ مجھے وہ پرچہ ان کے فرزند کیلاش دہاتر شائق بی۔ اے سے موصول ہوا ہے اور میں اسی تنقید کو لفظ بہ لفظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں کیوں کہ مرحوم کی بھی خواہش تھی کہ اس کی اشاعت ایک بڑے ادبی دارے میں ہو اور میری بھی استدعا مرحوم کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ جب تیسرے ایڈیشن کی نوبت آئے تو یہ تنقید اس میں ضرور جگہ پائے۔

اقبال دہاتر اُردو کے لیے مایہ ناز ہیں۔ اگر ڈاکٹر اقبال نے تصوف میں نئی روح پھونک دی ہے اور اسلام کے خاص جز وحدانیت کو دلولہ انگیز زبان میں ادا کر کے اس میں جان سی ڈال دی ہے۔ اگر چکبست نے انیس اور دیر کی کامیاب تقلید کا حق ادا کرتے ہوئے مددس کو حب الوطنی اور قوم پرستی کا جامہ پہنایا ہے تو ہمارے اس شاعر نے اُردو ثنوی کو نیا رنگ دیا ہے اور رستم کے شاعرانہ معجزے میں اپنی سحر یانی سے ایک نیا افئوں پھونکا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو صاحب نے چکبست مرحوم کے صبح وطن کے

دیا چے میں ثنویات گل زار نسیم و میر حسن کی تعریف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر فرمایا ہو کہ آخر یہ ثنویاں ہیں کہاں لے جاتی ہیں؟ شاعری کے ان اراکین کی تصنیفات دنیاے ادب میں ضرور ہمیشہ سرت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ مگر اس وقت کے خیالات محدود ہونے کا اثر یہ تھا کہ حسن و حسن کی داستانیں لکھتے وقت اخلاقی صفائی اور روحانیت کے اعلیٰ مراتب کا خیال ان میں موجود نہیں ہو۔ تو کیا ثنوی کا طرز محض تغزل اور شعریت تک ہی محدود کر دیا جائے یا بالکل ہی ترک کر دیا جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ دنیا میں ایشیائی تہذیب اور شاعری کے برگزیدہ نمونے اسی صنف میں ہیں۔ سکندر نامہ، شاہ نامہ اور ثنوی مولانا روم اور تلمی داس کی راماین شائقین ادب کو متغیر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہمارے سحر صاحب نے بھی اپنی ثنوی دشینت و شکستہ میں حضرت نسیم کے طرز بیان کی تقلید کرتے ہوئے اس میں ایک خاص صفائی اور آمد پیدا کر دی ہو اور ساتھ ہی اخلاق کی ایک ایسی چاشنی اس قصہ حسن و عشق میں بھردی ہو جو انھیں کام ہو۔ المختصر سرترج بہادر صاحب کے سوال کا جواب اسی ثنوی میں موجود ہو۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ مناظرہ چلبست دشتر کے سلسلے میں حضرت شوق جیسے پند پایہ شاعر نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہو کہ نسیم کی تقلید کوئی آسان کام نہیں ہو تو سحر صاحب کی کامیابی ضرور قابل مبارکباد ہو۔

سحر صاحب میرے خاص دوست اور ہم سبق ہیں۔ اور مجھے اس بات کا فخر حاصل ہو کہ میرے دوستوں میں سے اردو میں سحر صاحب اور برج بھاشا میں پنڈت ست نراین مرحوم اس قدر بلند پایے پر پہنچے۔ مجھے فخر ہو کہ میرے مذاق سخن کے سبب سے میرے دوستانہ اظہار خیالات کو یہ ہر دو اصحاب بڑی خوشی سے قبول کرتے رہے ہیں۔ گویا اس طرح ان اصحاب کی خدمات کا اور ان کا ساتھ و نبالے ادب کی خدمت کا مجھے بھی موقع ملتا رہا ہو۔ میں نے اپنے ایک دوست کی کسی نظم پر کوئی تنقید اس وجہ سے نہیں لکھی تھی کہ مبادا لوگ کہ اٹھیں ”کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است“ مگر آج دنیاے ادب ان کے کلام کی داد دے رہی ہو۔ چلبست صاحب نے ثنوی کے تعلق سے فرمایا تھا ”نظم خوب ہو اور انشاء اللہ مقبول ہوگی“ منشی دیازین نگم ایڈیٹر زمانہ نے تو ثنوی کا دیباچہ کیا لکھا ہو سروس نظم کے بناء سنگار کا پورا سامان مہیا کر دیا ہو۔ منشی پریم چند ماسٹر جمالی میں تنقید کرتے ہوئے اس ثنوی کو قصص اور آورد سے پاک بتلاتے

ہیں۔ اور حضرت نیاز فتح پوری نے بھی جنوری ۱۹۷۷ء کے نگار میں شاعر کی کامیابی کی داد دی ہے۔ لیکن کے الفاظ بھی کچھ اس مفہوم کے تھے ”شاعر کی غیر معمولی کامیابی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“ درپیلے ایڈیشن کے تبصرے میں (۔ منشی تلوک چند محرم نے ایک بڑی تقریظ منظوم لکھی ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دکھائے ہیں لطف فن سے تونے	کیا حسنِ کلام کے نمونے
اد رنگ سخن یہ شنوی ہو	یہ حسنِ بیاں یہ شاعری ہو
آمد کے بہاد پر رواں ہو	دریائے لطافتِ بیاں ہو
یہ نظم وہ ہے جس کو سن کر	ہو روحِ نسیم شاد یک سر
منشی بہراج بہادر برق دہلوی بھی فرماتے ہیں۔	
جادو ہو ترے سخن سخن میں	ساحر ہو تو شاعری کے فن میں
دشمنت و شکستہ کا قصہ	ہو زورِ قلم کا تیرے حصہ
’اردو‘ میں یہ جدتِ سخن ہو	شیشہ ہو نیا۔ مئے کہن ہو
گلِ زارِ نسیم کی روش پر	گلِ کاریاں تونے کی ہیں یک سر
یہ شاخِ قلم کی گلِ نشانی	ہو زینتِ گلشنِ معانی
او برق یہ داستانِ رنگیں	ہو لائقِ آفرین و تحسین

میری سمجھ میں اور زیادہ سندت کی ضرورت نہیں ہے۔ ناظرین خود پڑھیں اور دیکھیں۔ شاعر نے ہندستان کی پاک تہذیب کے اثر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے مشاہدے، ان کے مکالمے سب خاص ہندستان کے ہیں۔ قصہ کالی داس سے لیا گیا ہے۔ مگر اسلوب اور ”طرزِ بیان“ کل شاعر کا اپنا ہے۔

میں اپنے تلمیذ کرت راماین کے مضامین کے سلسلے میں اکثر لکھ چکا ہوں کہ زمانہ شاعری کے اسی معیار سے کہ ”شاعری صرف قدرت کی آئینہ دار ہو“ اکتا گیا ہے۔ اس معیار نے اتنا ضرور کیا کہ تصنع اور سنیاں اڑان کو کم کر دیا مگر پھر بھی صرف ”تصویرِ حال“ پیش کر دینے سے ہم کو کوئی ہدایت نہیں ملتی۔

کون نہیں جانتا کہ موجودہ زمانے کے اس قسم کے ناولوں اور ناولوں سے بُرا دل اور بھی بُرا بن جاتا ہو۔ البتہ بچلے لوگ اس سے حسبِ خواہش نتیجہ اخذ کر لیا کرتے ہیں۔ سعدی نے فرمایا ہو کہ جب کسی بُرے آدمی کو کوئی کام کرتے دیکھو تو یہ نصیحت حاصل کرو کہ تم ایسا نہ کرو گے۔ مگر لطف تو جب ہو کہ نہ ملن کی طرح روکھی سوکھی شاعری ہو کہ جہاں مذاق اور تغزل کا نام نہیں اور نہ ”مُحَلّ کھلاتی گئیں گل چترے اڑانے آئیں“ دالی تغزل کی بھرمار کہ پڑھنے والا اخلاقی مایوسی میں پُکار اُٹھے۔

”در میانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ای بازی گویٰ کہ دامنِ ترکمن ہشیار باس“ یہ کمال گو اس حد تک نہ سہی جیسا راماین کے قادر الکلام شاعر تلمسی داس کو حاصل ہوا ہو۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک سحر صاحب کو بھی یقیناً نصیب ہوا ہو۔ تنوی میں ابتدا سے انتہا تک ایک عجیب اخلاقی اور روحانی چاشنی موجود ہو۔ دیکھیے نہ۔ پہلے ہی باب میں جنگل کی خوب صورتی کی تعریف میں شاعر کہتا ہو۔

صحرا رنگینیوں سے معمور	تھا منظرِ شانِ حُسنِ مستور
پھولوں میں نمودِ جلوہٴ حُسن	کلیوں میں وجودِ عقدہٴ حُسن
اک دفترِ رازِ برگِ تر تھا	تفسیرِ نکاتِ ہر شجر تھا
دریا امواج کی زبانی	کہتا تھا فسانہٴ نہانی
پانی میں حباب کی وہ مستی	دکھلا رہی تھی فریبِ ہستی
لائی تھی صبا ہوائے جنت	تھی پیشِ نظر فضاے جنت

حسنِ آشکار و حُسنِ مستور کا ایک میل ہو! آہ، گویا کل حصّہ ہی پانی میں ”حباب کی مستی“ کا نکتہ کھینچ کر ”فریبِ ہستی“ کا نمونہ پیشِ نظر کر رہا ہو۔ مگر یہ قول شاعر یہ حباب و رنگینیاں بھی ”حسنِ مستور“ کا ہی منظر تھیں۔ ”حباب کی مستی“ اسی بحر ”حسنِ مستور“ سے نکلی اور پھر اسی میں غائب ہو گئی۔ اب زرا آگے چل کر دیکھیے۔ مینکا دشوآمر کے پاس پہنچتی ہو۔

بے پردہ تھا نورِ حُسنِ دلکش	ظاہر تھا غرورِ حُسنِ دلکش
شونئی خرام کا یہ تھا حال	فتنہ تھا قدمِ قدم پہ پامال



تھاب پہ جو حُسن و عشق کا راگ      تاثیر میں تھی بھری ہوئی لاگ  
 خاموش طیورِ خوش نوا تھے      مدہوش صدائے نغمہ زاتھے  
 تما رقصِ پری بھی یوں نرودار      تھے وجد میں جھومتے نکلِ اشجار  
 بُت کیا غضب ہو۔ ”کھل“ کا لفظ اثر کے تمکین کا ایک نمونہ ہے۔ بھائی جب یہ اثر ہو تو بے چارے دشواستر

کا یہ حال تو واقعی قابلِ معافی ہے۔ اور مایا کی تخیل کا ایک معمولی نمونہ ہے۔

دل گھر تھا خدا کا اب ہوا دیر      کعبے کی صم نے آکے کی سیر  
 ہر چند وہ تھا صراطِ رم پر      رگتا تھا مگر قدم قدم پر  
 ”مانیں گے تو عشق میں بیکل کر“      ارمان نے کہا مچل مچل کر  
 اہ۔ انسان! تو کیا بھاگ سکتا ہے؟ جذبہ قدرت تو تیرے ساتھ ہی ہے جو ارمان کی شکل میں کسی پرزور لہجے  
 میں کہتا ہے ”مانیں گے تو عشق میں بیکل کر“ عابد بعد میں تاسف سے بے قرار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے  
 ”تقوے کا بٹا نشان صدافس! محنت ہوئی رانگاں صدافس!“

یہ کہ کے وہ زار زار رویا      بس پھوٹ کے ابرودار رویا  
 ”فطرتِ نیکا کی شکل میں اس تاسف پر مسکراتی ہو! تضاد کس قدر پر لطف اور معنی خیز ہے  
 دیکھی جو پری نے کج ادائی      کچھ فنج پر اپنی مسکرائی  
 معصوم تکنتلا جس طرح بگن میں پڑی ہوئی ہے اس کی تصویر حسبِ ذیل ہے

بلوے سے ہو گرد و خستِ تنویر      آئندہ میں حُسن کی ہو تصویر  
 اک ہنس ہو سر پہ سایہ انگن      شعلہ سا نہاں ہو زیرِ دامن  
 خوبی کی ہو اک زالی صورت      پیاری سی ہو بھولی بھالی صورت

کیا دل آویز نقشہ ہے۔ زہد اور تصوف کے ابر نیساں سے فطرت نے نیکا کی شکل میں گویا صدف بن کر یہ  
 دُرِ کیتا پیدا کیا! شکنتلا، کون؟ صرف نامک کی مشقت نہیں، بلکہ مہراج بھرت کی ماں۔ کورو، پانڈو  
 جن کے کارنامے (مہراج یویشتر کے دھرم والے خیالات کے) جہا بھارت کے اوراق اب بھی

نہایت عزت کے ساتھ بیان کرتے ہیں انہی کی اولاد میں سے ہیں۔

نیں تو یہ کہوں گا کہ اس آئینے میں صرف ”حسن“ ظاہری کی تصویر نہ تھی بلکہ ”حسنِ مستور“ کی جھلک بھی تھی۔

کارِ یلیٰ نیست ایں کارِ من است      حُسنِ یلیٰ عکسِ رخسارِ من است  
ہنس کا سایہ ایک طرف تو اس بھولی بھالی صورت کے لیے ایک ظاہری بے ساختہ کشش کا نمونہ ہو اور دوسری طرف گویا قدرت زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ اس انوکھی شخصیت کی حفاظت کی ذمہ دار خود قدرت ہو۔ ہر سہ اشعارِ بالا کی تشبیہات کی لطافت اور نفاست بیان سے باہر ہو۔ حُسن ہو مگر ابھی بھولا بھالا۔ شعلہ ہو مگر زیرِ دامن۔

اس طرح جب دشمنیت کج ادائی کرتا ہو اور کنوڑشی کے بھیجے ہوئے چیلے بھی شکنتلا کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ بے کسی کی حالت میں آہ و فغاں کرتی ہوئی کہتی ہوئے

اے عشق بتا کدھر رداں ہوں؟      آوارہ ہوں اور خستہ جاں ہوں  
یوں سوچ میں وہ کھڑی تھی ناچار      ناگاہ ہوئی      یدِ نکا نمودار  
ہالے میں لیا قمر کو آکے      فردوس کو لے چلی اڑا کے

دیکھیے اسی فطرت نے پھر تحفظ کا انتظام کیا اور جس رُوحانیت کے بحرِ فردوس سے وہ قطرہ اس دنیا میں خدا کی ابرِ رحمت سے آیا تھا وہیں واپس جا رہا ہو۔ ہالے اور قمر کی تشبیہ بھی کتنی نفیس ہو۔

ناظرین۔ اس روش سے تو ہر شعر پر کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہو مگر اس مضمون کے لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہو کہ جا بجا سے چند اشعار لے کر ”مشتے نمونہ از خردارے“ کے مطابق درج کردوں، اور بس۔

دوسرا باب شہنوی میں حُسن و عشق کی شاعری اور دل کش مصوری کا ایک انیسو ہو۔ دیکھیے نہ شکنتلا کا سراپا کس قدر قابلِ داد ہو۔

خوبی کا مجتمہ وہ سر تھا یا حُسن کی شاخ کا ثمر تھا  
پھولوں سے بے تھے بال سارے تھے چرخ پہ جلوہ گر سارے  
(آہ، مگر ان میں یہ خوش بو کہاں؟)

تھی آئینہ جہیں کی تنویر دکھلا رہی عکسِ حسنِ تقدیر  
تھا آنکھوں و پتلیوں سے جلو کونین کے رنگِ مختلف کا  
پلکیں تھیں کہ نصف چاند تھے دو تو سین کہوں میں ابروؤں کو  
رخساروں میں کچھ عجب ساں تھا سحرین کا باہمی قراں تھا  
بینی میں ہلال کا تماشا تھا طرفہ جمال کا تماشا

یہ تصویر کا ساکت حصہ تھا۔ اب زرا حرکت کا لطف دیکھیے

تھے محو خرامِ پائے گلِ فام اک حشر بپا تھا جس سے ہر گام  
دو ساتھ سیلیاں تھیں گلِ فام انسویا اور پریمیدا نام

(شاعر نے قبتے کی وطنیت کا اس قدر خیال رکھا ہو کہ ناموں کا تلفظ بھی نہیں بگاڑا۔ یہ نہیں کہ  
میرزا کو اندر لکھتے۔ دونوں سکھیوں کے ناموں کے ٹھیک تلفظ کا قائم رکھنا بھی قابلِ تحسین ہو)  
ساحسِ نزاکتِ بدن تھا سادہ سا لباسِ زیبِ تن تھا

(پہلے میرے دوست نے ”ہلکا سا“ لکھا تھا جو نزاکتِ بدن کے لیے خوب موزوں تھا۔ پھر  
”سادہ سا لباس“ کر دیا جو اپنے بے تفسیحِ سادگی سے نزاکتِ بدن کو کچھ ابھار ہی رہا ہو اور ”زیبِ  
تن“ کے ساتھ عجیب تضاد کا لطف دے رہا ہو)

تھا مغلِ بدنی کا پاس یک سر جسموں پہ مگلوں ہی کا تھا زیور  
گو وضع میں سادگی کا تھا ڈھنگ پھوٹا پڑتا تھا حُسنِ خوش رنگ (وہ بھی ساکت نہ رہ سکا)  
عالم تھا شباب و دل لگی کا تھا دُور عجب ہنسی خوشی کا  
بھر بھر کے گھرے وہ کھینچتی تھیں ہر شاخ و شجر کو سینچتی تھیں

دہ عارضِ سُرخِ پر عرق سے      بارش کا نظارہ تھا شفق سے  
 اڑ اڑ کے وہ آنچلوں کا پھنسنا      مٹھ پھیر کے شرم سے وہ ہنسنا  
 (کیسی جیتی جاگتی تصویر ہو کیا تصویری کیفیت ہو) سے  
 اک اک کا مذاق کی دہ لینا      اک اک کا غضب وہ چھینٹے دینا!  
 جب دشینت و شکنتلا یک جا ہوتے ہیں تو شاعرِ مسادات اور تضاد کے دو نغمتے پیش کرتا ہو جو  
 قابلِ دید ہیں سے

### مسادات

دونوں میں غضب کا بانک پن تھا      دونوں میں تناسبِ بدن تھا  
 دونوں تھے فردِ مہرِ خوبی      دونوں تھے مہرِ سپہرِ خوبی  
 تصویرِ مثالِ حُسنِ دونوں      تنویرِ جمالِ حسنِ دونوں  
 اب تضاد دیکھیے اور عشق کے اثر سے دونوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔ دشینت شکارِ عشق ہو چکا ہو اور  
 یہی باعثِ فرق ہو سے

تھا عشق سے اب مگر یہ عالم      مہتاب سے نورِ مہر تھا کم  
 شوخی سے وہاں نہ تھی اسے کل      بے تابی سے تھا یہاں یہ بے کل  
 (تضاد میں مسادات کا نباہنا شاعر کے کمال کی ایک مثال ہو)

داں پر تو نور سے پُرضیا چاند      یاں سایہ مہر سے مہر تھا ماند  
 (یہ شعر کیا ہو شاعری کا ایک معجزہ ہو۔ حضرت نسیم بھی ضرور اپنے مقلد کی بہشت سے داد دیتے  
 ہوں گے)

خنداں تھی وہاں وہ صورتِ گل      نالاں تھا یہاں یہ مثلِ مبلبل  
 وصالِ یار کا بہانہ بھی عجیب دلکش ہو سے      مڑ کر ناگاہ ایک بھوڑا  
 چہرے پہ شکنتلا کے پہنچا (گویا کنول کا دھوکا ہوا)

بھال دیو - ادھر سے ہٹ گئی پھر      جھکی - ٹھکی - سمٹ گئی پھر  
ہاتھوں کو پٹک پٹک اڑایا      آنچل کو جھٹک جھٹک اڑایا  
آخر چلتائی ڈر کے مجبور      ”سکھیو، دوڑو اسے کرو دوڑ“  
”پھر ہائے وہ دیکھو آ رہا ہے      ناحق یہ مجھے ستا رہا ہے“

(کتنے جذبات اور حرکتیں نظم کی گئی ہیں؟ بھولاپن، خوف، نزاکت، بے کسی سب کا ایک مجسم مرتع ہے)  
سکھیاں مذاق کرتی ہیں اور کہتی ہیں مظلوم کا فریاد رس تو دشینت ہے، وہیں تیری فریاد سنی جاسکتی ہے۔ یہ سنتے  
ہی دشینت کو ایک بہانہ ملتا ہے۔

پہنچا دیں جو تھی جاے امید      اک برج میں آئے ماہ و خورشید  
”قاطع ہوا کون آشتی کا؟“      ”دعویٰ ہوا کس کو سرکشی کا؟“

(آخری شعر میں دبدبہ شاہانہ کی عجیب پُر لطف شان ہے)

اس کے بعد گندھرپ کی رسم کے موافق شادی وغیرہ کے نقشے ہیں۔ ناظرین - گندھرپ شادی کثرتی  
ورن میں جائز ضرور تھی مگر یہ اصول شادی کہ ایک مرتبہ شادی ہونے پر دفاے صادق ہمیشہ قائم رکھنا  
ضروری اور لازمی ہو اس رسم شادی کے ساتھ بھی وابستہ تھا یہ ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ اب ہجر کا نقشہ  
ملاحظہ فرمائیے۔

شکنتلا خیال یار سے گفتگو کرتی ہو۔ کیا نفیس تخیل ہو۔

کہتی تھی کہ ”اے خیالِ دل دار      پر تو فلکِ جمالِ دل دار“  
”تصویر کا عکس سے ہو کیا کام؟      کیا نقل سے اصل کا بھلا کام؟“  
”ہر خیر اسی میں تو بھی جا جا!      جلد اب مجھے چھوڑ کر چلا جا!“  
”کچھ لائے نہ رنگ ساتھ تیرا      ہو سرخ نہ خوں سے ہاتھ میرا“  
”پھٹتے گا ہوگا تو پشیمان      کر دوں گی میں تجھ پہ جان قربان“

رسموں کے اس شعر پر کہ ”تم مرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا“ غالب

نہایت مفتون تھے، کون جانے کہ ان اشعار پر اس سے کس قدر زیادہ داد کے مستحق حضرت سحر ہیں)۔

کہتی تھی کہ ”اے بہارِ قدرت ! اے ہوشِ رہا نگارِ قدرت !“

”ہر جب کہ کششِ تری ادا میں کینچا اے کیوں نہ پھر فضا میں !“

”زگس کی پھری تھی چشمِ بدخو، روکا نہ اُسے چلا نہ جادو“

”سوسن، تو ہی خوش بیان ہوتی گویا منہ میں زبان ہوتی !“

”سیدھا نہ تھا حیف تو بھی شمشاد ! کچھ آئی نہ روک تھام کی یاد“

”سبزے پہ بھی نیند کا رہا بار پکڑے نہ لپٹ کے پائے دلِ دار“

حضرت نسیم کے اشعارِ ذیل سے ان کا موازنہ کیجیے۔ اور شاعر کی کامیابی کی داد دیجیے۔

اے خارِ پڑا نہ تیرا جنگل مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

سنبل میرا تازیانہ لانا شمشاد اے سؤلی پر چڑھانا

سوسن نے زبانِ درازیاں کیں زگس نے نگاہِ بازیاں کیں

کتو ریشی شادی کی خبر سے نہایت خوش ہوتے ہیں اور کس پدری محبت سے شکنتلا کو رخصت کرتے

ہوئے کہتے ہیں ۔

سوچا کہ ہو گلِ چمن کو موزوں شوہر ہی کا گھر ہو زن کو موزوں

کرنا طاعتِ نثار ہو کر رہنا خدمتِ گزار ہو کر

اکسیر ہو خاکِ پاے شوہر ہو حق کی رضا رضاے شوہر

ہندو معیارِ زوجیت کی رُوح ان اشعار میں عجیب اختصار مگر اثر کے ساتھ بھری ہوئی ہے۔ یہی ہو رُوحِ

سادری جس کا قائم رکھنا بقول شری ہتی سروجنی ناندو جی کے ہر ہندو عورت کا فرض ہے۔ چاہے وہ کسی

جھوپڑے میں بیٹھی ہوئی ہو۔ یا طلائی تخت پر مسد گریں ہو۔ ساتھ ہی ساتھ گلِ اورچمن کا استعارہ اپنے

شاعرانہ طرز میں نہایت دل آویز ہے۔ یہ تو ایک پہلو، جو جس میں پدری محبت پاک محبت پر مفتون نظر آتی

ہے۔ مگر جیوں ہی پاکیزگی میں اشتباہ ہوتا ہے تو ریشی کیا اس کے چیلے جو شکنتلا کی حفاظت کے لیے بھیجے گئے

تھے وہ بھی نفرت کے ساتھ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں سے

بولے وہ کہ ”اے کشیف دامن! کس منہ سے چلے گی اب تو تپوں دتضاد کس قدر بل ہوسے

چھوڑا راجا نے ہاتھ تیرا بہتر نہیں اب تو ساتھ تیرا

یہ کہ کے چلے وہ، منہ کو موڑا پیچھے اسے نقش پا سا چھوڑا

ایک طرف گندھرپ بواہ کی آزادی اور دوسری طرف سختی کے ساتھ پاک دامانی کا تحفظ ہندو معیارِ زوجیت

کے دو خاص پہلو ہیں۔ ہمارے یہاں آزادی کا مقصد بے قید و بے گام آزادی کبھی نہیں رہا اور نہ ہونا چاہیے۔

رشی دُرباسا کی بددعا کی وجہ سے راجا نے ہاتھ چھوڑا تھا۔ اول تو بے چارہ کل ماجراے عشق بھول

ہی گیا تھا کچھ غصہ کچھ رحم، مگر پاس اخلاق کی کشش میں راجا دُشنت نے شکنتلا کو یوں جواب دیا سے

راجا نے کہا ”دکھا نہ گھاتیں خاموش ہو بس بنا نہ باتیں

بدنام نہ نیک راہ کو کر ماخوذ نہ بے گناہ کو کر

چیلے سے چلی ہو لینے مجھ کو آئی ہو فریب دینے مجھ کو (کیا لین دین ہو!)

خود رفتہ نہیں کہ بھولی جائوں کچھ یاد ہو تو زباں پہ لاؤں

جب رشتہ نہیں بناہ کیسا؟ بیگانے سے میل و بیاہ کیسا؟

ہرچند ہو پاس مقصدِ خیر ممنوع ہو صحبتِ زنِ غیر“

ہمارا راجا بشواتر راج رشی تھے۔ راجپوت عورت کو یہ اتہام توڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔ کچھ بے کسی

کی جھنجھلاہٹ بھی تھی۔ اس کا جواب کیسی خودداری سے بھرا ہوا ہو سے

”خود ہو کے ذلیل اے بد انجام کرتا ہو مجھے ذلیل و بدنام“

”اب آن پہ تو نہیں ہو قائم ایمان پہ تو نہیں ہو قائم“

”بھولا رو معدلت پناہی یعنی آئیں بادشاہی“

”یوں عاملِ فرض جب نہیں تو بس راج کے قابل اب نہیں تو“

”ہو دادرسی کی طرفہ ایجاد فریاد سے مجھ پہ ہو یہ بے داد“

مگر مایوسی و انسانیت اور فرضِ زوجیت کے احساس سے متاثر ہو کر راضی بہ رضا سے حق ہوتے ہوئے پھر یوں کہتی ہو ۛ

”اچھا قسمت کا جو لکھا ہو راضی ہوں اسی میں جو رضا ہو!“  
 ”امید سے آئی شاد ہو کر اب جاتی ہوں نامراد ہو کر“  
 ”یاد آئے گی میری جب کسی دن پچھتائے گا سوچ کر کسی دن“  
 ”محروم ہوں اپنے ہم نسل سے رشتہ جوڑوں کی اب اجل سے“

ایڈورڈ کارپنٹر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ معیارِ انسانیت یہ نہیں ہو کہ ساری فطرت سے الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی عمارت علاحدہ بنائیں۔ بلکہ انسانی تمدن کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ فطرت کی رُوح سے اس کے پہاڑ، دریا، سمندر، تارے، آب و ہوا کی زندگی سے یگانگت ہو جائے یعنی یہ لطف ہو ۛ  
 ”تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری“ قادر الکلام شاعر نے ان جابوں کی ”مستی“ کے فسانے میں دریا کی لہر اور امواج کی رُوح سے ان کو کبھی علاحدہ نہیں ہونے دیا اور شکستہ کی زندگی کی ترتیب تو ایسی ہو کہ معلوم ہوتا ہو گویا فطرت کا ایک نخل کھل کر چل پڑا ہو۔ بھوڑے کا دھوکا تو آپ نے دیکھا ہی ہو پھر جنگل سے رخصت ہونے کا منظر اس یگانگت کی ایک انوکھی مثال ہو۔

پہلے سکھیوں سے مخاطبہ کر کے کہتی ہو ۛ  
 ”تارے مری آنکھ کے ہیں یہ نخل“  
 ”یوں لطف سے شاد کام رکھنا شاداب انھیں مدام رکھنا“

پھر ۛ

دیوار سے در سے بل کے دوی ایک ایک شجر سے بل کے دوی  
 درو کے کہا کہ ”او گلِ باغ ہیں یاد کو تیرے دل کے بس درغ“  
 ”زبس“ کا لفظ کیا ہو افسوس ہو! )

”بھولے گا مدام تو اثر سے سینچے جاتی ہوں اشکِ تر سے!“



”ای آہوے دشت ہو اجازت اب اپنی سکمی کو دو اجازت“ (سکمی کا لفظ ایک جادو ہے)  
 ”ای جملہ طیور نغمہ خواں ہاے اٹھتا ہو اب اپنا آشیان ہاے“ (کیا تلازمہ ہے)  
 ”تفریح فضاے دشت رخصت ترویج ہواے دشت، رخصت“

مضمون طویل پکڑتا جاتا ہو اور دل اقتباسات سے سیر ہی نہیں ہوتا اس لیے جبراً اپنے آپ کو روک کر آپ سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ فطرت اور اس کے اندر کی پاک رُوحِ درجن کو صوفی اور ویدانتی پر تاہما کہتے ہیں) کے آغوش میں اپنی زندگی کی ترتیب دیں تاکہ یہ قول ٹیگور جی ”شہری دیواروں کا طرزِ معاشرت ضرورت سے زیادہ آپ کو قدرت کی یگانگت سے جدا نہ کر دے۔“

صرف دو تنقیدوں کے اقتباس یہاں اضافہ کیے جاتے ہیں۔

رسالہ ”اردو“ حیدرآباد دکن بابت جنوری سنہ ۱۹۲۷ء ع :-

”اس میں شک نہیں کہ حضرت سحر بہت پختہ کار شاعر ہیں اور فنِ شعر پر قدرت حاصل ہو۔ اس شاعری میں انھوں نے محلِ زارِ نسیم کا پورا نتیجہ کیا ہو۔ اور اس اعجاز اور اختصار سے کام لیا ہو کہ باوجود اس کے کہیں تعقید ہو اور نہ زبان کے روزمرہ اور محاورے سے ہی الگ ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں غزلیں بھی آگئی ہیں جن سے حضرت سحر کی خوش گوئی اور پختہ کلامی کا پتا لگتا ہو۔ . . . .“

حضرت اعظمی (احسن سمیع صاحب مرحوم) اپنی تنقید ”شعری سحر جو زمانہ“ سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی ہو تحریر فرماتے ہیں :-

”جادو دہی ہو جس کو آج سے ہزاروں برس پہلے کالی داس نے جگایا تھا لیکن جناب سحر نے اسے اپنی جادو بیانی سے اعجاز کا ہم پایہ بنادیا ہو۔ . . . . سچ پوچھیے تو یہ شعری ہر حیثیت سے شعری محلِ زارِ نسیم کا جواب ہو وہی فصاحت، وہی لطافت، وہی جلوہٴ اعجاز۔ اس میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہو کہ وہ نقشبِ اول ہو اور یہ نقشبِ ثانی۔ اب یہ فیصلہ ناظرین کے ذوقِ ادب پر منحصر ہو کہ زیادہ لطافت نقشبِ اول میں ہو یا نقشبِ ثانی میں . . . . .“

دو بہ دو گفتگو میں تو اعظمی صاحب نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تنقید بہت قلم روک کر لکھی ہو درند

مجھے تو خود نقشِ ثانی زیادہ پسند ہے۔ اور کچھ دیے ہی وجوہات تھے جیسے کہ رسالہ اردو کے اقتباس میں اوپر آچکے ہیں۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ شوقِ قدوائی میرے استاد ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں علم نہیں کہ اکثر آپ ان سے بھی بازی مار لے گئے ہیں گو اخلاقاً میں نے اپنے استاد سے موازنہ کرنا تسلیع شدہ تنقید میں مناسب نہیں سمجھا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے صوبے میں ایسی شہنشاہی کو کسی بھی درس گاہ کے کورس میں حکم نہ ملے اور نہ کسی کتاب میں ہی اس کا اقتباس نظر آئے۔

## کریمیا اور رباعیاتِ عمر خیام

سماجی خیالات کا ان کی زندگی کی تنظیم پر اثر ہم دیکھ چکے ہیں اسی لیے کریمیا سہی کے سب ہی کریمیا کلام کو وہ بہت پسند کرتے تھے چنانچہ جب فارسی نظموں کے ہندی میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے ہی ان کی نظر کریمیا پر گئی جسے انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ترجمہ کیا۔ یہی سادگی اور قریب قریب ویسی ہی روانی قائم رکھی ہو۔ اور جہاں تک ہوسکا ہو خیالات کا زور بھی وہی ہے۔۔۔

پھر ہی ان کا کمال رباعیاتِ عمر خیام کے ترجمے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ دنیا کے ادب میں عمر خیام کے ترجمے بہت ہوئے ہیں۔ انگریزی کا فٹزجرالڈ کا ترجمہ تو اس قدر مقبول عام ہوا کہ اس نے انگریزی زبان میں ایک نیا طرزِ شاعری ہی پیدا کر دیا لیکن یہ معجزہ کسی سے نہ ہوا کہ چار مصرعوں کا ترجمہ سارے ہی مصرعوں میں ہو اور وہی لطافت وہی فصاحت اور وہی زور قائم رہے۔ کہیں کہیں تو اسلافِ ادب وغیرہ بھی بالکل وہی ہیں خاص کر جہاں ہندی میں قافیہ بندہ گئے ہیں وہاں تو وہ بات بیدار ہوگی ہو کہ ترجمہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

مہراج روپ کلاسی کہا کرتے تھے کہ ہمیں چوٹی کی طرح وہ قوتِ امتیازی پیدا کر، چاہیے کہ ہم جذبات کے مدوجزر سے اس طرح روحانیت کو نکال لیں جیسے بالو کے ساتھ بلی ہوئی خنکر کے باریک سے باریک ریزے کو چوٹی نکال لیتی ہو۔ مگر یہ کام مشکل ہے۔ سترجی جیسے ماہر ہی کر سکتے ہیں اور اس لیے ان کا خاص ادبی کارنامہ رباعیاتِ عمر خیام کا صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ہے کہ مداحہ علاحدہ دولان

کر کے انھوں نے زمین والی رباعیات کو آسمان والی رباعیات سے علاحدہ کر دیا ہو۔ دُنیا ہر شاعر میں جس میں شراب کا ذکر ہو رُو حانیت کی شراب تلاش کرتی ہو مگر سحر جی نے صاف لکھ دیا ہو کہ ایسا مناسب نہیں ہو۔ نمونے کے طور پر چند رباعیات سحر جی نے دیباچے میں ہی دے دی ہیں۔ اور کہا ہو کہ یہاں سوائے شراب کے اور کوئی مطلب لبا ہی نہیں جاسکتا۔

سوچنے کی بات یہ ہو کہ حافظؔ اور مولانا رومؔ کے کلام کو جو مقبولیت تصوفؔ میں حاصل ہو وہ خیامؔ کے کلام کو کیوں نہ ہوئی؟۔ خیامؔ کی رباعیات میں شاعری کا معجزہ سہی، مگر تصوفؔ کے لحاظ سے ان کا وہ پایہ ہرگز نہیں جو حافظؔ کی غزلیات کا ہو۔ بات یہی ہو کہ مولانا رومؔ کا کلام تو بالکل صاف تصوفؔ ہو اور حافظؔ کے کلام میں شکر کے ساتھ بالو کی آمیزش کم ہو مگر خیامؔ میں آمیزش کا وہ حال ہو کہ سحر جی کے ایسے لوگ ہی وہاں شکر کو بالو سے علاحدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خیامؔ کے کلام میں صاف بیانی ہو ہی نہیں، لیکن اکثر اشتباہ کی گنجائش پائی جاتی ہو۔

## تَشطِیر

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

[ اُردو نظم میں تضمین اور تخمیں کا رواج مدت سے چلا آتا ہے لیکن ”تَشطِیر“ کے معنی ہیں نیمہ رباعی۔ یعنی آدھالے اُڑنا۔ اور شاعری میں یہ ایک قسم کی تضمین ہے جس میں شعر کے پہلے مصرع پر دوسرا، اور دوسرے مصرع پر پہلا مصرع اپنی طرف سے لگا کر اُسے دوبیتی بنادیتے ہیں۔ اُردو کے لائق اور ہونہار شاعر جناب محمود اسرائیلی صاحب نے اسی نئی طرز میں طبع آزمائی شروع کی ہے جس کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسرائیلی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں :-

”آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ خاکسار اصنافِ سخن میں تَشطِیر کا اضافہ کر رہا ہے۔ تَشطِیر عربی شعرا میں مقبول ہے۔ مگر ابھی تک اُردو اور فارسی شاعروں کے کلام میں اس کی مثالیں نہیں ملتی۔ میں نے ابتداءً میر تقی اور غالب وغیرہ کی چند غزلیات کو مشطر کیا تھا۔ اب افادیت کے خیال سے علامہ اقبال مرحوم کے اُردو کلام کے بعض پُر لطف اشعار اور ان کی مسلسل نظموں کو مشطر کرنا شروع کر دیا ہے۔ چند تَشطیریں مبطور نمونہ ارسال خدمت میں سونپتا ہوں کہ (آئندہ) انھیں کتابی صورت میں شائع کرادوں تاکہ ان کے بلند پایہ اشعار کی وضاحت سے عوام کو فائدہ پہنچے اور اُردو کے موجودہ شعرا کو تَشطِیر نویسی کا شوق پیدا ہو۔“

مصنف لطیف اُردو شاعری میں داخل ہو جائے“

[ ادارہ ]

## لالہ صحرائی

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی ..... یہ آبلہ پائی اور یہ بادیہ پیمائی  
جادہ ہو نہ منزل ہو رہ رو ہو نہ رہر ہو ..... مجھ کو تو ڈراتی ہو اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو ..... اک میں بھی تماشائی، اک تو بھی تماشائی  
تو دیدہ حیرت سے رہ رہ کے جو نکلتا ہو ..... منزل ہو کہاں تیری ای لالہ صحرائی؟

خالی ہو کلیوں سے یہ کوہِ دکر درنہ ..... ہر سنگ کے سینے میں ہو طور کی رعنائی  
ہر داغ ترا روشن، ہر داغ مرا روشن ..... تو شعلہ سینائی میں شعلہ سینائی

خواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو ..... ہو بلبل اس قلم کا گنبدِ مینائی  
ہر درختِ جنباں میں عالم نئے قصاں میں ..... ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہو گہرائی

اُس سوچ کے ماتم میں روتی ہو بھنور کی آنکھ ..... جس کا دل لرزاں تھا محرومِ توانائی  
وہ مقصدِ ہستی میں ناکام رہی آخر ..... دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہو گرمیِ آدم سے ہنگامہ عالم گرم ..... ہو اس ہی کی ہستی سے یہ انجمنِ آرائی  
حیرت سے اسے نکلتی ہو چشمِ فلک اب تک ..... سورج بھی نہاشائی اتارے بھی تماشائی

ای بادِ بیانی مجھ کو بھی عنایت ہو ..... تو نے جو عطا کی ہو اس لالے کو زیبائی  
حیرانی و غمِ ناکی خود داری و یک سوئی ..... خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

## تشریح دیگر

آتی ہو دم صبح صدا عرش بریں سے..... سرمایہ کونین ہو انسان تری خاک  
تیری نظر و فکر پر روشن تھے سادات..... کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک؟

کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق..... بسل تھیں کبھی جس کی رگ سنگ درگ تاہک  
کیوں پردہ گیتی کو نہیں کرتا دوپارہ..... ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

تو ظاہر و باطن میں خلافت کا سزاوار..... دارائے زمیں - حضورِ منزل افلاک  
کیا فطرتِ حاکم بھی کبھی ہوتی ہو محکوم؟..... کیا شعلہ بھی ہوتا ہو غلامِ خس و خاشاک؟

مہر و دمہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟..... کیوں تیرہ ہو اب تیرا وہ آئینہ ادراک؟  
کیوں دیدہ بے خوف سے جاتی رہی ہیبت؟..... کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

اب تک ہو رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں..... پر سرو ہو وہ صورتِ اشکِ دلِ غمِ ناک  
وہ بوش نہ وہ عزم نہ وہ قوتِ احساس..... (زگرئی افکار نہ اندیشہ بے باک !

روشن تو وہ ہوتی ہو جہاں میں نہیں ہوتی..... اور دیکھتی ہو صرف جہاں کے خس و خاشاک  
جس عقل کی قسمت میں نہیں جلوہ عرفاں..... جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہو نگہ پاک

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری..... عشرت نے کیا چاک ترا دلِ فقیری  
پھر عشق کی سوزش سے زرا رُوح کو گرما..... ای کشتہ سلطانی و ملائی و پیری

## روح تبسم، جگر

(از جناب سید مختار حسن صاحب مختار بی اے ال ال بی - ہیڈ ماسٹر)

نام در شاعر دنیائے آب و گل میں اپنی ممتاز شخصیت لے کر نمودار ہوتا ہے۔ نوع انسانی کو اپنی دماغی رنگ آفرینیوں سے، تخیل کی نزاکتوں سے، جذبات لطیفہ کی مغل افشانیوں سے، حسین الفاظ کی نمایاںوں سے مسحور کرنے کے بعد اس گلستاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اپنی کبھی نہ مٹنے والی یاد کے غیر فانی نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ دنیا والے اس کے گیتوں سے اپنی رُحوں کو مترنم کرتے ہیں۔ تنوٹیت پسند شعرا نے دنیا کا تاریک اور ظلمت آگس رخ دیکھا۔ اس کو غم و اندوہ، کلفت و اضطراب کا گہوارہ سمجھا اپنی زندگی کو وقف غم کر دیا اور غم آمد آنکھیں لیے موت کی آغوش میں جا لیٹے۔ برخلاف اس کے بعض شعرا نے جذبات غم سے متاثر ہو کر آنسو بہانا انسانیت کی ذلت سمجھا۔ وہ مسکراہٹیں لیے ہوئے پیدا ہوئے اور مسکراہٹوں سے تازیت کھیلنے رہے۔ اس کا نمونہ ہمارا عظیم المرتبت شاعر جگر ہے جسے ہم بجا طور پر ”روح تبسم“ کہہ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ شعرا کی قنوطیت کے چند خاص اسباب یہ ہوتے ہیں :-

- (۱) شاعر محسوس کرتا ہے کہ قوانین اخلاق قوتِ مادرا کے نافذ کردہ ہیں اور انسان مجبوری و بے اختیاری کے عالم میں یہ سب کچھ سہا ہوا دیکھا کرتا ہے اور اس کے قواسم ذہنی انہی قوانین کے تحت کام کرتے ہیں تو یا اس کے دل پر حزن و ملال کا کوہ گراں گرا دیتی ہے، اس کی آنکھوں سے اشکِ خونی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔
- (۲) یا جب شاعر کے ذہن میں قربِ الہی کا تصور مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ خدا ضمیر کی آواز کی شکل میں احکام صادر کرتا اور دھمکتا رہتا ہے گویا کہ غیر تنہا ہی فرض فانی انسان کے دوش پر رکھ دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں شاعر مغموم ہو کر رونا شروع کر دیتا ہے۔

(۳) شاعر راہبانہ فلسفہ اخلاق سے متاثر ہو کر انسان کو خود اس کی ذات سے علاحدہ کر دیتا ہے اور پھر

یہ محسوس کر کے کہ وہ اور اس کی ذات دو مختلف چیزیں ہیں گھبرا اٹھتا ہے۔ غم میں ڈوب کر نغماتِ درد و غم الاپنا شروع کر دیتا ہے۔

(۴) یا جب شاعر کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آتا کہ کائنات کا مقصد اصل اخلاق ہو اور اس کی آخری قوت نیکی ہو اور انسان کا فعل یہ ہو کہ کائنات کے اس مقصد کو سمجھے اور اپنے ارادوں کی تشکیل اسی مقصد کے مطابق کرے اپنے افعال کو اسی سرچشمے سے سیراب کرے اور اسی کو حقیقی اصولِ زندگی گردانے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ ان حقائق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے شاعر یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ محدود و لامحدود، مذہب و اخلاق میں ایک ہی رشتہ یگانگت موجود ہے۔ اور فکر کی اس نارسائی سے دنیا اسے بے ترتیبیوں کا ایک جستمہ نظر آنے لگتی ہے اور یہ خیالی بے ترتیبیاں اسے رونے پر مجبور کرتی ہیں۔

لیکن جب ہم جگر کی شگفتہ روی اور کشادہ بینی کا مطالعہ کرتے ہیں تو سادہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نظریات، زندگی، خدا اور کائنات کے متعلق نہایت مستحکم اور استوار ہیں۔ اس کی شگفتگی اس بات کا پتا دیتی ہے کہ یہ سمجھتا ہے کہ قوتِ مادر کا اخلاقی ارادہ صرف خارجی طور ہی پر کارفرما نہیں ہے بلکہ خود انسان کے وجود میں اسی کی جلوہ آرائی ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے ۷

تمام اصل و حقیقت کا آئینہ ہوں میں

خدا نہیں ہوں مگر منظرِ خدا ہوں میں

اب تک ہم نے جو جگر کے نظریہ حیات کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک خیر کامل ہے اور یہی خیر حیات انسانی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ اسی خیر سے جگر انسان، دنیا، خدا اور خود میں رشتہ یگانگت پیدا کرتا ہے۔ خیر میں اس کا اعتماد اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے جب وہ دنیا میں دکھ اور شردیکھتا ہے۔ لیکن ہماری دقتیں اس دقت بڑھ جاتی ہیں جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شر ایک قسم کا خیر ہے۔ جگر اس مسئلے کا حل پیش کرتا ہے اس کے نزدیک خیر دنیا کی ہر شر پر عادی ہے اور شر اتنا بے اختیار ہے کہ خیر سے ملکر نہیں لے سکتا۔ جگر اس حقیقت کو نہایت بلند و عظیم انداز میں اس طرح بے نقاب کرتا ہے ۸

ہوشیار اد شکوہ رنجِ زندگی      زندگی انعام ہی انعام ہے



ہیں سے ہم کو بلا ہو سکونِ دل کیا کیا جہاں سے لوگ بہت ہو کے ناصبور آئے

کفر ہی کا اگر انسان کو عرفاں ہو جائے جس جگہ ٹیک دے سر کعبۂ ایماں ہو جائے

یہ ایک دل کی حالت دیکھ کر میرا تڑپ اٹھنا اسی عالم میں پھر کچھ سوچ کر مسرور ہو جانا لیکن ہم فوراً معترض ہوتے ہیں کہ اگر دنیا میں ہر چیز پر خیر ہی خیر مستولی ہو تو پھر اس میں باہمی امتیاز و فرق کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ دنیا کی تمام خوب صورتی اور قیمت ختم ہو جائے گی۔ مخصوص چیزوں کا وجود بالکل خیالی ہو کر رہ جائے گا اور انسانی تخیل کے پیدا کیے ہوئے معیارِ خواب سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گے۔ اس نظریے کے مطابق قادرِ مطلق مجبور پر حکمران ہو۔ اسی صورت میں ہمیں ان سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہے کہ ہم کیا ہو سکتے ہیں اور کیا جان سکتے ہیں۔ گویا انسان کا وجود بالکل ناکارہ اور بے حس و حرکت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی نظریے کے تحت اگر ہم کائنات کی تشریح کرنا چاہیں گے تو کائنات مٹ جائے گی۔ اس کا مفہوم ہی مفقود ہو جائے گا۔ وہ ذاتِ خداوندی جس کا ہر ذی روح میں مظاہرہ ہو بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ مگر ہمیں اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ خدا سے سینۃ البصیر کی قوتوں کا معترف ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی ناکام بانی کوئی غلطی، کوئی شر، کوئی دکھ اور تاریخی انسانی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں اس کی ذات کی جلوہ بیزی نہ ہو۔ لیکن اس پر بھی انسان کی اخلاقی زندگی میں آزادی ہو :

ہونے دیا تعلقِ اصلی نہ منقطع مجبوریاں بھی ساتھ چلیں اختیار کے

تجھ سے ہو دست کوئی شکوہ بیدار نہیں دل ستم ساز ہو خود تو ستم ایجاد نہیں

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیش کش احتیاطاً اکتسابِ کفر و ایماں کیجیے

خدا کی قدرتوں پر حد عائد کرنا خدا کے وجود سے انکار کرنا ہے اور انسان کو بالکل مجبور سمجھنا انسان کو مجسمہ خواب سمجھنا ہے جگر صبح طور پر یہ سمجھتا ہے کہ قوتِ خدا لامحدود ہے لیکن اس قوتِ لامحدود پر حرف نہیں آتا اگر وہ اپنے بندے کو کسی شے پر پورا اختیار دے دے اس صورت میں اجازت اور اخلاق ایک دوسرے سے برسرِ جنگ نظر نہیں آتے بلکہ دونوں میں ایک لطیف رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا ہمارا شاعر جگر اجازت سے اخلاق کی طرف بڑھتا ہے، اخلاق سے فلسفے کی جانب اور فلسفے سے مذہب تک پہنچ جاتا ہے۔

لیکن ابھی یہ سوال پھر تشنہ رہ جاتا ہے کہ آخر وہ کونسا اصول ہے جو خدا اور انسان میں مضبوط تعلق پیدا کرتا ہے۔ کیا چیز اس بات کی توضیح کرتی ہے کہ انسان کی زندگی خدا ہی کی ذات کا مظاہرہ ہے اور فطرتِ انسانی جس اخلاق کے آئیڈیل (Ideal) کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے ان مقاصد کی تکمیل ہے جن کو مقاصدِ خداوندی کہا جاسکتا ہے۔ جگر کے پاس اس سوال کا ایک جواب ہے جس کو وہ پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہے یعنی خدا اور بندے میں تعلق پیدا کرنے والی شے محبت ہے۔ محبت ہی اخلاق اور مذہب کا بہت اہم اصول ہے، محبت ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مذہب و اخلاق کی متضادیت دُور کر کے دونوں میں رشتہ یگانگت پیدا کرتی ہے۔ محبت ہی وہ پاکیزہ ترین تخیل ہے جس تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اس جذبہٴ محبت میں وہ اقلیت مضمحل ہے کہ جب یہ باشعور انسان کے ادراکات میں نمایاں ہوتا ہے اور ذی شعور انسان کے ارادے کا محرک ہوتا ہے تو یہ انسان کو بلند ترین پاکیزگیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے جس وقت جگر محبت کے بارے میں لکھتا ہے تو اس کا زورِ کلام قیامت کی بلندی پر ہوتا ہے۔ محبت کی قوتوں پر اسے گہرا اعتماد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی جوانِ مردی و استقلال سے دُنیا میں شر کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کی ہر کراہ سے ترنم پیدا کرتا ہے اس کے نزدیک سارا عالم محبت ہی سے قائم ہے اور دنیا کا ہر ذی رُوح اسی راہ پر گام زن ہے۔ محبت و عقل دو قوتیں وہ ہیں جو دُنیا کی تعمیر کے وقت انسان کو بخشی گئی تھیں۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے پر اپنی اپنی جلوہ پاشیاں کرتی ہیں ایک دوسرے کو اپنے اپنے اثرات سے قوی بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم محبت کو ترقی دیتا ہے اور محبت علم کو۔ انہی دو قوتوں کا

اتصال ہو جو واقعاتِ زندگی کو دل چسپ و بامعنی بناتا ہو اور نظامِ عقل و اخلاق میں تبدیل ہو جاتا ہو۔ جگر نے محبت کو وہ جگہ دی ہو جو انسان کو صحیح انسانی معیار پر لے آتی ہو محبت اس کے نزدیک سب سے بڑا خیر ہو جس نے محبت کو سیکھ لیا گویا اس پر رازِ ہائے خداوندی دا ہو گئے۔ جگر یہ سمجھتا ہو کہ محبت تمام قوانین اور تمامی حُسن کا سرچشمہ ہو۔ محبت ہی انسان کو دنیا اور نسلِ انسانی میں صحیح رابطہ اتحاد دکھاتی ہو اور انسانی زندگی کی تمام اُن بد صورتیوں کو فنا کر دیتی ہو جس کا وجود زلیستِ انسانی کو غم گیں، بد صورت بناتا ہو لیکن محبت کی روشنی میں انسان شر میں خیر دیکھتا ہو اور ناامیدیوں میں امید۔

جگر بالکل جدید اور اپنے مخصوص انداز میں محبت کی کارفرمائیاں دکھاتا ہو۔ محبت شر کو خیر بنا کر انسانی نفس کو احساسِ خودی عطا کرتی ہو ہے

عشاق پاسے ہیں ہر جرم پر سزائیں  
انعام بٹ رہے ہیں مغرور ہیں خطائیں  
جگر کہتا ہو کہ محبت عقل کی مخالف نہیں بلکہ دونوں میں اشتراکِ عمل ہو ہے  
اس حسنِ برقِ دشن کے دل سوختہ وہی ہیں  
شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں  
حُسن بھی محبت کا محتاج ہو ہے

اب ہاتھ مل رہے ہیں وہ خاکِ عاشقاں پر  
برباد کر چکے جب اپنی ہی کچھ ادا نہیں  
دوسری جگہ اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہو ہے

عشق گر حُسن کے جلوں کا ہو مریونِ کرم  
حُسن بھی عشق کے احساں سے سبک دوش نہیں

محبت حسنِ ازل کا انسان کو ایک ایسا تعلق عطا کرتی ہو جو ہم و عقل کی رسائی سے باہر ہو ہے  
کرشمے ذات و صفات کے ہیں جہاں قدرت دکھا رہے ہیں کہ ہر تصور سے دُور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں

اسی خیال کو مولانا رومیؒ نے یوں ادا کیا ہے

ہست رب الناس را باجان ناس

اتصالِ بے گمان و بے قیاس

عالم کی دل چپی اس کی رنگینی کی رہیں منت ہو مگر خود اس کی رنگینی کہاں سے آئی جگر کہتا ہے

جو دل سے اُٹھتے ہیں شعلے وہ رنگ بن کر

تمام منظرِ فطرت پہ چھائے جاتے ہیں

محبت انسان میں احساسِ خودی پیدا کرتی ہے جو اخلاقی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس سے انسان اپنی صبحِ قدو

قیمت پہچانتا ہے

نہ وہ متیاں ہیں نہ سرشاریاں ہیں خودی کا ہی احساس خود داریاں ہیں

کیا غرض مجھ کو ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں میں پرستارِ محبت ہوں خبر ہے کہ نہیں

نہ ہو جو حُسن کی ہم پر کوئی نگاہ نہیں ہم اہلِ عشق ہیں پابندِ رسم و راہ نہیں  
محبت عقل کی معاون ہے مگر اس کی کلیتہً محتاج نہیں ہے

پاؤ اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف

اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

محبت میں بھی ایک حُسن ہے جس سے حُسن بھی متاثر ہوتا ہے

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں حُسنِ خود لینے لگا انگڑائیاں

حُسن کی جانِ توبہ بن گئیں بڑھتے بڑھتے عشق کی رسوائیاں

جگر کے نظریہ محبت کو سمجھنے کے لیے غالباً یہ میری کوتاہی ہوگی اگر میں اس کے چند اود اشعار نہ پیش کروں۔ لیجیے میں یہاں پر جگر کے چنستانِ شعر سے چند گل ہائے رنگا رنگ حاضر کرتا ہوں۔ محبت کے

نازک اور لطیف نفات سے دل و جان کو مسرور کیجیے

محبت میں جدھر دیکھو بہارِ جادو دانی ہو  
ہجرم رنگ دبو ہو سخن و نغمہ ہو جوانی ہو

ہوگا تری محفل میں کوئی اور بھی جلوہ  
مجھ کو تو محبت ہی محبت نظر آئی

اک سازِ محبت ہی کلِ عالمِ امکاں ہو  
تو چھوڑ تو دے ظالم ہر تارِ رگِ جاں ہو  
تو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں درنہ  
پابندیِ انساں ہی آزادیِ انساں ہو

محبت اصلِ حقیقت محبت اصلِ مجاز  
وہ کم نظر تھے جو بیگانہ مجاز رہے

ابتدا عشق کی ہو فطرتِ انساں کی نمود  
انتہا عشق کی تکمیل ہو انسانوں کی

یوں مچو فنا ہو جاؤ دلِ رو الفت میں  
ہر سانس سے پیدا ہو اک نغمہ منصوری

بے کسانِ رو الفت کو سمجھتے کیا ہو  
عرشِ بل جائے اگر دل سے یہ فریاد کریں  
میں جگر کو فلسفی کہہ کر اس کی قیمت کم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ٹیلیو شیریں تو ہو اور یہی وہ تازیت رہے گا۔  
جگر زندگی میں اخلاق کے ساتھ جذبات کو بالکل فراموش کر دینے کا قائل نہیں ہو۔ اس قسم کا خشک اخلاق اس  
کا مطمح نظر نہیں بلکہ وہ جذبات کی قدر و قیمت سے واقف ہو اور ان دونوں کے فطری تعلق و رابطے سے روشناس  
اسی میں ڈوبا ہوا ہو اور دوسروں کو اسی میں غرق کر دینا چاہتا ہو۔

# سہ ماہی تبصرہ

## یوپی میں اُردو

(جناب حیات اللہ انصاری صاحب)

[ محکمہ توسیع تعلیم کے کتب خانے اور دارالمطالعے - بچوں میں ادبی ذوق ،  
کہانیاں ، ڈرامے کا نوجوان ، نئے رسلے ، نئے لکھنے والے ، نئی کتابیں - ]

### محکمہ توسیع تعلیم کے کتب خانے اور دارالمطالعے

فیض آباد سے پورب کی طرف ایک سیدھی سڑک جاتی ہے۔ جس پر ۵ میل چل کر فزیل کے اندر باہوا ایک خوب صورت سا گاؤں ہے۔ ورشن نگر فزیل سے باہر نکل کر گاؤں کا پرائمری اسکول ہے۔ اس میں محکمہ توسیع تعلیم کا کتب خانہ بھی ہے۔ یہ کتب خانہ دو بڑے بڑے اسٹیل کے بکسوں میں بند رہتا ہے۔ کتب خانے کے پاس چار چھوٹے چھوٹے بکس بھی ہیں۔ ان میں کتابیں رکھ کر مہینے کے شروع میں کتب خانے کی چابوں شاخوں کو جو دو دو تین تین میل کے حلقے کے اندر ہیں، بھیج دی جاتی ہیں۔ پھر مہینے کے آخر میں وہ کتابیں انہی بکسوں میں واپس آجاتی ہیں۔ کتب خانے کے نگراں پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اور شاخوں کے نگراں مقامی اسکول کے ماسٹر صاحبان یا اور ذمے دار اشخاص ہیں۔

کتب خانے میں ۱۲ کتابیں ہیں جن میں سے ۱۹۴ اُردو اور ۴۱۸ ہندی کی ہیں۔ اُردو کتابوں میں حسب ذیل علوم کی کتابیں ہیں :-

(۱) افسانے و ناول (۲) نظمیں (۳) تاریخ (۴) زراعت و نباتات (۵) حفظان صحت (۶)

جدید معلومات (۷) ملکوں کا حال (۸) سیاست (۹) مذہب (۱۰) بچوں کی کتابیں۔

پریم چند کی ناولیں اور افسانے ہیں جو یہاں کے لیے بہت موزوں ہیں۔ کتابوں کی شکل اور رجسٹر سے پتا

چلتا ہو کہ سب سے زیادہ وہی پڑھی گئی ہیں۔ اصغر مرحوم کی وہ کتابیں جن میں انھوں نے غیر ملکوں کا حال لکھا تھا، یہاں ہیں، اور پڑھی جاتی ہیں۔ ایک اور قابل تعریف چیز منظوم تاریخ اسلام ہو جو ’آلھا‘ کے طرز میں لکھی گئی ہو۔ افعال تو ’کھانے‘، ’دکان لگانے‘، کے طرز کے دیہاتی بول چال کے ہیں مگر مجموعی طور پر زبان اچھی ہو۔ رجسٹر سے اور مختلف لوگوں سے بات چیت کرنے سے پتا چلا کہ چار سال کے اندر اندر جب سے یہ لائبریریاں کھلی ہیں، لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا کافی شوق پیدا ہو گیا ہو۔ پہلے حالت یہ تھی کہ بڈل پاس اور انٹرنس پاس لوگ جو دہاتوں میں رہتے تھے ان کو سال پر سال بیت جاتے تھے اور ایک کتاب بھی نظر سے نہیں گزرتی تھی۔ بہت سے گاؤں ایسے تھے جہاں کسی گھر میں بھی کوئی کتاب سوائے بچوں کی کورس کی کتابوں کے، نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب پڑھے لکھے لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہو جو سال میں ایک آدھ کتاب نہ پڑھ لیتا ہو۔

”زیادہ کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟“

میرے اس سوال کے بہت سے جواب ملے۔ مگر سب جواب آکر ایک مرکز پر ملتے تھے۔ وہ یہ کہ لوگ صرف وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو ان کے مطلب کی، ان کی دل چسپی کی ہوں اور سہل ہوں۔ ایک ڈپٹی انسپکٹر صاحب جن کے ذمے کتب خانوں کا معائنہ ہو، کہتے ہیں کہ سال میں جب نئی نئی کتابیں آتی ہیں تو ایک دم سے پڑھنے والے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ان کا مطالبہ کم ہو جاتا ہو۔ اس بیان کی تائید درشن نگر کے کتب خانے کے رجسٹر نے کی۔ اس سے ایک خاص زمانے میں پڑھنے والوں کی کثرت ظاہر ہوتی ہو۔

جو لوگ کتب خانے سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان سے بات چیت کرو تو اس بیان کی اور تصدیق ہو جاتی ہو۔ کسی کو صرف غزلوں کا شوق ہو تو کسی کو صرف ناولوں اور افسانوں کا۔ کوئی ہو جس کو صرف مذہبی کتابوں سے شغف ہو۔ ایک صاحب کو شکایت تھی کہ یہاں ’تسخیر ہم زاد‘ کی کوئی کتاب کیوں نہیں رکھی گئی۔ جس وقت وہ شکایت کر رہے تھے، ان کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ ہم کو اس کی سخت ضرورت ہو۔ ان شکایتوں میں مناسب شکایتیں بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ خط و کتابت سکھانے والی کوئی کتاب نہیں ہو

اور خانہ داری سکھانے والی کوئی کتاب نہیں ہو۔ سب سے زیادہ معقول شکایت یہ تھی کہ ریلوے کا ٹائم ٹیبل اردو میں نہیں ہو۔

ضرورت اس بات کی ہو کہ وہ بات والوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ جن لوگوں میں شوق ہو اس کو صحیح اور مفید راہوں پر لگایا جائے۔ ان کو مشورہ دیا جائے کہ تم کون کون سی کتابیں پڑھو۔ دراصل یہ کام کتب خانے کے نگراں کا ہو اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر نگراں ہوتا ہو اسکول کا ہیڈ ماسٹر۔ اس کے ذمے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ادھر پوری توجہ نہیں کر سکتا ہو۔ ایک بات یہ بھی ہو کہ عام لوگوں کے ذوق کا اندازہ کرنا، لاہری می کو اس ڈھب کا بنانا، پڑھے لکھے لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دینا یہ ایک مستقل فن ہو۔ ایک پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر بلا سکھائے ان باتوں کو کیسے جان سکتا ہو۔ راہ کا سب سے بڑا کانٹا یہ ہو کہ نگراں کو ڈر لگا رہتا ہو کہ کبھی کتاب غائب نہ ہو جائے جو مجھے اپنے پاس سے دام دینا پڑیں۔ اس سبب سے کتاب دینے میں وہ آنا کافی کرتا ہو۔

مدین میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جو ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے پر متلے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہو کہ وہ اردو کتابوں کو کس ڈھب سے رائج کرتے ہوں گے۔

توسیع تعلیم کے کتب خانوں میں بچوں کی کتابوں کا ذخیرہ کافی ہو۔ درشن نگریں اردو کے ایسے طالب علم ملے جو ان کتابوں کے پڑھنے کے شوقین ہیں۔ لیکن یہ ذوق وہ دہوں سے نہیں ترقی کر سکا ہو۔ ایک تو یہ کہ کتابیں جیسا چاہیے ویسی نہیں۔ (جس پر ہم آگے بحث کریں گے) دوسرے یہ کہ لڑکے گھر لے جا کر کتاب کھو دیتے ہیں۔ اور اسکول میں پڑھنے کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔

ایک بچہ جو کتاب غائب کرنے کا مجرم ہو چکا تھا میرے سامنے آیا۔ اس کو سال بھر سے کوئی کتاب نہیں ملی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر ایک کتاب دلا دی۔ اس کی باچھیں اتنی کھل گئیں کہ صرف اس خوشی کے انعام میں میرا بس چلتا تو پورا کتب خانہ دے دیتا۔

”یہاں اردو کی کتابیں ہندی سے کم کیوں ہیں؟“

”کیوں کہ اردو پڑھنے والے ہندی پڑھنے والوں سے کم ہیں۔“



معقول! اس جواب نے مجھے ایک یونیورسٹی کا ایک واقعہ یاد دلادیا۔ وہاں مجلس انتظامیہ میں جب لائبریری کے لیے کتابیں منگوانے کا سوال اٹھا تو ایک معاملہ فہم ممبر نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ”پارسل جو کتابیں منگوائی گئی تھیں کیا وہ سب کی سب لڑکوں نے پڑھ لیں ہیں جواب اور منگوائی جائیں؟“ اگر سوال یہ ہوتا کہ ایک مخصوص کتاب کی کتنی جلدیں منگوائی جائیں تب یہ جواب درست ہوتا۔ لیکن سر درست اس کا مطلب تو یہ ہو کہ جو ہندی پڑھنے والا ہو اس کو تو سال میں بیس نادیں پڑھنے کو ملیں اور جو اردو پڑھنے والا ہو اس کو صرف دس۔ یعنی اگر اردو دان کی تعداد پچیس فی صدی ہوتی ہو تو ان میں سے ہر شخص کو علم میں بھی ہندی دان کے مقابلے میں پچیس ہی فی صدی رہنا چاہیے۔

محکمہ توسیع تعلیم نے اردو کی جگہ مجموعی طور پر پچیس فی صدی مقرر کی ہو۔ اور مجموعی طور پر اردو کی کتابیں بھی اتنی ہی ہیں۔ تقسیم یوں کی گئی ہو کہ جن مقاموں پر اردو دان زیادہ ہیں وہاں ان کی مقدار پچیس فی صدی سے بڑھ کر پچاس اور ساتھ فی صدی تک پہنچ گئی ہو۔ جہاں کم ہیں وہاں گھٹ کر ۵ فی صدی بلکہ سفر کم پہنچ گئی ہو۔ اسی تناسب اور تقسیم کا سوال محکمہ تعلیم میں اردو ہندی کی جگہ اور اس کے بجٹ سے متعلق ہو۔ یعنی اس کا مل ادب کے میدان میں نہیں۔ سیاست کے میدان میں ہو۔

اب ذرا کتب خانے کا ایک جائزہ لیجیے۔

اردو میں کبھی عام پسند ادب تھا۔ مثلاً نورنامہ، آرائش محفل، قصہ چہار درویش، قصہ بہرام گور بہت سی عام کتابیں تھیں۔ اس کے بعد جاسوسی کی ناولیں عام ہوئیں لیکن اب ان کتابوں کا چلن گیا۔ کیوں کہ علم کا حلقہ جو بڑھا تو ایسے لوگ بھی آگئے جن کے لیے یہ زبان بھی کافی مشکل ہو۔ نئے آنے والوں کی زندگی اور مسائل بھی مختلف ہیں۔ عام ذوق بھی بدل گیا ہو۔ اب ایسی کتابوں کی ضرورت ہو جو ان تمام باتوں کو سمو کر نئی طرز پر تیار کی جائیں۔ ایسی کتابیں فی الحال اردو میں بہت کم ہیں۔ ایسی حالت میں ایک دیہاتی کتب خانے کے لیے کتابوں کا انتخاب کرنا آسان کام نہیں۔

دوسری بڑی دشواری ہو نقطہ نظر کا اختلاف۔ اس وقت ملک میں جتنی سیاسی جماعتیں ہیں سب کا کتب خانوں کے بارے میں ایک خاص نظریہ ہو۔ یہ اختلاف اسی حد تک ہو کہ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے رکھنے

پر ایک جماعت بے حد مہر ہوگی تو دوسری نہ رکھنے پر۔

کتابوں کے انتخاب میں غالباً اس بات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہو کہ جہاں تک ممکن ہو یوپی کے اشاعت گھروں ہی سے خریدی جائیں۔ کیوں کہ پڑھنے والوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشاعت گھروں اور لکھنے والوں کی سرپرستی بھی تو مد نظر ہو۔

ان تمام دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر بھی اگر کتب خانے کا جائزہ لو تو بھی انتخاب بے حد ناقص ہو۔ مثلاً افسانے اور ناولیں جن کی کثرت ہونا چاہیے تھی بے حد کم ہیں۔ اور جو ہیں ان میں سے آدھے سے زیادہ محض بھرتی کے ہیں۔ ایک ناول ہو جس میں طلعت۔ افسانوں کے مجموعے ہیں 'گروہ چتر' اور 'نصیر الدین حیدر' افسانہ نگاری اور ناول کا فن اردو کے موجودہ دور میں جتنا ترقی کر گیا ہو اس کو دیکھتے ہوئے یہ کتابیں منزلوں پہنچے ہیں۔ ایک ناول ہو 'اسیر نفس'، جو پردے کے خلاف میں بچیں سال اُدھر لکھی گئی تھی۔ شاید بازار میں اسے کوئی ردی کے بھاؤ بھی نہ خریدے گا۔ شعر منثور کی ایک کتاب ہو 'نغات'، یہ اس نوعیت کی پیز ہو۔

”اب بلبل اپنی نوائے مرتضیٰ سے اس کا نوحہ ماتم پڑھ رہی تھی۔ ماہ تاب کے اشک سیسں اس کے غم میں سارے باغ کو غم آگئیں بنارہے تھے۔“

”رنگینی بہار کا نفسِ اولیں، تتلی کی نگہ واپس ہو۔“

ایسے عالی ادب کے سمجھنے اور مٹھ لینے والے مصنف ہوں گے۔ اور شاید چند لوگ اور ہوں۔ وہ باتی کتب خانے میں ایسی کتابوں کو رکھنا ان کی بے وقعتی نہیں تو اور کیا ہو؟

ایک کتاب دیکھنے میں آئی 'کارخانہ عالم'، یہ نول کشور کی سنہ ۲۵ء کی چھپی ہوئی ہو۔ اس میں جدید صنعتوں مثلاً کاغذ وغیرہ بننے کا حال بتایا گیا ہو۔ یہ صنعتیں اب پرانی ہو گئیں نئی صنعتیں ان سے زیادہ حیرت ناک وجود میں آگئیں۔ انداز بیان نہ جانے کتنا ترقی کر گیا۔ کتاب کی سجاوٹ کا حال یہ ہو کہ خراب کاغذ اور خراب لکھائی چھپائی ہو۔ جا بجا کثرت سے غلطیاں ہیں۔ بازار میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہو۔ مگر لاٹری میں خریدی گئی ہو۔ اور شاید ردی کے دامن بھی نہیں، پورے دام دے کر۔

اکثر کتابیں ہائی اسکول کے معیار کی، بلکہ اس سے بھی اونچی ہیں۔ کچھ تو ایسی ہیں جو صرف اسی شخص کے

کام کی ہوسکتی ہیں جو اپنے خاص مسائل کے حل کی تلاش میں لائبریری آئے۔

یہ کہنا بے ضرورت ہو کہ ایسی سب محکمات میں ویسی ہی کی ویسی کوری رکھی ہوئی ہیں۔ کتابوں کا انتخاب محکمہ توسیع تعلیم کرنا ہو۔ اور خراب انتخاب کا ذمہ دار بھی یہی ہو۔

### دارالمطالعہ

درشن نگر کی تفصیل کے اندر، یعنی بازار کے بیچ بیچ میں ایک خوب صورت کمرے پر ایک سائن بورڈ لگا ہو جس میں ’اُردو ہندی میں لکھا ہو محکمہ توسیع تعلیم کا دارالمطالعہ۔ یہ کرا ایک دکان دار کا ہو جس نے دارالمطالعہ کے نگران کے کہنے سننے سے دارالمطالعہ کے لیے کمرے کا ایک کونا خالی کر دیا ہو۔ اس جگہ ایک چھوٹی سی الماری ایک میز اور دو کرسیاں ہیں۔ دارالمطالعہ میں دنیا باتصویر، ماہ وار، ہفتے کی خبریں، ہفتہ وار، ہفتہ ہفتہ جی قیقت لکھنؤ سنڈے ادیشن“ آتا ہو۔

درشن نگر شہر فیض آباد سے بہت قریب ہو۔ لوگ روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اخبار بھی آجاتے ہیں اور زبانی روزانہ کی خبریں بھی۔ اسی وجہ سے ہفتہ وار اخباروں میں جو دیر کو بھی پہنچتے ہیں کوئی خاص کشش نہیں۔ پھر بھی پڑھنے والے آجاتے ہیں۔ اور اخباروں پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ ایک صاحب کو ہم نے دارالمطالعہ میں بیٹھے ہوئے کچھ نقل کرتے دیکھا۔ کسی دو کا پتا تھا۔ جو کچھ بھی ہو۔ تھا تو۔ قلم کاغذ اور اخبار کا استعمال چار سال پہلے دیہات کی دنیا میں بالکل غنقا تھا۔

دارالمطالعہ کے بارے میں بھی لوگوں کی ویسی ہی شکایتیں اور فرمائشیں ہیں جیسی کتب خانے کے بارے میں۔ نوجوانوں کی بالاتفاق فرمائش ہو کہ سنیا کا پرچہ آنا چاہیے۔ مگر ایک بزرگ کا خیال ہو کہ جو اخبار آتے ہیں ان میں سنیا کی باتیں ہوتی ہیں، اسی لیے ان کو بند کر دینا چاہیے۔

ایک بے ضرورت بات یہاں کہ دینا ضروری ہو۔ وہ یہ کہ کتب خانے کا رجسٹر دیکھنے سے پتا چلتا ہو کہ ’اُردو کتابوں کے پڑھنے والے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

یہی میں محکمہ توسیع تعلیم کے کتب خانے ۱۰۴۰۰ اور دارالمطالعہ ۳۴۰۰ ہیں جن میں ۲۵ فی صدی ’اُردو کتابیں ہیں۔ ان سے کافی فائدہ پہنچ رہا ہو۔ لیکن بد درجہا زائد فائدہ پہنچ سکتا ہو اگر پبلک انجمنیں اس میں دلچسپی لینے لگیں۔ وہ دیہات والوں میں پڑھنے اور لائبریری سے فائدہ اٹھانے کا ذوق پیدا کریں۔ کتب خانوں کے

نگہبانوں کا ہاتھ بٹائیں۔ اس بات کا اختتام کریں کہ اگر کسی پڑھنے والے سے کوئی کتاب منائے ہو جائے اور وہ اس کی قیمت نہ ادا کر سکتا ہو تو دوسری کتاب فراہم کر دی جائے۔

## بچوں کا ادبی ذوق

میں۔ ”کیوں میاں۔ یہ کہانی کی کتاب تمہارے ہاتھ کیسے آگئی؟“

بچہ۔ ”دفتر سے، میری سو۔ ساڑھے چار آنے کی خریدی ہو۔“

”پیسے کیا ہاتھ دیے تھے؟“

”جی نہیں۔ چار آنے عینہ میں ملے۔ تھے۔“

”مگر کتاب تو ساڑھے چار آنے کی ہو؟“

”دو پیسے کتاب والے کے اُدھار رہے۔ اب ہر جمعے کو دو پیسے دیتے ہیں۔ جب جمعہ آیا تو ادا کر دیے۔“

ادب کا یہ متوالا لکھنؤ میونسپلٹی کے کسی اسکول میں پڑھتا ہو۔

یوپی میں اُردو کا مستقبل کیسا ہو؟ اس کا پتا چلانے کے لیے میں نے اسکول کے انسپکٹروں اور

ماسٹروں سے بات چیت کی۔ بچوں سے اور ان کے سرپرستوں سے ملا۔ جن سے ملاقات نہ کر سکا ان سے

لکھ کر کچھ سوالات پوچھے۔ لڑکوں سے بھی بات چیت کی۔ اسی میں سے ایک کا خلاصہ اوپر درج ہے۔ بچہ۔

ایک بچہ مجھ سے کہانی کی ایک کتاب لے گیا۔ تیسرے دن اس نے واپس کر دی۔ اس کو اب کتاب

کی حاجت نہ تھی۔ کیوں کہ کہانی کا لفظ لفظ نوک زبان تھا۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول کا ایک بچہ مجھ سے کہانی کی ایک کتاب لے گیا۔ جب واپس لایا تو میں نے

پوچھا کہ

”کس کس نے کتاب پڑھی تھی؟“

”میں نے پڑھی اور سب لڑکوں نے سُنی۔“

”سنئے والوں میں ہندی کشن کے رٹکے بھی تھے۔“

”جی ہاں۔ وہ کیوں نہ سنئے؟“

تو ابھی ہندی رسم الخط پڑھنے والے مصموں کو یہ کسی نے نہیں بتایا ہو کہ تم اردو نہیں سمجھتے ہو؟ یہ ہر بچوں کا ذوق اور یہ ہر اردو زبان کا مستقبل۔ اور یہ حالت اس وقت ہر جب کہ اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہو۔

میں سال اور وہ زمانہ تھا کہ بچے کہانی کی کتاب چھونے پر بیٹے جاتے تھے۔ وہ زمانہ اب نہیں رہا۔ لیکن اب بھی سرپرستوں اور استادوں کو بچے کے ہاتھ میں قصہ کہانی کی کتاب دیکھ کر بے صبری محسوس ہوتی ہو۔ ان کو منع تو نہیں کرتے۔ مگر ایسا ضرور کرتے ہیں کہ جہاں بچے نے کہانی کی کتاب اٹھائی اور انھوں نے حکم دیا اس وقت نصاب کی کتاب پڑھو۔ یہ اس وقت، ہر وقت رہتا ہو۔

بچوں میں ادبی ذوق خود بخود بڑھ رہا ہو۔ کلاس کے ایک بچے کے پاس اگر کہانی کی کوئی کتاب آگئی تو اس کو مانگ کر سب بچے پڑھتے ہیں۔ کورس کی کتاب چاہے بری طرح رکھیں اٹھائیں مگر کہانی کی کتاب نادر تحفے کی طرح بہت ادب و لحاظ سے چھوئی جاتی ہو۔ جس طرح بچے کو دوسرے بچے کے اچھے کپڑوں اور کھلونوں پر رشک آتا ہو اسی طرح کہانیوں کی کتاب پر بھی۔

وہ زمانہ تو تقریباً چلا گیا جب تعلیم یافتہ اور باحیثیت لوگ اپنے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی کی تعلیم دلاتے تھے۔ اب ایسے لوگ بچوں کو ہلکی اندیشے کے کہانیوں کی کتابیں منگوا دیتے ہیں۔ ان کے گھروں میں ’پیامِ تعلیم‘، ’دغفہ‘، اور ’بھول‘ کے نئے اور پرانے پرچے نظر آجائیں گے۔ مگر یہاں کے بچوں کا حال دوسرا ہوتا ہو۔ کچھ دنوں کے بعد ان چیزوں کی طرف سے ان کا دل ہٹ جاتا ہو۔ مجھ کو جہاں ادب کے متوالے بچے ملے وہاں ایسے بھی ملے جن کے پاس کہانیوں کی مجلد کتابیں موجود ہیں۔ مگر وہ پڑھتے نہیں۔ اب وہ زمانہ گیا جب بچوں کی بدشوقی دیکھ کر ہم یہ کہہ کر الگ ہو جاتے تھے کہ کیا کریں ان میں شوق ہی نہیں۔ اگر بچے کتابیں نہیں پڑھتے ہیں تو ضرور کتابوں میں کوئی خرابی ہو۔

بچوں کے ڈراموں پر تو ہم نے آگے، ڈرامے کا اچھا، کے سلسلے میں بحث کی ہو۔ یہاں کہانیوں پر

بحث کریں گے۔ بچوں کی تاریخی اور علمی کتابوں پر کسی اور موقع پر تبصرہ کیا جائے گا۔

اور مجھوں کی طرح یوپی کے گھرانوں میں بھی بچوں کو کہانیوں کی نعمت بڑھتیوں سے ملتی تھی۔ رات  
کہانی کا فن | کو کھانے سے فراغت ہوئی اور بچوں نے دادی اماں یا نانی اماں کو گھیر لیا۔ انھوں نے فرمائشوں  
سے مجبور ہو کر کہانی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ اور تھم تھم کر، جیسا کہ سن کا تقاضا تھا، ان کی زبان سے الفاظ  
نکلنے لگے۔ لیکن اس دھیمی رفتار سے وہ غیر محسوس طور پر ایک صنعت پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ تھا ڈراما پن۔ جو  
الفاظ سے زیادہ لہجے سے ادا ہوتا تھا۔ اگر جنگل کا سناٹا دکھانا ہو تو یہ الفاظ ہوتے تھے ”وہ سنان جنگل،  
ہو کا عالم، نہ آدم نہ آدم زاد، بس خدا کی ذات۔“ اس میں سنان کا کھپکھپاؤ ایسا سناٹا پیدا کر دیتا تھا کہ  
بچوں کی سانس دھیمی پڑ جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں نہ کوئی آدمی ہو اور نہ روشنی۔ ہو کا عالم  
میں دھو، میں وہ سانس ہوتی تھی کہ جی سبنا جاتا تھا۔ ”نہ آدم نہ آدم زاد“ میں دونوں فقرے اس طرح تہہ در تہہ  
آتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا کی ساری آبادی انہی دونوں سے ہوتی ہو جب یہ نہیں رہے تو  
پھر کیا رہ گیا۔

ان لفظوں اور فقروں کے معنی بچے بھلا کیا سمجھ سکتے تھے۔ مگر لہجہ سمجھ لیتے تھے۔ اور وہ لہجہ الفاظ کی  
جذباتی جگہ بتا دیتا تھا۔ جب الفاظ کی جذباتی جگہ مل گئی تو سب کچھ مل گیا۔ بڑے ہونے پر جب ان لفظوں  
کے معنی معلوم ہوتے تھے تو ایسا خیال ہوتا تھا جیسے جانی بوجہی بات ہو۔  
ایک کہانی میری بوا کہتی تھیں۔ جتنا حصہ یاد ہو اس سے پانچوں پانڈوں کی سی کہانی معلوم پڑتی ہے۔  
اس میں ماں اپنے بیٹوں کو بھلا کر پوچھتی ہے کہ نوکھا ہار کس نے توڑا؟  
پہلا بیٹا: اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

دوسرا بیٹا: نہیں اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

تیسرا بیٹا: نہیں اماں جان مجھ سے ٹوٹا۔

اسی طرح پانچویں بیٹے ہی جواب دیتے ہیں۔ اسی ایک فقرے کو وہ اس طرح ادا کرتی تھیں کہ بڑے بیٹے منجھلے  
بیٹے اور چھوٹے بیٹے کا کردار آنکھوں تلے آ جاتا تھا۔

بچوں تک جو کہانی سنی جاتی تھی وہ محض الفاظ کے روپ میں نہیں۔ جیتے لہجے کا بھی سہارا لے کر۔ کہانی ایک زبان سے دوسری پر اور دوسری سے تیسری پر چلتی تھی۔ ہر شخص اپنے لہجے پر اس کو ڈھالتا تھا۔ اس طرح ثقیل الفاظ چھٹ جاتے تھے۔ جو فقہرہ موتے کے ڈرامائی پن کو ادا کرنے والے لہجے پر پوری طرح نہ چڑھتا ہو، وہ ذوق کئی زبان پر چڑھ کر سڈول ہو جاتا تھا۔ اور زبان ہر غضب کی شہرینی اور روانی آجاتی تھی۔ کہانیاں جبرے بچوں کے لیے اور ہوتی تھیں۔ بڑے بچوں کے لیے اور ان سے بڑوں کے لیے۔ اسی ہی کہانیاں ہوتی تھیں جن کو بڑے اور بوڑھے سب سنتے تھے اور مزے لیتے تھے۔

بہت چھوٹے بچوں کے لیے چڑیا چڑے کی کہانیاں۔ اس سے بڑے کے لیے شیخ ہجلی کی کہانیاں تھیں۔ ان میں گیمہ، کدو، کی، سیٹھ کی باتوں کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا کہ بچہ تک اس کے بے تکلف پن کو محسوس کر لیتا تھا۔ ان سے بڑوں کے لیے تادراوے اور پریوں کی کہانیاں تھیں۔ سیانوں کے لیے "ابو دین کا چراغ" اور "علی بابا چالیس پورا" تھے۔

اگر سب کہانیاں میں مستند ہوتا تھا۔ یعنی وہ زندگی کے مسائل اور اخلاق کی خوبیاں سمجھاتی ہیں۔ سچی تر زندگی کے کوسٹیمی ماں سے خبردار کیا جاتا ہو کبھی سونیلی ماں کو بڑے انجام سے ڈرایا جاتا ہو۔ کچھ کہانیاں تقدیر پر صابر و شاکر رہنا سکھاتی ہیں۔ کچھ تقدیر ہونے ہوئے تدبیر کو اہمیت دیتی ہیں۔ بعض کہانیاں بہت و جرأت کو کامیابی اور ترقی کی کلید ثابت کرتی ہیں۔

عام طور پر جو کہانیاں رائج ہیں یا تھیں ان میں مقصد چھپ گیا ہو۔ کیوں کہ وہ ایک مفرد کہانی نہیں بلکہ کئی چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے مرکب ہوتی ہیں۔ کہنے والے دل چاہی بڑھانے کے لیے ایک کہانی میں دوسری جوڑتے چلے گئے۔ ضرورت کے موافق کہیں کہیں ذرا ذرا سی کٹر بیونت بھی کر دی۔ مثلاً اس وقت ہمارے سامنے اشرف صبوحی صاحب کی کتاب "شہزادہ نواز" ہو۔ اس میں ایک کہانی "دینچہ کی شہزادی" ہو۔ یہ کہانی کئی طرح سے نیسے مٹی ہو۔ اس کہانی کا پہلا قصہ شاہزادی اور شاہزادے کا ہو۔ شاہزادہ شہزادی پر عاشق ہوتا ہو۔ پھر اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہو اور شادی قرار پانی ہو۔ دوسرا قصہ وزیر زادے کا ہو۔ اس کو پتا چلتا ہو کہ شاہزادے اور شاہزادی پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ وہ ان کی روکت تھام میں

اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہو۔ ہیرہ بدل جانے سے دونوں قصے صاف دو معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں قصے الگ الگ کہانیوں کی شکل میں بھی پائے جاتے ہیں اور دوسری کہانیوں کا جز ہو کر بھی۔

لیکن پرانی کہانیاں اچھی ہوں یا بُری، اب پرانی ہو گئیں۔ تعلیم کا حلقہ بڑھ رہا ہو ہر بچے کو ڈرامائی انداز میں کہانی کہنے والی مافی ثانی دادی نہیں مل سکتی ہو۔ عام بچوں کو اگر کہانیوں کی نعمت مل سکتی ہو تو صرف کتاب کی شکل میں۔ بچوں کے لیے کہانی لکھنے والے کا کام بہت سخت کام ہو۔ دل تو اسے ڈرامائی پن کی کمی کو جو کہنے والیاں

لہجے سے پیدا کرتی تھیں تم کی جنبش سے پورا کرنا ہو۔ وہ مشکل الفاظ جو محض لہجے کے دباؤ میں آ کر معنی دے جاتے تھے تحریر سے نکال دینا ہو اور ان کی جگہ آسان الفاظ لانا ہو۔ پہلے مناظر، کردار، قلبی کیفیات کے بیان کا ہر جگہ ایک ڈبھرا تھا۔ مثلاً جہاں کہیں جنگل ہوگا اس کا سناٹا مذکورہ بالا الفاظ میں بیان ہوگا۔ ان الفاظ میں جو کچھ تنوع پیدا ہوتا تھا وہ کہنے والے کے جذبات سے۔ اب اگر لکھنے میں بھی ہر جگہ یہی الفاظ آئیں گے تو دم اُلجھ جائے گا۔ ان میں تنوع پیدا کرنا ہو۔

ریل، لاریاں، سینما، تصویروں، وغیرہ وغیرہ چیزوں سے بچے کا ماحول زیادہ تعلیم دہ ہو گیا ہو۔ اب وہ پھلے کے بچوں سے زیادہ بختہ ہوتا ہو۔ اس لیے شیعہ جلی کی باتوں میں اسے مزہ نہیں آنے کا۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہو گئی ہو کہ تدریس بدل گئی ہو۔ اس دور سے کہانیوں کے مقصد بے کار بلکہ کہیں کہیں سر نہ ہ گئے ہیں۔ مثلاً، شہزادہ فیروز، کا پلاٹ یہ ہو کہ ایک لڑکی ہالیوں کے مقبرے سے رات کو بٹی کا کالا بچہ اٹھا لاتی ہو۔ پالتی ہو۔ بعد کو پتا چلتا ہو کہ وہ جن ہو۔ کہانی پڑھنے کے بعد رات کی کالی بٹی سے ڈر گئے گستا ہو۔ موجودہ علوم کی روشنی میں یہ مقصد نہ صرف بے ضرورت بلکہ مضر ہو گیا ہو۔ اب ہم بچے کی اس بات کو ”ڈر انھیں نہیں لگتا“ زیادہ سے زیادہ پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔

کہانیوں میں جیسا کہ ہونا چاہیے کلچر کا رنگ بھی ہو، تھا۔ ”قنااتوں سے گھرا ہوا نہایت وسیع زلفتی شامیانہ کچھا ہوا ہو۔ ڈوریاں ریشم اور کلابتوں سے بٹی ہوئی ہیں۔ بھال میں رنگ برنگ کے آدیزے ٹنک رہے ہیں“ اب نگاہیں اس تصویر سے مانوس ہیں ہیں۔ اب موجودہ کلچر کا نقشہ ہونا چاہیے۔

سینما اور اخباروں وغیرہ کا بھی اثر پلاٹ پر پڑ رہا ہو۔ اب بچہ پلاٹ کی ان کمزوریوں کو دیکھ لیتا ہو جن پر



پہلے نگاہ نہیں پڑتی تھی۔

بچوں کے ادب کا رواج یوپی میں بہت پُرانا ہو۔ 'پھول' اور 'دغچہ' بہت مقبول رہ چکے ہیں۔ ان رسالوں کی کہانیاں زیادہ تر انگریزی سے لی جاتی تھیں۔ ان کہانیوں کے کردار، رسم و رواج سب انگریزی ہوتے تھے۔ بعض جگہ سمجھ میں بھی نہ آتے تھے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ ہونے سے تو اچھا ہی تھا۔

بچوں کے ادب کی اصلاح کی باتا عہدہ کوشش مکتبہ جامعہ نے کی۔ اس نے بدلیسی باتوں کو یک قلم چھوڑ دیا۔ شاہ زادوں اور شاہ زادوں کے قصے چھوڑ کر عام زندگی کے قصے لکھے۔ کلچر میں ہندوستانی پن پیدا کیا۔ کہانی کی زبان میں جو انگریزی پن آگیا تھا اس کو دور کر کے اس کی جگہ روزمرہ کی بول چال داخل کی۔

مجھے یاد ہو کہ جب ایسی کتابیں لکھتے آتی ہیں تو بڑے لوگ کیسی سترت بھری حیرت سے ان کو دیکھتے تھے۔ بار بار دیکھتے تھے اور اردو کی ترقی پر خوش ہوتے تھے۔ بچوں کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اب تو جامعہ کے راستوں پر چلنے والے بہت سے اشاعت گھر ہیں۔ ایڈین پریس الہ آباد، انوار احمدی پریس الہ آباد نے بہت سی کتابیں تیار کرائی ہیں۔ وہ چار کتابیں دانش محل نے بھی شائع کی ہیں۔

بچوں کی کہانیوں کے شائع کرنے کا کام انوار احمدی پریس بہت بہ دردی سے کر رہا ہو۔ اس کی خدمات ہر طرح سے ہمت افزائی کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہو کہ جب تک تنقیدی قلم رہبری نہ کرے ادب صحیح راستے پر لگ نہیں سکتا ہو۔ انوار احمدی پریس کے سات سات کتابوں کے دوست ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب سو سو سو صفحے کی ہو۔ ظاہر ہو کہ ان کی تیاری میں کتنی محنت اور لاگت آئی ہوگی۔ ان دونوں سٹوں میں بہت سی فردگزشتیں تو ایسی ہیں جو معمولی توبہ سے دُور ہو سکتی تھیں۔ مثلاً قصوں کی ترتیب خراب ہو۔ اکثر پیرا گراف ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئے ہیں۔ "الف لیلہ کی کہانیاں" میں جابجا اشعار کمپائے گئے ہیں۔ ان سے کہانیاں بوجھل، بدمزہ اور شکل ہو گئی ہیں۔

دوسرا سٹ 'اخلاقی کہانیاں' ہو۔ ایک زمانہ تھا جب خیال کیا جاتا تھا کہ بچے اخلاق اور معرفت کے رموز نہایت خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو گلستان، بوستان، کلید رمز اور اخلاقِ جلالی وغیرہ پڑھائی جاتی

تھیں۔ مگر اب تو وہ زمانہ نہیں رہا۔ لیکن یہ کتابیں ابھی تک اسی نقطے پر ہیں۔

شال میں جلد (۶) کی ایک کہانی ’بقال اور لومڑی‘ لیجیے اس کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک بقال کے پاس ایک ہوشیار لومڑی تھی۔ وہ ایک دن بقال کی غیر موجودگی میں دکان کی حفاظت کر رہی تھی۔ ایک اچٹکا چوری کی نیت سے آیا مگر لومڑی کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اچٹکا چالاکی سے سوتا بن گیا۔ اب لومڑی دھوکے میں آگئی اور اسے سوتا جان کر سو گئی۔ اچٹکا بقال کی اشرفیاں لے کر چمٹ ہوا۔ اب جو بقال آیا تو اشرفیاں غائب تھیں۔ کہانی یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بچہ چاہتا ہے کہ ابھی معلوم ہو کہ اچٹکے کو کیا سزا ملی۔ کیا دنیا میں مجرم یوں ہی بے کھٹکے گھوما کرتے ہیں؟

کہانی ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیتی ہے۔ بلکہ کہتی ہے کہ ادھر سے ایک عارف کا گزر ہوا انھوں نے فرمایا:۔۔

”دنیا والو! اس چور سے سبق حاصل کرو۔ یہاں بو کوئی غافل ہو جاتا ہے وہ نقد جان اور دولتِ ایمان

کو اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح اس بقال نے تھیلی کھوئی“

کہانی اور عارف کے قول میں جو عقلی اور جذباتی تعلق ہے اس کو بچہ نہیں محسوس کر سکتا ہے۔ بچے کے لیے کہانی پہلے ہی ختم ہو گئی۔ عارف کی کہانی ایک دوسری غیر دل چسپ کہانی ہے۔

## ڈرامے کا احیا

سینما کا بولنا تھا کہ تھیٹر غائب ہو گیا۔ کیں کہ پُرانے طرز کے تھیٹر میں جتنی باتیں تھیں وہ تو سب سینما میں آہی گئیں، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دل چسپ چیزیں شامل ہو گئیں۔ فلم تھیٹر سے بہت زیادہ دل چسپ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھیٹر کی کمپنیاں بند ہو گئیں۔ دو چار جو چھوٹی موٹی کمپنیاں زندہ رہ گئیں انھوں نے جاکر سیلوں ٹھیلوں میں پناہ لی۔ پتا نہیں اب بھی کوئی زندہ ہے یا نہیں۔

کالجز اور اسکولوں میں بھی ڈرامے کا رواج بہت پُرانا ہے۔ پہلے شکپیر کے ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ سمجھ آنے لگی۔ یہ نظر آ گیا کہ آغا حشر کے ڈرامے تمام عیبوں پر بھی انگریزی ڈراموں سے زیادہ

پُر اثر ہوتے ہیں۔ مگر جب سنیا بولنے لگا تو یہ ڈرامے بھی ہاتھ سے گئے۔

بولتے سنیا کے ساتھ تماشائیوں کی دنیا کا اور کالج کی دنیا کا ڈراما تو ختم ہو گیا، لیکن اس زمانے میں اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے ڈرامے نے جنم لیا۔ ان ڈراموں کی کتابیں عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب نے لکھیں اور مکتبہ جامعہ نے چھاپیں۔ پھر یہ کتابیں یوپی میں آئیں اور لڑکوں نے ان کو جابہ جات میں لیا۔ لیکن جب ان میں تمثیل کی جان پڑی تو یہ زیادہ جان دار ثابت نہ ہوئیں۔ مثال کی طور پر ایک ڈراما "مخت" (مصنف عبدالغفار دھولی مکتبہ جامعہ) لیجیے۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

ر انور کا باغیچہ۔ انور پودوں کو پانی دے رہا ہے۔ انور کا دوست اشرف داخل ہوتا ہے۔

اشرف محنت۔ محنت۔ دن رات محنت۔

انور "اھا، اشرف صاحب تشریف لائے"

..... (پھر پانی دیتا ہے)

"انور۔ کیوں نہیں۔ خیر اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو کل والی بحث کا فیصلہ چاہتا ہوں"

"ہاں۔ آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ بس ایک کام اور رہ گیا ہے۔ کوئی پانچ منٹ اور صرف ہوں گے۔

بس میں ابھی آیا"

(گئے کی مٹی کو نرم کرتا ہے)

[اشرف کرسی پر بیٹھ کر اخبار "مزدور" کا مطالعہ کرتا ہے۔ انور ہاتھ منہ دھو کر پہرے کو تویے سے صاف

کر کے آتا ہے۔]

اس کی حیثیت ایک اچھے مکالمے کی ہے۔ یہ ڈراما نہیں ہے۔ ڈرامے کے لیے پہلی ضروری چیز جذبات کی

شدت ہے۔ ایسی شدت جس کے تار و سر پر تمثیل کرنے والے کردار خود بخود اپنے بیچے اور بدن کے حرکات و

سکنت کو دھال سکیں۔ یعنی پوری طرح اس وقت کے جذبے میں جذب ہو سکیں۔ دوسری طرف تماشائی اپنی

تمام ضروری باتوں کو بھول کر ادھر متوجہ ہو جائیں۔

کوئی اچھا ڈراما نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کا یہ مشغلہ یوپی کے اسکولوں میں کامیابی سے نہ چل سکا۔

لیکن اب ڈرامے نے نیا جنم لینا شروع کیا ہے۔ اس کی پہل دو سال ہوئے جب ہوئی۔ رشید جہاں صاحبہ نے پریم چند کے افسانے 'کفن' کی ڈراما بندی کر کے لکھنؤ میں تمثیل کیا۔ اس کی تحریر اور تمثیل دونوں ان مبالغہ آرائیوں اور غیر حقیقی حرکات و سکنات سے خالی تھیں جو آغا حشر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ جذبات کی شدت بھی تھی۔

اب اس ہائی اسکول فیض آباد نے اسی سال جنوری میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا 'مشاعرہ' تمثیل کیا۔ مگر اس کی قیمت علمی زیادہ ہو تمثیلی کم۔ اس وجہ سے تماشاویں پر فتح نہ حاصل ہو سکی۔ بیک ٹریننگ سنٹر فیض آباد کے بچوں نے ایک ڈراما 'بھوت گھر' کھیلا۔ یہ کافی کامیاب رہا۔ سب سے کامیاب ڈراما 'سونے کا گھونٹ'، راجہ بیک سنٹر کے اسٹاف نے دو مرتبہ پیش کیا۔ اس کے پس منظر میں ایک سیاہ پردا تھا۔ کرداروں کی جادو بھی قدرتی تھی۔ ڈرامے کا موضوع عشق و محبت نہ تھا۔ ان تمام غیر معمولی باتوں کے باوجود کامیاب رہا۔ کیوں نہ ڈراما عمدہ لکھ ہوا تھا اور تمثیل بھی اچھی طرح کیا گیا تھا۔

بان کی ترقی کی بہت سی راہیں کھل رہی ہیں۔ اور کامیاب راہیں

### نئے رسالے

کمہ سنہ سالہ بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ ان میں سے قابل ذکر 'خروب' لکھنؤ اور 'ترکش' لکھنؤ ہیں۔ اسی سجا۔ میں کسی اچھے سالے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کم سرمائے سے نکلے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی کی امید پر زندہ ہیں۔ پیسے تبصرے میں آچکا ہے کہ اب حالات سازگار ہو رہے ہیں۔ اگر محنت اور دودھ و دھوپ کی جائے تو رسالے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ نئے رسالوں کے مضامین امید افزا ہیں۔

### نئی کتابیں

'مداد' مصنفہ غلام احمد فرقت۔ مطبع یوسفی لکھنؤ۔ موضوع ہے عرب کی نئی راہوں مثلاً نظم بے ردیف و قافیہ کی مخالفت۔ اس میں بہت اچھے اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین ہیں، اور مستف کی پچاس طرہ نطیس ہیں جن میں بے ردیف و قافیہ نظموں کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے نرالی چیز ہے۔ ادبی پڑھا کی پیداوار ہے۔

## نئے لکھنے والے

نئے لکھنے والوں سے وہ لکھنے والے مراد ہیں جو اب تین چار سال پُرانے ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اقشام حسین صاحب - تنقید و تبصرے کے میدان میں باعزت جگہ حاصل کر لی ہے۔ متعدد رسائل میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ خیالات کا تجزیہ خوب کرتے ہیں۔ بات سلیبی ہوئی ہوتی ہے۔ نگاہ میں جدت تحریر میں دہائی ہے۔

چودھری محمد علی - یہ کسی طرح نئے نہیں ہیں۔ پرانوں میں بھی پُرانے ہیں۔ کبھی ’اودھ پنچ‘ میں ’بوانصیبین کے فلسفیانہ خیالات‘ لکھا کرتے تھے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ وہ وہ کر ادبی میدان میں آتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں نئے بن کر آتے ہیں۔ اب کئی برس کے بعد ’منزل‘ لکھتے آئے ہیں۔ اور اب کی پُرانے ڈھنگ کی طویل تہید اور گھماکر بات کہنا چھوڑ کر جدید طرز کا اعجاز اور پھرتی لے کر آئے ہیں۔ انتہائی سنجیدہ تیوروں سے تہقے کی بات کہ جانا انھی کا حق ہے۔ اپنے ایک مضمون یادِ احباب میں کہتے ہیں :-

”مخلے میں ایک عورت کے لڑکا ہو پڑا۔ شوہر اس کا برسوں سے باہر تھا۔ لاجول دلاقوہ۔ لوگوں نے

ایسا تعجب کیا گویا اُن ہونی بات ہوئی۔ ہم دردِ عورتیں جو آڑے وقت کام آتی تھیں، ماں کی ہم ددی میں بچے کو کوسنے دینے لگیں۔“

ان چند فقروں میں بلا کی جان ہے۔ منظر، کردار، ظرافت، فضا، سب کچھ ہے اور جدید خوبیوں اور اسلوب کو لیے ہوئے۔

## تبصرے

### ادبیات

(مؤلف سید قاسم علی صاحب ساہتیا انکار۔ صفحات تقریباً ۹۵۰۔ قیمت چھ روپے) | **اُردو کے ہندی ادیب** | جعفری برادرس مالک انوار احمد پریس (الآباد)

یہ کتاب مؤلف نے ہندی زبان اور ناگری رسم خط میں لکھی ہے۔ یہ بھی اُردو کی خدمت ہے اگر سلیقے اور صحت کے ساتھ کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ زبان اور واقعات کی بہ کثرت غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی کے تذکرے میں ان کی تصانیف میں ”شاعر اجیم“ ایک کتاب بتائی گئی ہے اور قوسین میں اس کے معنی لکھے ہیں ”مہاں کوی“ یعنی بڑا شاعر۔ یہ شعر الجیم کی خرابی ہے۔ ان کی دوسری کتاب کا نام ”سیرت النمان“ لکھا ہے۔ یہ سیرت النمان ہے۔ نون کا نقطہ عین پر سمجھ کر نعان کو غنان لکھ دیا ہے۔ تیسری کتاب ”مواجناؤن سینا دوبر“ یہ موازنہ انیس دوبر ہے۔ مولانا کی تصانیف پر کیا اچھی رائے دی ہے ”شبلی کی کتابوں سے علمی، ساہتہ (ادب) و صیات، نظر، مذاق اور تنقید اور ساہتہ (ادب) کا پتا لگتا ہے۔“ نہ معلوم ”وصیات“ کیا بلا ہے۔ ایک جگہ الف لیلہ، لکھ کر اس کے معنی قوسین میں ”بڑی کہانی“ لکھے ہیں۔ مولانا عبد الماجد کی ایک کتاب کا نام ”فلا سفی عزت عام“ لکھا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ایک کتاب ”جواہر سخن“ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ”آپ کی کتابوں میں سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔“ ڈاکٹر عابد حسین کے متعلق لکھتے ہیں ”تلاش حق جیسی قومی کتابوں کے برابر ترجمے کرتے چلے جاتے ہیں۔“ مولوی مفتی برہان الحق کے متعلق لکھتے ہیں ”آپ قومی لیڈر اور حکیمی کر کے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر اعظم کریوی کو میرٹھ کا باشندہ بتایا ہے حالانکہ ان کے نام کے ساتھ ”کریوی“ لکھا ہوا ہے۔ شاقب کو قومی شاعر لکھا ہے۔ حفیظ جالندھری کی ایک تصنیف تاریخ ہند بھی لکھی ہے۔

نواب محسن الملک کے حالات میں لکھا ہو کہ ”آپ کی لڑکی بھی طیبہ بیگم ادیب تھی جس نے ”انوری بیگم“، ”احمدی بیگم“ ناول لکھے ہیں۔“ نواب صاحب کے کوئی بیٹی نہ تھی۔ طیبہ بیگم نواب خدیو جنگ کی بیگم اور نواب عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ مولوی نذیر احمد کی تصانیف کے ناموں کی بڑی مٹی پلید کی ہو۔ مثلاً ”نواوش“، ”موزننا“ وغیرہ۔ احسن ماہر دی کے تذکرے میں لکھتے ہیں ”دیوان ولی کو آپ نے مفید جذبات کے ساتھ چھپایا ہے“ اس قسم کے عجیب و غریب واقعات اور دل چسپ عبارتوں سے کتاب بھری پڑی ہو۔

ایک تصویر جس کے نیچے مولانا شبلی کا نام لکھا ہو بہت ہی عجیب ہو۔ غالباً یہ منشی امیر احمد مینائی کی تصویر ہو۔ کتاب کی زبان بہت ناقص اور حالات بہت تشنہ اور بعض اوقات غلط ہیں۔ ہندو ادیبوں کے حالات تو بہت کم ہیں البتہ کلام کے اقتباسات بہت طویل ہیں جن سے کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہو۔ ادیبوں کے کلام پر ادبی و ادنیٰ تنقیدی رائیں گول مول غیر واضح اور بعض اوقات بے محل ہیں۔ افسوس کہ ایسے اچھے موضوع پر ایسی ناقص کتاب لکھی گئی ہو۔

### ماڈرن پرشین پائٹری | از ڈاکٹر محمد اسحاق بی ایس سی۔ پی ایچ ڈی لکچرار عربی فارسی۔ کلکتہ۔

انگریزی زبان میں یہ ایک مقالہ ہو جس کو فاضل مصنف نے لندن یونیورسٹی میں پیش کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہو۔ اس سے پیشتر وہ اسی موضوع پر ایک جامع کتاب ”سخن دران ایران در عصر حاضر“ شائع کر چکے ہیں جس میں ایران کے معاصر شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ موجودہ کتاب میں جدید فارسی شاعری کی پیدائش اور اس ماحول پر بحث کی گئی ہو جس میں اس نے پرورش پائی ہو۔ اس بحث میں جدید شاعری کی نئی زبان اور نئے موضوعات شامل ہیں۔ یہ بتایا گیا ہو کہ شروع سے اب تک فارسی شاعری میں زبان نے کیا کیا شکلیں بدلیں اور اب آخری شکل کیا ہو، عروض میں عہد بہ عہد کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور سیاسی تغیرات کے ساتھ ساتھ موضوعات شعر کیوں بدلتے رہے۔

مصنف کا یہ کہنا بالکل بجا ہو کہ فارسی میں جدید شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۰۶ء سے سمجھنا چاہیے۔ جب کہ

ایران میں آئینی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت سے لے کر سنہ ۱۹۴۵ء تک (جو رضا شاہ پہلوی کی تخت نشینی کا سال ہے) ایرانی شعرا ایسے مضامین پر نظمیں لکھتے رہے جو ایران کی اقتصادی معاشرتی اور سیاسی اصلاحات سے متعلق تھے، ان نظموں میں بعض اچھی ہیں لیکن اکثر و بیشتر کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ’کلامِ موزوں‘ کے تحت میں آسکتی ہیں، رضا شاہ کا زمانہ استبداد کا دور تھا جس میں شاعروں کو سیاسی یا اجتماعی موضوعات پر کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایران اپنی شاعری کا ورثہ کھو چکا ہے۔ فاضل مصطفیٰ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور ہم بھی ان سے متفق ہیں کہ مولانا جامی کے بعد ایران میں شاعری کا انحطاط شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ دورِ مغلیہ میں فارسی شاعری کا مرکزِ ثقل ایران سے منتقل ہو کر ہندوستان میں آگیا اور نسلِ حاضر کے زمانے تک وہ یہیں رہا۔ بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی کا آخری بڑا شاعر اقبال ہے۔

ایران میں جدید شاعروں کی کثرت ہے۔ کتاب زیرِ بحث میں ۸۳ شاعروں کے نام گنوائے گئے ہیں جن میں سے اکثر زندہ موجود ہیں۔ بعض وہ ہیں جو ایران کی گزشتہ عظمت کے گیت گانے والے ہیں بعض اخلاقی اور اجتماعی اصلاحات کے محرک ہیں۔ بعض قومی جذبات کے ابھارنے والے ہیں اور بعض سیاسی حالات پر نکتہ چینی کرنے والے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی حالی یا اکبر یا اقبال نہیں ہے۔

لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ فارسی میں اردو کی جدید شاعری کی طرح اوزان کو توڑنے پھوڑنے اور قافیوں کو غیر ضروری قرار دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بعض کم درجے کے شاعروں نے اگر ایسا کرنا چاہا بھی ہے تو ان کی کوششوں کے نتیجے جاذبِ توجہ نہیں ہو سکے۔ اسی طرح بعض ایسے شاعروں کی کوششیں بھی جنہوں نے فارسی کو بزعمِ خود ”خالص“ بنانا چاہا ہے ناکام رہی ہیں۔

کتاب زیرِ بحث جدید فارسی شاعری پر ایک مختصر لیکن عمدہ تبصرہ ہے جس کو پڑھنے سے ایک شخص اس موضوع سے خاصا واقف ہو سکتا ہے۔ تعدادِ صفحات ۲۲۶، طباعت نہایت دیدہ زیب ہے، قیمت کتاب کے اوپر کہیں نہیں لکھی گئی لیکن کسی فہرستِ کتب میں ہم نے پندرہ روپیہ لکھی دیکھی ہے۔ اگر واقعی یہ قیمت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ضخامت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے، مقامِ اشاعت کلکتہ۔ سنہ ۱۹۴۳ء (م-۱)



## حرب و ضرب

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ کسی کی نقل کرنا بھی، اُس کی تحسین کا ایک پیرایہ ہے۔ اقبال مرحوم کی اردو شاعری پر یوپی والے ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے بعض نئے شاعر اب اُن کی تقلید میں سرگرم ہیں۔ اس کا ایک تازہ نمونہ حضرت راز یزدانی، رام پوری کا یہ مجموعہ نظم ہے، جو رام پور کے ایک مطبع سے بہت صاف اور خوش خط چھاپ کر شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں نوجوان مصنف کی رنگین تصویر بھی موجود ہے اگرچہ وہ کچھ بہت اچھی نہیں چھپی۔

حضرت راز سے باہر کے لوگ زیادہ واقف نہ ہوں گے۔ ان کی عمر بھی غالباً ابھی کہولت کی منزل تک نہیں پہنچی ہے لیکن ایک عزیز نے ہمیں لکھا ہے کہ رام پور میں ان کا کلام خاصی طرح مشہور و مقبول ہو گیا ہے اور زیرِ نظر مجموعے سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے پرجوش اور پختہ مشتِ سخن گو ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سیاسی خیالات کے باعث انھیں حکومتِ رام پور نے قید کر دیا ہے اور کتاب کے ایک قطعے سے، جس کا عنوان ہے ”والدہ کی خدمت میں جیل سے“ (صفحہ ۷۷) اس خبر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کتاب کے آخر میں لائق مصنف کے دستخط اور ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تحریر ہے اگرچہ یہاں بھی پورا یا اصلی نام نہیں لکھا اور نہ شروع میں کوئی تمہید یا تعارف شامل ہے جس سے راز صاحب کے مزید حالات کا علم ہوتا۔

کتاب کے آخر میں قدیم طرز کی غزلیں ہیں ان کے آغاز میں سرِ ردق کے نیچے لکھا ہے: ع

اُنچہ در تقلید یاراں گفتمہ ام

لیکن غزلیات کے اس مجموعے کو تین ابواب میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔

کتاب کے چھو باب یعنی بڑا حصہ قطعات اور مختلف نظموں پر مشتمل ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

راز اسی کو اپنے خاص نتائج فکر کی حیثیت سے اہل نظر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس حصے میں ”اعترافات“۔ ”عصریات“۔ ”اسلامیات“۔ ”عرفانیات“ وغیرہ چھو ابواب ہیں۔ اور قریب قریب ہر جگہ اقبال مرحوم کے خیالات بلکہ طرزِ بیان اور الفاظ تک کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کتاب کا پہلا عنوان آیہ کریمہ

”اقرا باسم ربك الذی خلق“ اور پہلا شعر یہ ہے

اپنی صفات دیکھ کر سمجھا تری صفات تیں خالق کائنات تو، شورشِ کائنات تیں

اس شعر میں بندش کی خوبی اور فکری قوت موجود ہے لیکن تخیل پوری طرح روشن اور واضح نہیں اور نہ دونوں مصرعوں میں کوئی صاف ربط پایا جاتا ہے۔ یہی شعر آراز صاحب کی ساری شاعری کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کم سے کم دیر تبصرہ مجھ سے میں ہم جگہ جگہ محسوس کرتے ہیں کہ شاعر اس قدر اونچا اڑتا ہے کہ اکثر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اقبال کا طرز سخن خود ہی اغلاق سے خالی نہیں اس کی تقلید میں خواہی نہ خواہی لفظی اور معنوی لہجہ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں : ۷

دلیل، دستِ قوی کے لیے ہے قبضہ تیغ  
نشاطِ نعمۂ مرداں ہے جوشِ نعرۂ جنگ

۱۷

مخبرِ دار و رسن سے جو نظر واقف ہو      اس کو آساں ہے تماشے مقامِ منصور  
رحمتِ خار سے ہے منزلِ گلِ دالیتہ      اس میں کلیوں کی خطائیں ہیں نہ پھولوں کا قصور

۱۹

### ”تقدیر“

”جو خون بہاتی ہے جواں مرد کی شمشیر      لکھ دیتے ہیں اس خون سے کم زور کی تقدیر  
زندانی تہذیب و تمدن کی مصیبت      محکومی و توفیق توکل کی ہے تعزیر  
شاہیں کے لیے ننگ ہوں دانوں پر گرنا      فطرت نے بنایا ہو جھین رزقِ مسافیر  
کیا غم، جو فضاؤں میں کبوتر نہیں ملتے      ہو طاقت پر واز تو افلاک کا دل چیر“

۲۱

کچھ شبہ نہیں کہ آراز صاحب شعر گوئی کی فطری صلاحیت اور عمدہ مذاق رکھتے ہیں لیکن بلند پروازی اور فلسفیانہ شاعری کو مقبول و پُر اثر بنانے کے لیے، جب کہ وہ حقائق سے بحث کرتی ہو، بہت وسیع اور باقاعدہ مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آراز صاحب نے فکرِ سخن کے ساتھ ساتھ اس طرف توجہ فرمائی تو وہ ایک وقت میں خود صاحبِ طرز یا کم سے کم اقبال مرحوم کے بہت اچھے منوی

جانشین ہو جائیں گے۔

کتاب کی ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت دو روپے اور حضرت مصنف سے ”بزریا ظریف، رام پور“ کے پتے سے طلب کی جاسکتی ہے۔

سلسلہ مطبوعات عبدالحق اکیدمی - حیدرآباد - دکن | عبدالحق اکیدمی، اُردو لکھی، حیدرآباد دکن کی طرف سے تیرہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا سلسلہ شائع ہوا ہے جو بچوں کی معلومات بڑھانے کے لیے مرتب کی گئی ہیں۔ کہانیوں، قصوں، ڈراموں اور بچوں کی آپس کی بات چیت اور سوال جواب کی شکل میں بچوں کو نہ صرف اخلاقی اور ذہنی سبق دیے گئے ہیں بلکہ موجودہ زمانے کے بعض مسائل اور اس جنگ کے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں اور ڈرامے زیادہ تر ایسے ہیں جو نشر گاہ لاسکی حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں۔ نشری مسالائیوں ہی ”مختصر مفید“ کے اصول کا پابند ہوتا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں میں موضوع کے انتخاب کے ساتھ ہی حسن ادا اور آسان زبان کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض جگہ ناص حیدرآباد کی مقامی بولی ہندستان کے لیے زرا اجنبی ہوگی مگر یہ پنخارے کا کام دیتی ہے اور مطلب نبذا نہیں ہونے پاتا۔ اس لحاظ سے یہ کتابیں ہندستانی بچوں کے لیے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ موضوع اور نام بھی ایسے منتخب کیے گئے ہیں کہ بچوں کو خاص طور سے سننے کی رغبت ہو اور یاد رکھنے اور سمجھنے میں سہولت ہو مثلاً:

(۱) کھٹی میٹھی بتیاں (کہانیاں)	قیمت ۱۰/-	(۸) چھتری فوج (بات چیت)	قیمت ۳/-
(۲) لانا اکبر (کہانی)	۱۰/-	(۹) دسترخوان	۳/-
(۳) راجن سن کرو سو (ڈراما)	۱۰/-	(۱۰) سادہ زندگی	۳/-
(۴) جھومر کا دھاگا (”)	۴/-	(۱۱) کیڑے	۳/-
(۵) عبید (”)	۸/-	(۱۲) پڑوس	۳/-
(۶) سمندری جہاز (”)	۴/-	(۱۳) جنگ کے بعد کیا ہوگا	۳/-
دسول نہیں ہوئی (۷) زمین گول ہے (”)	۸/-	(در - ۱)	

## سیاسیات و معاشیات

پارلی مانی طرز حکومت | ریاست حیدرآباد کی مجلس اتحاد المسلمین کی طرف سے ایک ”دارالاشاعت“ کا شعبہ قائم کیا گیا ہے اور اُس نے چند کتابیں اور سیاسی تقریروں کے مجموعے شائع کیے ہیں۔ اس شعبے کی غالباً چھٹی کتاب یہ ہے جو ناظم صاحب دارالاشاعت کے الفاظ میں ”مولوی منظور الحسن صاحب ہاشمی بی۔اے کے وسیع مطالعے اور طویل مشقت کا نتیجہ ہے۔“ موضوع کے اعتبار سے کتاب کے باموقع اور ضروری ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اردو میں اب سیاسی آئین اور حکومت کی مختلف صورتوں پر دس پانچ کتابیں پہلے سے لکھی ہوئی مل سکتی ہیں۔ ہاں رسائل میں بھی اس بحث پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور خود جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے اپنے درسی نصاب کے واسطے سیاسیات پر کئی مشہور کتابوں کا ترجمہ کرایا ہے۔ اس نظر سے اگر یہ توقع کی جائے کہ نئی کتابیں سابقہ مطبوعات سے زیادہ جامع یا طرز بیان کے اعتبار سے، زیادہ شگفتہ اور واضح ہوں گی تو کچھ بے جا بات نہ ہوگی۔ پارلی مانی طرز حکومت کوئی سو صفحے کی چھوٹی سی کتاب ہے اور اس میں زیادہ تر برطانیہ کے آئین سے بحث کی گئی ہے۔ اجمالاً فرانس اور سوئس تان کے طرز حکومت کا بھی بیان آگیا ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے دیکھیے تو کتاب متوسط درجے کے اردو خوان طبقے کے لیے لکھی گئی ہے لیکن طرز تحریر و ترتیب پر نظر کیجیے تو وہ ایسے شوقیہ پڑھنے والوں کو غالباً حُکمل اور غیر دل چسپ معلوم ہوگی۔ ضرورت یہ تھی کہ کم سے کم بنیادی اصول کو بہت ہی صاف اور سلیس عبارت میں دل نشین کرایا جائے۔ فاضل مولف نے شاید اس صریح ضرورت کو محسوس نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر تمہید ہی میں لکھتے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ کی آستین نے یوں تعریف کی ہے: ”ایک متعین بالادست انسان جو کسی ہم رتبہ بالادست انسان کا تابع نہ ہو اور موجودہ معاشرہ کی اکثریت سے اطاعت حاصل کرتا ہو، تو وہ متعین بالادست انسان معاشرہ کا اقتدارِ اعلا ہے اور وہ معاشرہ بشمول بالادست سیاس اور آفاد ہے۔“ ہمارا خیال ہے کہ اس عبارت میں کتابت کی بھی دو غلطیاں ہو گئی ہیں لیکن چون کہ سنی پڑی طرح سمجھ میں نہ آئے اس لیے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

فاضل مولف نے اصطلاحات کے جو مرادف، موقع اور بے موقع بھی تحریر کیے ہیں ان سے عبارت جوہل ہو گئی ہو۔ دوسرے بعض اصطلاحات نہ صرف بے دھنگی بلکہ ہمارے خیال میں نادرست ہیں۔ جیسے جابر چند سری راج، انبو شاہی دیگرہ، جو معنوی اعتبار سے ناقص اور صوری اعتبار سے بد نما ہیں۔ انگریزی لفظ ”ویٹو“ کے لیے ”مخالفت“ استعمال کیا گیا ہو حال اُن کہ پہلے سے (حق) ”تنسیخ“ بولا جاتا ہو اور معنًا زیادہ صحیح ہو۔ کتاب کے مآخذ کی نہرست یا کتابیات کو شامل نہیں کیا گیا البتہ ذرا سے اعظم اور شاہانِ بھارت کی فہرستیں آخیں لگائی ہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحات پر صاف چھپی ہو اور بارہ آنے میں دارالاشاعتِ سیاسیہ، اُردو گلی، حیدرآباد کے پتے سے طلب کی جاسکتی ہو۔

**مشرق بعید** | دارالاشاعتِ سیاسیہ، حیدرآباد دکن ہی کی ایک اور کتاب ”مشرق بعید“ ہو جسے شاہد حسین صاحب رزاقی ایم، اے نے تالیف اور مشرق بعید کے مسلمانوں کے نام منون کیا ہو۔ پہلے ”ابتدائیہ“ کے عنوان سے ایک مجموعی تبصرے میں بتایا گیا ہو کہ یورپی اقوام نے کس طرح ایشیا کے ان بعید علاقوں میں رفتہ رفتہ اپنا اثر جمایا اور ہندستان سے آگے بڑھ کر بحر الکاہل کے بہت سے جزائر اور ساحلی ممالک پر قابض ہو گئے۔ گزشتہ صدی میں ان کی ساری کوشش اس پر مرکوز رہی کہ سلطنتِ چین کو کم زور کرتے کرتے بالآخر اس کے حصے بخرے کر لیے جائیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں بار بار انہی ریشہ دوانیوں اور بدنصیب چین کی بربادیوں کے مناظر ہمارے سامنے سے گزرتے اور ہر درد مند دل کو غم زدہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہوس ٹمک گیری کا یہ خون چکاں تماشآ آج بھی دنیا کے سب سے وسیع اور سب سے سرسبز آباد ملک میں کھیلا جا رہا ہو کہ آخر کار اُسے سب سے زیادہ تباہ و برباد کر کے چھوڑے۔

کتاب کے حصّہ اول میں مشرق بعید کے تمام ممالک اور بڑے جزائر کے الگ الگ حالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصّے میں دوبارہ سلطنتِ چین کے اپنے قوی دشمنوں کے ساتھ جو معاملات پیش آئے، انھیں جداگانہ عنوانات کے تحت تحریر کیا ہو کہ تاریخِ حاضرہ کی یہ اہم ناک داستان اچھی طرح ناظرین کے ذہن نشین ہو جائے۔

فاضل مولف نے محنت اور سلیقے سے کتاب مرتب کی ہے۔ نئی جذبات اور انسانی ہم دردی کا جوش بھی جا بہ جا نمایاں ہے لیکن کتاب اگر عام ناظرین کے واسطے لکھی گئی ہو۔ تو ہمارے خیال میں اسے اور زیادہ سلیس بنانے کی ضرورت تھی۔ اشخاص و مقامات کے ناموں اعلام زرا جلی قلم سے اعراب کی پوری صحت کے ساتھ لکھے جاتے اور اعداد و شمار بھی تازہ ترین فراہم کرنے ضروری تھے۔ مثلاً ’آس ترے‘ لیا کی آبادی ۶۴ لاکھ چند ہزار بتائی گئی ہے (صفحہ ۸۸) حال آنکہ اب اس کا شمار ایک کروڑ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ کتابت کی بھی غلطیاں رہ گئی ہیں در بعض اوراق کا خط زیادہ گنجان ہو گیا ہے۔ آئندہ طبع کی نوبت آئے تو ان اسقام کا احتیاط سے ازالہ ہو جانا چاہیے تاکہ یہ مفید کتاب زیادہ مقبول ہو سکے۔

صفحات ۱۳۴۔ قیمت سواڑپہ۔ لٹنے کا پتا، دارالاشاعتِ سیاسیہ۔ ’اردو گلی‘، حیدرآباد دکن۔

جامعہ عثمانیہ کے فاضل اساتذہ میں جو اپنی لیاقت کے سبب بیرونِ حیدرآباد کیا بیرونِ ہندستان

سلسلہ مطبوعات بزمِ معاشیات جامعہ عثمانیہ

بھی مشہور ہیں، ایک ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب پروفیسر معاشیات ہیں۔ پروفیسر صاحب نے طلبہ میں عملی معاشیات کا ہر اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم پانے کے بعد کیسا دقیق مضمون کیوں نہ ہو اتنا ضرر دہ پٹے پڑ جاتا ہے کہ اپنی زبان میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اسی استعداد، ذوق اور جذبے کی بدولت بزمِ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی طرف سے چند مختصر مگر بہت مفید اور برعمل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بڑی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کتابوں میں تازہ معلومات اور صرف ضروری باتیں دی گئی ہیں۔ یہ بیش تر خود جامعہ عثمانیہ ہی کے فارغ التحصیل اور موجودہ طلبہ کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ زبان سب کی صاف اور سلیس ہے اور ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ علمی اصطلاحات کو بھی عام فہم بنایا جائے۔ یہ گویا جامعہ عثمانیہ کے اس اولین مقصد کو حاصل کرنے کی پہلی سعی ہے کہ سارا ہندستان اپنی زبان میں مغربی علوم اور ان کی پیچ در پیچ باہمیوں کا مطالعہ کر سکے۔ اور یہ سعی بہت کامیاب رہی ہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی کتب کے برعکس ان کی قیمت، حجم اور تقطیع اس قدر مختصر ہے کہ ملک میں جلد ہی ان کتابوں کو قبولِ عام حاصل ہو جانا چاہیے۔

(۱) ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات، مولفہ محمد امد صاحب بی اے (عثمانیہ) ۱۰۸ صفحے قیمت ۵ روپے۔ اس مختصر رسالے میں معاشیات اور معاشی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے یعنی زر کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ زر پیسے کے معاملات کا تعلق تو ہر فرد بشر سے ہے لیکن اس کی علمی بلکہ یوں کہیے کہ کاغذی اور حقیقی قدر اپنی چند در چند پیچیدگیوں کی وجہ سے صرف معدودے چند کا اجارہ بن کر رہ گئی ہے۔ قابل مولف نے ایک طرف تو ان پیچیدہ مسئلوں کو صاف سیدھی زبان میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ پڑھنے والا بڑی سہولت سے سمجھ سکتا ہے بلکہ عجب نہیں جو لوگوں کو تعجب ہو کہ یہ مسئلے اب تک کیوں صرف معاشین کا اجارہ بنے رہے۔ اور دوسری طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان میں بڑے سے بڑے پیچیدہ علمی مسئلوں اور معاشی و تجارتی کوائف کے بیان کی کیسی صلاحیت موجود ہے صرف بیان کرنے والا ایسا ہو کہ زبان بھی جانتا ہو اور موضوع پر بھی عبور رکھتا ہو۔

(۲) حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات، — (جسم ۸۸ صفحے قیمت ۵ روپے) مولفہ نظام الدین احمد صاحبہ (عثمانیہ) پچھلے دس بارہ سال سے حیدرآباد نے صنعتی لحاظ سے بڑی ترقی کی ہے۔ موجودہ جنگ نے سمند ترقی پر ایک تازیانے کا کام کیا اور حکومت حیدرآباد کے ساتھ ساتھ حکومت ہند نے جو دل چسپی لی اس کی بدولت حیدرآباد جو اپنی وسعت، وسائل اور دیگر سہولتوں کی وجہ سے یوں ہی مالا مال تھا اب اور زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے دوش بہ دوش چلنے کا دم بھر رہا ہے۔ دکن میں ہن اور کپڑے برساتا تو ایک زبان زد محاورہ تھا مگر زیر تبصرہ کتاب میں حیدرآباد کے صنعتی اور کاروباری شعبوں کے جو مصدقہ اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خام اشیا کی برآمد، سونے چاندی کے معمولی کام اور بن سازی اور پارچہ بانی کے علاوہ اب وہاں خام اشیا کو خود کام میں لاکر مصنوعات کی برآمد کرنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کوئلے، لوہے کی کانیں نیز کاغذ، سیمنٹ اور ادویات کی صنعت کافی ترقی پزیر ہے۔ ادویات میں کھاد کی صنعت بہت امید افزا ہے۔ مختلف مصنوعات کے لیے کئی سو کارخانوں اور کیمٹیوں کا ذکر ہے جو سرکاری مراعات سے بھی بہرہ اندوز ہو رہی ہیں۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ جنگ کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے کچھ "تامن" بھی میسر آجائے گی جو ہماری صنعتی زندگی کے لیے آپ حیات ہے۔ حیدرآباد کی صنعتی ترقی سارے

ہندستان پر اثر انداز ہوگی اور اس لحاظ سے ہندوستانی صنعت گروں کے لیے یہ سلاطنتی ذخیرہ بڑے کام کی چیز ہو۔

(۳) 'حیدرآباد اور قیمتوں کی گرانی' [جسم ۴، صفحہ ۱، قیمت عدد۔ مولفہ احمد عبدالماجد صاحب (عثمانیہ)]

موجودہ جنگ کی طوالت کی بدولت جو دن بہ دن بڑھتی ہوئی گرانی سے ہم کو سابقہ پڑ رہا ہو اگر اسے بقول ڈاکٹر انور اقبال صاحب "روز افزوں بڑھتی ہوئی گرانی" کہ دیا جائے تو قیمتوں میں اس روز افزوں اضافے کو دیکھتے ہوئے زیادہ بے جا نہ ہوگا۔ گرانی کی بدولت سارے ملک میں ایک انتشار برپا ہو اور کیا حکومت ہند اور کیا صوبائی حکومتیں اور دیسی ریاستیں، سب قیمتوں پر نگرانی قائم کرنے کی بہتری تدبیریں سوچنے اور ان کو کامیاب بنانے کے لیے طرح طرح کے جتن کر رہی ہیں۔ زیر تبصرہ رسالے میں ان مسائل کا ذکر ہو جو حکومت حیدرآباد نے کی ہیں۔ اس مختصر رسالے میں ابتداءً کچھ نظری بحث کی گئی ہو جو اس حیثیت سے بہت مفید اور عوام کے لیے ضروری بھی ہو کہ ایسے معاملات میں حکومتی کوششیں صرف اسی وقت بار آور ہو سکتی ہیں جب کہ عوام تعاون کریں اور عوام اسی وقت تعاون کرنے پر پوری طرح آمادہ ہوتے ہیں جب وہ منصوبے کی بھلائی برائے کو سمجھ سکیں اور اس کی ضرورت کا احساس کر لیں۔ اس اور جنگ کی معیشت کا فرق، اخراجات جنگ کے اثرات، رسد و طلب کا تناسب اور توازن، یہ ایسے موضوع ہیں جو حکومت ہند اور حکومت حیدرآباد کے نظام میں فرق کے باوجود سارے ہندستان پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور ان موضوعوں کو سارے ہندستان میں سمجھی جانے والی زبان میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ جنگی گرانی کے اسباب سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہو۔

سلسلے کی حسب ذیل کتابیں بھی لکھی حیدرآباد میں گئی ہیں مگر سلسلے ہندستان کے لیے مفید ہیں اور بین الاقوامی حالات و کوائف کا بڑا اچھا اندازہ پیش کرتی ہیں:-

- (۴) 'جنگ اور غذا کا مسئلہ'۔ از شفیق الرحمان صاحب (عثمانیہ) جسم ۶۴ صفحہ قیمت ۱۲/۱۱
- (۵) 'جنگ اور راتب بندی' از سعید احمد خاں بینائی (عثمانیہ) قیمت عدد رسد کتاب ابھی موصول نہیں ہوئی۔
- (۶) 'جنگ اور ہندستان کا قومی قرضہ'۔ از محمد احمد خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) جسم ۷۰ صفحہ قیمت عدد
- (۷) 'انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے'۔ مترجمہ جناب محمد احمد خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)



جگم ۵۲ صفحے، قیمت ۸/-

(۸)، امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے، مترجمہ عطار الرحمان صاحب علوی، بی اے (عثمانیہ)،

جگم ۲۸ صفحے قیمت ۶/-

(۹) کنیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے، مترجمہ خواجہ محمد شمس الدین صاحب بی اے (عثمانیہ)، جگم

۴۲ صفحے، قیمت ۸/-

(۱۰) ہندوستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے، از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) جگم ۵۲ صفحے

قیمت ۸/-

(۱۱) 'موصول منافع زائد' - از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) جگم ۴۷ صفحے، قیمت ۸/-

(۱۲) 'ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے ایک مانجھ عمل' - (سرپرستوں داس ٹھاکر داس، جے آر۔ ڈی۔ ٹاٹا،

جی۔ ڈی۔ برلا، سر آر دیشر دلال، سر شری رم، کستور بھائی لال بھائی، اے۔ ڈی۔ شروف اور جان تھائی

کے مضامین کا ترجمہ) از جناب سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ)، جگم ۸۰ صفحے قیمت ۱۲/- (۱-۱)

(مولفہ سید عبدالواحد صاحب بی اے (آکسن)، بی اے سی رالہ آباد) سی۔

پچوبینہ کی ہوائی چٹنگی | ایف۔ ایس، ناظم حکمہ جنگلات ریاست حیدر آباد)۔ یہ چھوٹا سا تیس صفحے کا رسالہ

مطبوعات سررشتہ جنگلات مالک محروسہ سرکار عالی (ریاست حیدر آباد) کی پہلی قسط ہو۔ یہ بہت بروقت اقدام

ہو۔ ہندوستان پچھلی دو تین صدیوں سے جس دور ابتلا میں گرفتار رہا اس کا ایک بڑا ہلک نتیجہ یہ بھی ہو کہ ہمارے

فنون اور ہماری صنعتیں کچھ ایسی پامال ہوئیں کہ اب اگر اپنی زبان میں ہم ان کے متعلق کچھ لکنا بھی چاہیں

تو فنی اصطلاحات کے لیے ہم کو ارباب مغرب کی طرف ہی رجوع ہونا پڑتا ہو یا پھر از سر نو نئے ترے

کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ صنعتوں اور فنون کے ساتھ وہ فنی اصطلاحات اور خاص خاص نام بھی فراموش

ہو چکے ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ سے ایک زرعی ملک رہا ہو اور یہاں کی زمینی پیداوار ہی ملک کا سب سے

بڑا سرمایہ حیات بنی رہی۔ یہ آہنی دور تو انگریزوں کے آنے کے بعد شروع ہوا ورنہ عمارتی کاموں میں

ملکی چوبینہ ہی استعمال ہوتا تھا جس کی پرداخت اس طرح کر لی جاتی تھی کہ بیرونی لوہے کی ضرورت باقی نہ

رہتی تھی۔ لکڑی کا طرح طرح کا کام ہوتا تھا جو آج بھی لادرات و عجائبات کی شکل میں ارباب ذوق کے گھروں کی زینت ہے۔ مگر اب صرف ہی مصرف رہ گیا ہے کیوں کہ لوہے کی بہتات کے علاوہ اچھا چومینہ خود ناپید ہو گیا تھا۔ اب جنگ کے باعث لوہے کی قلت نیز اچھے چومینے کی اشد ضرورت کی بدولت اس صنعت کے دن بھروسے اور اندر نو ایک فن کی حیثیت سے چومینے کو مضبوط اور پائے دار بنانے اور اس کو طرح طرح سے مفید مطلب کرنے کی تدبیریں شروع ہوئی ہیں۔ زیر تبصرہ رسالے میں انہی تدبیروں کے عملی تجربوں سے بحث کی گئی ہے کہ چومینے کو ہوا میں رکھ کر ٹختہ کر کے نہایت سہل الحصول، مفید اور مخرب طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ چومینے کی قسمیں اور ان کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں اور جدولوں اور نقشوں کے ذریعے تدابیر کو زیادہ سے زیادہ عمل یزیر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں انگریزی اصطلاحات و ران کے اردو ترجموں کی ایک فہرست بھی ہے۔

(۱-۲)

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا : حبیب کمپنی، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔

**تذکرہ دارالعلوم** | نصیر الدین ہاشمی صاحب مؤلف ”دکن میں اردو“ وغیرہ کی تالیف ہے۔ مدرسہ دارالعلوم، حیدرآباد دکن کی قدیم درس گاہ ہے جہاں علوم مشرقی کو مرجع رکھ کر مغربی علوم کی تعلیم و تدریس کا بڑے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کا عظیم الشان ادارہ اسی مدرسہ دارالعلوم کی ترقی یافتہ اور وسیع تر شکل ہے مگر دارالعلوم اپنی جگہ پر اب بھی ایک مدرسہ فوقانیہ کی حیثیت سے قائم ہے۔ اس مدرسے میں جو سنہ ۱۸۵۶ء میں ایک بہت بڑے مقصد کے ساتھ قائم ہوا جب کہ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں بھی تشکیل پزیر نہیں ہو پائی تھیں، علوم مشرقی و مغربی کا ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا گیا تھا۔ تیسرے تبصرہ کتاب اس مدرسے کی ”نود سالہ“ سرگزشت ہے۔ ضمنی طور پر ہندوستان کی سماجی حالت، اور حیدرآباد کی سماجی، سیاسی اور تعلیمی تاریخ کا بھی خاص ذکر آگیا ہے جو بیرون حیدرآباد کے لوگوں کے لیے بھی کافی سبق آموز اور دل چسپ ہو سکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ تقریر بہت نظر افروز اور کئی حیثیتوں سے نہایت اہم ہے جو اپریل سنہ ۱۸۸۰ء میں نظام سادس میر محبوب علی خاں مرحوم نے حیدرآباد کی خصوصاً اور ہندوستان تمام کی عموماً تعلیمی حالت کے متعلق فرمائی تھی۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی والی ریاست نے جلسہ عام میں تقریر کی اور

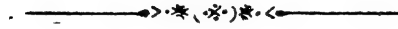
ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے تذکرے حیدرآباد کو ہندستان کے دوسرے علاقوں سے روشناس کرانے کے لیے بہت مفید اور اس لیے بہت ضروری ہیں۔ بہتر ہوتا کہ افراد سے بہت زیادہ بحث نہ کی جاتی اور زبان کی صحت کا بھی لحاظ رکھا جاتا اگرچہ شخصیتوں کے تذکروں اور افراد کی فہرست نیز جزوی امور کی بحث نے اس مختصر رسالے میں خاص افادیت پیدا کر دی ہے۔ جب ایک عرصے کے بعد ضرورت پڑتی ہے اور کتب تواریخ ان حوالوں سے معزاً اور ضرورت پوری کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں تو ایسے مقالات ارباب تحقیق کے زیادہ کام آتے ہیں۔

## سال نامے

’چنگاری‘ باوجود کاغذ کی قلت کے ’چنگاری‘ نے بڑی تقطیع پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کا سال نامہ شائع کیا ہے۔ مضامین بھی مختلف نوعیت کے اور دل چسپ ہیں۔ ادبی، تاریخی مضامین کے علاوہ افسانے اور نظمیں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ فلموں اور فلموں کے مشہور اور مقبول کرداروں کے متعلق بھی مفصل معلومات درج ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ فرصت کے وقت پڑھنے کی اچھی چیز ہے۔

’ادب لطیف‘ یہ سال نامہ ادبی حیثیت سے نہایت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔ اور اس میں اکثر لکھنے والے اردو کے قابلِ ادیب ہیں۔ شروع میں کئی مضمون جدید ادب کے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون جو قاضی عبدالغفار صاحب کا ہے اس میں صرف نقالی ہے۔ ان سب میں بہتر ایشام حسین صاحب کا مضمون ہے اور اسے سب سے پہلے جگہ دینی چاہیے تھی۔ سوا اثر لکھنوی صاحب کے سب نے ترقی پسند یا جدید ادب کی حمایت کی ہے لیکن یہ حمایت کچھ اس قسم کی ہے جیسے کوئی اپنا بچاؤ کر رہا ہو یا معذرت کے پردے میں اپنی تائید کے پہلو نکال رہا ہو۔ یہ کیوں؟۔ فنانوں میں کرشن چندر کا ”ان داتا“ بہت خوب ہے۔ کرشن چندر لکھنا جانتے ہیں۔ انھیں زبان اور اداسے خیال پر پوری

قدرت ہو اور موقع و محل کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے اثر پیدا کرتے ہیں۔ بعض افسانے اس میں ایسے آگئے ہیں جو بہت ہی کھلے دِلے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ان کے کھنکھنے والے جنسی جذبات اور شہوانی خیالات سے مغلوب ہیں اور یہ موضوع ان کا تکیہ خیال ہو گیا ہو۔ سب سے آخر میں ایک مضمون ”اہل زبان“ پر ہو۔ یہ کسی نے بہت ہی جَل جُل کر لکھا ہو۔ خوش مذاقی کی بھی کمی پائی جاتی ہو۔



# انجمن ترقی اردو (دہند) دہلی کی تازہ ترین مطبوعات

کیفیت	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
مکالمات افلاطون	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
نظریہ تعلیم (حصہ دوم)	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
کتاب الہند (حصہ دوم)	قیمت مجلد تین روپیہ (دہند)
چند ہم عصر	قیمت مجلد ڈھائی روپیہ (دہند)
اصطلاحات پیشہ ورانہ	قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (دہند)
حکایات اغانی (جلد اول)	قیمت مجلد پانچ روپیہ (دہند)
ہمارے بلیک	قیمت مجلد دو روپیہ بارہ آنے (دہند)
مشاہیر یونان و روم (حصہ اول)	قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (دہند)
ادبیات فارسی میں ہندو کا حصہ	قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (دہند)
پودے اور ان کی زندگی	قیمت مجلد تین روپیہ (دہند)
فردوسی پر چار مقالے	قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے (دہند)
دیوان بہرام	قیمت مجلد دو روپیہ چار آنے (دہند)
دیوان نظیر اکبر آبادی	قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے (دہند)
انجمن ترقی اردو (دہند)	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
مکالمات افلاطون	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
نظریہ تعلیم (حصہ دوم)	قیمت مجلد چار روپیہ (دہند)
کتاب الہند (حصہ دوم)	قیمت مجلد تین روپیہ (دہند)
چند ہم عصر	قیمت مجلد ڈھائی روپیہ (دہند)
اصطلاحات پیشہ ورانہ	قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (دہند)
حکایات اغانی (جلد اول)	قیمت مجلد پانچ روپیہ (دہند)
ہمارے بلیک	قیمت مجلد دو روپیہ بارہ آنے (دہند)
مشاہیر یونان و روم (حصہ اول)	قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (دہند)
ادبیات فارسی میں ہندو کا حصہ	قیمت مجلد چار روپیہ آٹھ آنے (دہند)

مینجر انجمن ترقی اردو (دہند) نمبر (۱) دریا گنج، دہلی

# رسالہ ”سائنس“ کانیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے رسالہ ”سائنس“ بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق حملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:-

معتمد مجلس ادارت رسالہ ”سائنس“

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:- رسالہ ”سائنس“ کے برائے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ء) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء) تک دفتر انجین ترقی اردو (ہند)، دہلی سے \* قیمت ایک روپہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محمول ڈاک) طلب فرمائیے۔

**APRIL 1944**

**No. 2**

# **THE URDU**

**The Quarterly Journal  
OF  
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)**

---

*Edited by*  
**ABDUL HAQ**

---

*Published by*  
**The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)**  
**Delhi.**







# اُردو

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر :- عبدالحق

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

# اُردو

نمبر ۴

اکتوبر سنہ ۱۴۴۲ھ

جلد ۲۴

## فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔	اُردو یونیورسٹی	ایڈیٹر	۴۶۱
۲۔	آغا فہم (نظم)	مولوی سید ہاشمی صاحب	۴۶۹
۳۔	نیا ادب	جناب غلام یزدانی صاحب	۴۷۰
۴۔	ترقی پسند ادب	جناب عزیز احمد صاحب استاد ادبیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)	۴۸۶
۵۔	سرسید خطوط کے آئینے میں	جناب خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے	۵۴۱
۶۔	تبصرے	ایڈیٹر و دیگر حضرات	۵۵۷

سید صلاح الدین جالی منیر انجمن نے جید پریس جلی ماراں دہلی میں چھپوا کر  
دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

## وقت کا اہم تقاضا:

## اردو یونیورسٹی

(\*)

مغل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس کے اجلاس ناگ پور میں ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو سب سے اہم قرارداد اردو یونیورسٹی کے قیام کے متعلق تھی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ قرارداد یہ تھی :-

مدرس کانفرنس کی رائے ہو کہ اردو کی مقبولیت اور صلاحیت کے پیش نظر نیز اس کی افادیت کو مزید موثر بنانے کے لیے اس اند کی ضرورت ہو کہ برطانوی ہند کے کسی مرکزی مقام پر ایک چارٹرڈ اردو یونیورسٹی قائم کی جائے اور انجمن ترقی اردو ہند سے درخواست ہو کہ وہ اس کے قیام کے امکانات پر غور و خوض کرے اور اس سلسلے میں ابتدائی تدابیر عمل میں لائے۔۔۔۔۔

یہ ہمارے ملک کی بلصیبی ہو کہ ابتدا سے جدید تعلیم کا ڈول کچھ ایسا پڑا کہ جو فوائد اس سے مترتب ہو سکتے تھے وہ نہ ہوئے اور بعض اعتبار سے جو نقصان اس سے پہنچے اُن کی تلافی اب تک نہ ہو سکی۔ غیر زبان کا سیکھنا نہ تو کوئی بُری بات ہو اور نہ کچھ زیادہ مشکل، بلکہ ایک لحاظ سے مستحسن ہو، بقول گوٹے کے کہ جو صرف اپنی ہی زبان جانتا ہو وہ کوئی زبان نہیں جانتا۔ لیکن جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعے سے لازم قرار دیا جائے جو بالکل اجنبی ہو تو وہ ایک عذاب ہو جاتا ہو۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضلل ہو جاتے ہیں اور حجت و جودت مفقود ہو جاتی ہو۔ ایک وقت تو خود زبان سیکھنے کی ہو اور دوسرے اُس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہو اور نہ مضمون پر۔ اور وقت و گنا بلکہ کئی گنا زیادہ صرف

ہوتا ہو۔ اور سب سے عزیز حصہ اس اکھن میں بے کار جاتا ہو۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو اس خنیت میں مبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہو کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمران، انگریزی زبان اور انگریز یا دوسرے یورپی مستفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے طلبہ کے دماغ و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہو اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں نقالی اور تقلید غالب آجاتی ہو۔ اس ذہنی تکبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ان میں اور ان کے ماحول میں مغایرت پیدا ہو جاتی ہو جو قومی ترقی اور نشو و نما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہو۔ اس باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہو۔

نبالائے اور جذبات ادا کرنے کے لیے زبان ایسی ہی ضروری ہو جیسے انسانی زندگی کے لیے آکسیجن۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قوی روایات، تہذیب و تمدن کے شعار اور فہمی و روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت میں اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہو۔ یہ تعلق نہ زبان سے پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری جدید تعلیم نے ہمیں اس سے بہت کچھ محروم کر دیا ہو۔ انگریزی طرز بیان و طرز خیال اور انگریزی لفظوں اور جملوں کی ساخت و ترکیب ہمارے تعلیم یافتہ گروہ کے دل و دماغ میں ایسی رچ جاتی ہو کہ جب وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں تو وہ ہماری زبان اور زبان دالوں کے لیے اجنبی ہوتا ہو۔ اس سے لطف حاصل کرنا تو درکنار بعض وقت اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہو اور حسن بیان جو ادب کی جان ہو پیدا نہیں ہونے پاتا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہو کہ ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ ان علوم و فنون کو جو ہم نے انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کیے ہیں اس ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل کر سکیں کہ اہل ملک ان سے مستفید ہو سکیں۔ یہ علم گونے کا گڑ ہو گیا ہو۔ تعلیم سے جو یہ منشا تھا کہ اس سے علم کی روشنی ملک میں پھیلے گی اور جو لوگ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے پڑھ پڑھ کر نکلیں گے وہ اپنی معلومات سے اہل وطن کو نہال کر دیں گے، پورا نہیں ہوا۔

ایک ایسے ملک کے لیے جو علم میں پس ماندہ بھی ہو اور مفلس بھی، ایک اجنبی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا نہایت مفترت رساں ہو۔ یہی وجہ ہو کہ تعلیم کی رفتار بہت سست ہو۔ سادہ سال کی تعلیم کے بعد بھی اب تک پورے ایک فی صدی اشخاص بھی یونیورسٹی کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہوئے۔ اگر یہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعے سے دی جاتی اور اُس میں علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ کی جاتیں تو دوسرے فوائد کے سوا اُن آزاد مدارس کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچتا جو سرشتہ تعلیم کے قواعد یا کسی یونیورسٹی کے نصاب کے پابند نہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں اُن کے نصاب تعلیم میں داخل ہو جاتیں اور وہ بغیر کثیر مصارف کے یونیورسٹی کی تعلیم میں برداشت کرنے پڑے ہیں، متمتع ہوتے۔ علاوہ اس کے وہ اشخاص جو یہ دجہ عدم استطاعت یا دوسری مجبوریوں سے اعلا تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ان علمی کتابوں کو اپنی زبان میں پڑھ کر بہت کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ اہل ملک۔ کو ان فوائد سے اس لیے محروم رہنا پڑا کہ تعلیم غیر اور اجنبی زبان میں دی جاتی ہو۔

بُڑا اٹلیا میں جو ہم نے یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہو، اُس کا ذریعہ تعلیم ہم نے اردو زبان اس لیے قرار دیا ہو کہ شمالی ہند کے بہت بڑے علاقے میں یہ مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ شمالی ہند کے ملک کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی اردو کا عام رواج ہو گیا ہو اور وہاں بھی یہ ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہو۔ ان علاقوں میں جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں اُن کے لیے بھی یہ اجنبی نہیں۔ علاوہ اُن لوگوں کے جن کی مادری زبان اُردو ہو، وہاں کا ایک کثیر حصہ آبادی اُسے بڑا تکلف بولتا اور سمجھتا ہو۔ غرض اختلاف السنہ کے باوجود وسیع رقبوں میں اور گروہوں اشخاص کے لیے اردو جامعی زبان بننے کی بخوبی صلاحیت رکھتی ہو جس کے ذریعے اعلا تعلیم کو عام کر کے ہم صوبائی زبانوں یا مقامی بولیوں کو بھی آئندہ بہت کچھ ترقی دے سکتے ہیں۔ اس موقع پر میر اس سبب پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ بالفعل ہمارے پیش نظر شمالی ہند ہو جہاں ایسی یونیورسٹی کا قائم کرنا نسبتاً آسان ہو۔

اس وقت اُس پُرانی بحث کا چھیڑنا لاجائز ہو کہ اردو میں یہ صلاحیت ہو یا نہیں کہ وہ

اعلا تعلیم کا ذریعہ ہو سکے۔ اُردو زبان کی صلاحیت کا بین ثبوت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہی اس وقت کی بات۔ لیکن اُردو نے ایک صدی قبل بھی اپنی اس صلاحیت کا حیرت انگیز ثبوت دیا تھا۔ دہلی کالج میں تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔ اُس وقت کے ماہرانِ تعلیم اور افسرانِ سررشتہ تعلیمات نے معائنے کے بعد اس طریقہ تعلیم کو بہت سراہا۔ پرنسپل کارگل اپنی سالانہ رپورٹ دہلی کالج بابت ۱۸۵۲ء میں لکھتے ہیں کہ ”مشرقی شعبے کے طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔“ آگے چل کر پرنسپل موصوف اسی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”حال ہی میں اس کالج کا معائنہ کرنے کئی اصحاب تشریف لائے جن میں نہایت ہی ذہین و طباع افسرانِ فوج، مشنری اور تعلیمی مسائل کا عملی تجربہ رکھنے والے اصحاب تھے۔ انھوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم نجوم، سائنس اور مذہبی اور عام اخلاقی مسائل پر گفتگو کی اور انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس شعبے میں یقیناً بہت ترقی ہوئی ہے اور مختصر یہ کہ اس طرح کا نظام تعلیم ہندستان بھر میں کہیں اور نہیں ہے۔“ (پرنسپل کارگل کی رپورٹ بابت ۱۸۵۲ء)

اس رپورٹ پر لفٹننٹ گورنر بہادر نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ ”طلبہ (شعبہ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو یقین دلایا گیا ہے اُس سے بے حد مسرت ہوئی۔“

تعلیم عامہ صوبہ بنگال کے سرکاری تبصرہ بابت ۱۸۵۳ء میں دہلی کالج کے متعلق حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں :-

”ایک خصوصیت دہلی کالج کی ایسی ہے جس سے وہ شمالی اور جنوبی صوبہ جات کے تمام کالجوں پر فوقیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں بڑی حد تک تعلیم دیسی زبان (دُردو) کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔ یہ صورت خاص کر ریاضی اور اُس کی تمام شاخوں میں اور اُس سے کچھ کم درجے پر تاریخ اور اخلاقیات میں ہے۔ اس اصول پر پہلے مسٹر بوئروس نے اپنی پرہیزی کے زمانے میں عمل کیا اور اُن کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگ نے بھی اُسی جوش اور سرگرمی کے ساتھ اُسے جاری رکھا اور اب دہلی میں یہ

طریق تعلیم مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہو۔ یہ نہایت ہی اچھا ہوگا کہ اس نظام کو آزادی سے ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ چند برسوں کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اس کے نتائج کا دیگر تعلیمی نظاموں کے نتائج سے مقابلہ کریں۔“ (تجصرہ بر تعلیم عامہ صوبہ بنگال از بجے گر حصہ دوم ۱۹۵۷ء)

مسٹر فریڈرک موٹ (MOUVAT) ایم۔ ڈی۔ ایل۔ ایل۔ بی فرسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ و سکریٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے اپنی رپورٹ میں دہلی کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی استعداد اور قابلیت اور خاص کر ان کی سائنس کی واقفیت پر بہت قابل تحسین الفاظ میں تعریف کی گورنمنٹ مغربی شمالی نے جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپورٹ بابت ۱۹۵۷ء پر جو رزلویشن لکھا اُس میں اُس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہو :-

”اُردو کے ذریعے سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہو اُس کی مسٹر موٹ نے بہت تعریف کی ہو۔ ہر آری تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہو اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔“

کالج کی مجلس ترجمہ نے تقریباً سوا سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر تالیف اور ترجمہ کیں اور علمی اصطلاحات کے ترجمے کے لیے ایسے اچھے قواعد وضع کیے جو اب بھی کار آمد ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کالج قائم رہتا اور حالاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ضروری ترقی ہوتی رہتی تو یہی سب سے پہلی اُردو یونیورسٹی ہوتی اور یہ ہمارا بڑا شان دار کارنامہ ہوتا۔ لیکن ۱۹۵۷ء کی شورش کے بعد دلی صوبہ پنجاب میں داخل کر دی گئی اور کالج توڑ دیا گیا اور اس طرح سالہا سال کی محنت اور آئندہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اُردو یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد خاں کو ہوا، جب کہ انھوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے) اس بارے میں ایک عرض داشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی۔ اس عرض داشت میں سر سید نے اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہو اور اس اثر پر خاص طور سے زور دیا ہو کہ جب تک جدید علوم ہم کو



ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے، ہماری تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر موثر رہے گی۔ پھر اُس طریقہ تعلیم کا ذکر کیا ہو جو اُس وقت ملک میں رائج تھا اور تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ اب بھی رائج ہو اور اُس کے نقائص اور خامیوں پر بحث کی ہو، اور جو اعتراضات اور شبہات مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق ہو سکتے تھے انھیں رفع کیا ہو۔ سرسید کی تجویز کا خلاصہ یہ ہو :-

”گورنمنٹ ہند اعلا درجے کی تعلیم عام کا ایسا سررشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم ویسی زبان کے ذریعے سے ہوا کرے اور ویسی زبان میں انھی مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جن میں کہ اب طالب علم کلکتہ کی یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کے عوض میں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اُن طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو انھی مضمونوں کا ویسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ حاصل یہ کہ خواہ تو ایک ’اُردو‘ ذریعہ کلکتہ کی یونیورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونیورسٹی ویسی زبان کی صلاحیت مقرر کی جائے۔“

یہ عرضداشت ایسوسی ایشن کے ممبروں کے دستخط سے (جس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے) ہر ایکسی لنسی داسرائے و گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل کی خدمت میں پیش کی گئی اور اس بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے مراسلت بھی ہوتی رہی۔ وزیر ہند نے بھی اس خیال کو پسند کیا۔ اخباروں میں بھی کچھ دنوں تک اس پر بحث رہی لیکن افسوس ہو کہ اُس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ اہم تجویز جس میں ہندستان اور خاص کر شمالی ہند کی علمی اور تہذیبی ترقی کے شاندار اور وسیع امکانات مضمر تھے، عمل میں نہ آسکی۔ لیکن اب حالات بہت بدل گئے ہیں اور زمانہ ایسا آگیا ہو کہ وہ رکاوٹیں جن کو اُس وقت بڑی اہمیت دی جاتی تھی، باقی نہیں رہیں اور نہ اب اُن اعتراضات اور شبہات کا وجود رہا ہو جو اُس زمانے میں لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھے اُس وقت یہ ایک انوکھی تجویز خیال کی جاتی تھی، لیکن اس زمانے میں حالات کے اعتبار سے، یہ ایک ایسی تعلیمی تجویز ہو کہ نہ نو اُس (مول) سے جس پر یہ سنی ہو کسی کو انکار

ہو سکتا ہو اور نہ اس کے عمل میں لانے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش آسکتی ہو۔

شاید اب بھی نصاب تعلیم کے مسئلے پر کچھ رد و دلہ کی جائے لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ مشکل ایسی نہیں جو حل نہ ہو سکے اردو زبان نے اس عرصے میں علم و ادب کے میدان میں بہت کچھ ترقی کر لی ہو اور ایسی ہی صلاحیتیں اور ایسے نئے اسلوب حاصل کر لیے ہیں کہ اس میں مختلف قسم کے علوم اور مختلف ذمہ داریوں کے بندھن ادا کرنے کی کافی قدرت پیدا ہو گئی ہو اس کا بہت کچھ سامان جامعہ عثمانیہ نے مہیا کر دیا ہو اور باقی جو ضرورت ہوگی اس کے مہیا کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو بہ طرح آمادہ ہو

اس موقع پر یہ بھی بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہو کہ اس یونیورسٹی کے طبیب کے لیے انگریزی زبان کی تحصیل نہ صرف قطعی طور پر لازم ہوگی بلکہ اس کے پڑھانے میں زیادہ تاکید اور توجہ کی جائے گی ہمارا خیال ہو کہ جب دیگر علوم اور مضامین پر سے انگریزی کی قید اٹھالی جائے گی تو نہ صرف انھیں انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے زیادہ وقت ملے گا بلکہ وہ اسے زیادہ شوق سے اور بہتر طریقے سے حاصل کر سکیں گے

اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے بعض امور خاص طور پر ذیل ذکر ہیں۔

#### ۱۔ سرمائے کا سوال

۲۔ مقام، یہاں بونی دسٹی قائم کی جائے

۳۔ نصاب تعلیم اور اس کی کتابیں۔

ان امور پر غور کرنے کے لیے ایک اساتذہ مجلس قائم کی جائے گی اور وہ خاص خاص شعبوں کے لیے دہلی مجلس بنائے گی۔ لیکن نصابی اور دوسری ضروری کتابوں کے متعلق انجمن ترقی اردو سندھ و قوٹ کے ساتھ اس بات کا یقین دلاتی ہو کہ وہ اس ضرورت کے پورا کرے میں کما حقہ کوشش کرے گی۔ یہ اہم مسئلہ ہو جس کے متعلق ابتدا سے متنبہ ظاہر کیا گیا ہو اور اب بھی بہت سے لوگ اس سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ جس وقت سرسید نے اپنی عرضداشت اردو یونیورسٹی کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا

میں بھی تو گورنر جنرل ان کونسل، سکرٹری آف اسٹیٹ اور ڈائریکٹر تعلیمات نے اسی دُشواری کا اظہار کیا تھا کہ نصاب کی اور نصاب کے علاوہ علوم و فنون کی دُوسری کتابیں جو ٹیکمیل علم کے لیے ضروری ہیں کہاں سے آئیں گی۔ انجمن ترقی ’اُردو‘ ہند بخوشی اس بڑی ذمہ داری کو اپنے سر لینے کے لیے تیار ہو اور وہ اس کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کرے گی اور جس طرح بن پڑے گا اس کام کو انجام دے گی۔ رہے دُوسرے امور، سو ان کا فیصلہ اساسی مجلس اور اس کی ذیلی مجلسیں کریں گی۔

سب سے پہلے ہم ان یونیورسٹیوں کی خدمت میں اپیل کرتے ہیں جو ان علاقوں میں واقع ہیں جہاں ’اُردو‘ زبان رائج ہو کہ وہ اس تجویز کو قبول کر کے تدریجی طور پر یا جس طرح وہ مناسب خیال کریں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ اگر ان میں سے کسی یونیورسٹی نے اسے قبول کرنے کی ہمت کی تو وہ ایک ایسی بے بہا مثال پیش کرے گی جس کا نام ہمیشہ فخر و عزت سے لیا جائے گا۔ اور اگر بد قسمتی سے ان میں سے کسی یونیورسٹی نے بھی ہماری درخواست قبول نہ کی تو پھر ہم الگ یونیورسٹی بنانے کا ڈول ڈالیں گے اور جہاں تک ہمارے امکان میں ہو ہم کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے اور پوری قوت اور ہمت صرف کر دیں گے، اب یہ بات کہ یہ یونیورسٹی کیسی ہوگی، کہاں ہوگی، اس کے لیے سامان کہاں سے ہینا جوگا؟ یہ سب باتیں ہماری اساسی مجلس طو کرے گی۔

## عبدالحق

معمد اعوازی انجمن ترقی ’اُردو‘ (ہند)

## معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ ’اُردو‘ (۱۰ اکتوبر سنہ ۶۴) جس کی کتابت پوری ہو چکی تھی، جدید سرکاری احکام کی بنا پر نہ وقت پر شائع کیا جاسکا نہ مقررہ ضخامت قائم رکھی جاسکی۔ امید ہے کہ ناظرین ہیں اس باب میں معذرت و تقصیر فرمائیں گے حکومت نے آخر اکتوبر میں جو منظوری دی ہو اس کے مطابق رسالہ چھاپ کر شائع کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں قلم کو کسی قدر اوجھل کر کے رسالے کی ضخامت آٹھ جز یا کچھ اور زیادہ کر دی جائے گی تاکہ مضامین کی مقدار میں حتی الامکان کمی نہ آنے پائے۔ رسلے کا کاغذ سرکاری اجازت کے مطابق استعمال کیا جا رہا ہے۔ فقط۔

(ادارہ)

وَبِهِ نَسْتَعِيْنُ

# آغازِ مہم

(بقلم سید ہاشمی فرید آبادی)

ہر سمت سے مٹھ پھیر کے، باندھے ہوئے احرام  
 ہر کعبۂ مقصود کی جانب مرا اقدام  
 ہمت ہو بہ اندازہٗ دُشوارِ مَنزل  
 بلتا ہو صعوبت میں سفر کی مجھے آرام  
 چبھتے ہوئے کانٹوں میں ہو مہمیز کی تاثیر  
 اُفتاد میں رستے کی ہو برخیز کا پیغام  
 ایمائے کُٹایش مجھے ہر عقدہٗ مُشکل  
 پرواز کی تحریک مجھے ہر گروہِ دام  
 وہ مطمحِ عالی ہو مرے شوقِ گُزِیں کا  
 جاسکتی نہیں جس کی حدوں تک ہوں خام  
 اللہ نے تقدیر شکن دی مجھے تدبیر  
 اور عزمِ وہ محکم کہ جو ہوتا نہیں ناکام  
 صادق ہو طلب، پاک ہو دل، میری ہم کا  
 مسعوو سرِ آغاز ہو مقبول سرِ انجام!

## نیا اُردو ادب (۱۸۷۴ء تا ۱۹۴۴ء)

(بقلم جناب غلام یزدانی صاحب ناظم آثارِ قدیمہ حیدرآباد)

—•—

۰ (اس موضوع پر ہم رسالہ ’اُردو‘ میں جناب عزیز احمد صاحب کے ایک سیر حاصل مضمون کی آخری قسط شائع کر رہے ہیں لیکن جناب غلام یزدانی صاحب جن کی فاضلہ علمی اور کہنہ نشینی مسلم ہو۔ یقین ہو کہ ان کے ذاتی تاثرات و نظریات کو خاص دل چسپی سے مطالعہ کیا جلتے گا۔ ادارہ [ ہم نوا بہنو اور ہم طریق دوستو! جب سے میرا وظیفہ ہوا ہے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مجھے کوئی شغل نہیں رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے سے زیادہ مصروف ہوں۔ فرق البتہ اتنا ضرور ہوا ہے کہ پہلے میں آثارِ قدیمہ سے چمٹا ہوا تھا۔ اور اب وہ خود مجھ سے پیٹ گئے ہیں اور کسی طرح پینڈ نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے اگر کوئی کرم فرما کسی اور علمی کام میں پھنسا دیتا ہے تو میں اسے خلاصی بخشتا ہوں۔ آج کے مضمون کے لیے بھی میں اپنے دو محترم دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جن کے حکم کی تعمیل میں آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اس وقت آثارِ قدیمہ کا کوئی تصرف اور قبضہ میرے دل و دماغ پر نہیں ہے۔ نئے اُردو ادب کی ابتدا اور نوعیت پر بعض لائق مصنفین بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ جن کی اہمائی کیفیت آپ رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب ’تاریخ ادب اُردو‘ یا پروفیسر عبدالعادر سرودی کی عامانہ تالیف ’جدید اُردو شاعری‘ میں شاید پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو ادب کے اس نئے دور کو آغاز ہوئے اگرچہ پورے ستر برس گزر چکے ہیں۔ تاہم پرانی طرز کے دل دادہ غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، کے میدان میں قدما کے رنگ میں اب تک ڈوبے ہوئے ہیں۔

اور جو ان میں ذہین اور طبع ہیں ان کا کلام درد اور انسان فی تاثرات کے جذبہ میں، یا حقیقتِ نفس اور معرفتِ الہی کی جستجو میں، یا زندگی کے واقعات کو موثر پیرائے میں پیش کرنے میں، یا قومی یا انفرادی کارناموں کی سبق آموز داستان سننے میں وہ جدید کی نظر سے کسی طرح کم نہیں۔ منار کے دور پر میں دو شاعروں کا نام لیتا ہوں۔ حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت مہدی جہدر آبادی۔ یہ دو ندیم طرز کے لکھنے والے ہیں۔ ایک غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہیں اور دوسرے رباعی نویس ہیں۔ کلام دیکھا جائے تو وہی پُرانی بحریں ہیں اور وہی الفاظ۔ لیکن ان کے اعلا خیال اور صنعت گر طبیعت نے انہی الفاظ کو اُلٹ پت کر اس رسیب سے سجا دیا۔ ایسے معنی پیدا کیے ہیں کہ انسانی زندگی کا ہر منظر ایک دل کن انداز میں آپ کے سامنے آتا ہے اور شوقِ محبت کے سوز و گداز کے علاوہ فطرت کے راز اور مابعد طبیعیات کی باریکیاں بھی آپ پر روشن ہو جاتی ہیں میں پرانی لکیر کا فقیر نہیں۔ نئی تحریکات کا دشمن۔ بلکہ ہر نئی چیز میں تازگی کی چاشنی کے علاوہ میں ترقی کی جھلک دیکھتا ہوں۔ میرا عرض کرنا صرف یہ ہے کہ آزاد اور حالی نے حبِ وطن گوی اور پُرانی دیش کو مذموم ٹھہرایا۔ اس وقت اُردو شاعری کی حالت بہت زبوں تھی۔ ندر کے بعد نئی پچیس برس میں علم و فضل کی جتنی شمعیں تھیں سب بجھ گئیں۔ جو لوگ شعر کہتے تھے وہ صرف نقالی کر لے تھے ادھر مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی نظم کی جگہ گھٹنے ان مسلمانین کی نظر کو خیرہ کر دیا۔ اور انھوں نے اپنے خیال میں مغربی اسلوب کو پیش نظر رکھ کر آئندہ اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ حالانکہ اس کی بنیاد کے لیے مسالا پہلے سے بہت کچھ فراہم ہو چکا تھا۔ نسیہ الہ آبادی تقریباً اسی برس پہلے اپنے دناموں، میں تمدن اور تہذیب، رسم و رواج، مناسب، حقیقت، عشق و وارفتگی، موسم و مناظر، غرض فطرت، قدرت اور معرفت کے سر جلوے کو پیش کر چکے تھے۔ اور بحرد میں بھی تغیر و تبدل کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو کے قدیم قصیدوں میں باریہ نگ منویوں میں معاشقہ اور نفسیاتی کیفیات اور رباعیوں میں معرفت اور اسرارِ الہی کے نرالے پہلے سے موجود تھے۔ بہر حال صاحبانِ انگریز کی تائید سے نئی نظم کی ذب سر پرق ہوئی۔ نقد انعامات اور جتنے

پروفیسر اور بیٹھ مولوی نظم نویس مجھے وہ تقریباً سب کے سب شمس العلماء یا خان بہادر بن گئے۔ غزل بے جاری صاحب بہادر کی فہم سے بالاتر تھی۔ اس لیے اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ اور وہ مشرقی فنون لطیفہ کی طرح قابلِ التفات نہ سمجھی گئی۔ غزل گوئی حقیقت میں ایک کٹھن کام ہو۔ دو مصرعوں میں ایک پڑا مضمون باندھ دینا۔ جس میں جوش بھی ہو دلولہ بھی۔ یاس بھی حیران بھی۔ خوشی بھی راحت بھی۔ خیال کی دُنیا میں اسرارِ الہی کی تہ کو پہنچنا اور صحائفِ آسمانی کے دقیق نکات کی ترجمانی کرنا۔ پھر انداز بھی اچھوتا، ترکیبیں دلکش، زبان دل فریب، اور سب میں زیادہ قافیہ اور ردیف کا التزام رکھنا اور الفاظ کا لہروں سے ترنم پیدا کرنا، یہ مشرقی دماغ ہی کر سکتا ہو۔ اور مشرقی ذہن ہی اس کی داد دے سکتا ہو۔ یادِ جودِ نئی طرز کی نظموں کی عالم گیر مقبولیت کے مشاعرے غزل میں اب بھی نئی روح پھونکتے رہتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا ادارہ ہو جس سے غزل گوئی کے مُردہ ہونے کا اندیشہ نہیں۔

شاعروں میں البتہ اصلاح کی سخت ضرورت ہو۔ اول تو یہی طرح کے مصرعوں کا قائل نہیں۔ بتدی کے لیے یہ اچھی چیز ہوں۔ جس کو اساتذہ کے کلام سے قافیہ ردیفوں کے علاوہ مضمون بھی تقلید کے لیے مل جاتے ہیں۔ طرح کے مصرع کی مثال کٹھنوں کی سمجھنی چاہیے جن سے بچوں کو کھنا سکھایا جاتا ہو۔ لیکن مشاقِ طبیعتوں کو ایسی تیود کا پابند کرنا گویا ان کو بجائے جدت کے نقالی سکھانا ہو۔ شاعری تخلیقی ہو نہ دریوزہ گری۔ اس طرح کے مصرع کی ابتدا شاید ایرانی بادشاہوں کے دربار سے ہوئی ہو۔ جو استادانِ فن کے کمال کو ایک ہی کسوٹی سے پرکھنا چاہتے ہوں۔ عام شاعروں کے لیے میری ناقص رائے میں طرح کا مصرع مانعِ ترقی ہو۔ ہر شاعر کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنا تازہ کلام منائے۔ "تازہ" کی شرط میں نے اس لیے عام کی ہو کہ بعض صاحبِ اپنا وقائیسی کلام لے آتے ہیں۔ اور نئے کے لیے جہدِ وجد نہیں فرماتے۔ متواتر بدو جہد اور کادش ہی سے ترقی کی امید ہو سکتی ہو۔ دوسری اصلاح شاعروں میں داد دینے کے طریقوں پر ہونی چاہیے۔

بعض استادانِ فن مشاعرے میں اپنے شاگردوں کی ایک فوج لے کر آ جاتے ہیں۔ اور ابھی استاد کے منہ سے آدھا مصرع بھی نہیں نکلتا یہ محفل کو سُحان اللہ اور مرجا کے نعروں سے

گوجا دیتے ہیں اور پھر کمال یہ کہ جب کوئی دوسرا شاعر اپنا کلام پڑھتا ہو۔ تو خواہ اس میں کیسی ہی غزلی اور لطافت ہو یہ ایسے چپکے بیٹھے رہتے ہیں گویا انھیں سانپ سوگھ گیا ہو۔ اس بے ہودگی کی وجہ سے اساتذہ میں اکثر چٹمک ہو جاتی ہو اور ابتذال پر آ کر آتے ہیں۔ میں چالیس پینتالیس برس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس وقت دہلی کی شریف بیگمات مشاعروں کو انھی غزلیات کی وجہ سے منحوس سمجھنے لگی تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے گھر کا حال بیان کرتا ہوں۔ سنہ ایک یا دو میں ترابا بیرم خاں کے رہنے والے چنہ عزیزوں اور دوستوں نے میرا فرحت اللہ بیگ کے مکان پر مشاعرے کا انتظام کیا۔ چونکہ ہم کو بات کے وقت باہر جانے کی ممانعت تھی اس لیے میں نے اپنی والدہ سے چپکے سے پوچھا کہ فرحت اللہ بیگ کے مکان پر مشاعرہ ہو رہا ہو کیا میں بھی جاؤں۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”اے ہے بہن حسن جہاں بیگم کو کیا ہو گیا کہ انھوں نے اپنے مکان پر مشاعرے کی اجازت دے دی۔“ میں نے کہا آخر ہرج کیا ہو فرمانے لگیں۔ ”منحوس ہوتا ہو۔ دیکھو لال قلعے میں ہوتا تھا۔ اس کا کیا شہر ہوا۔ فلاںے نواب کے ہاں ہوتا تھا۔ اس کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔“ اُس وقت تو منحس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہو کہ انھی بے آئینیوں کی وجہ سے عناد اور رنجش کے بیج ایسی مجلسوں میں بو دیے جاتے تھے۔ جن کے نتائج سے وہ بدنام ہو گئیں اور منحوس سمجھی جانے لگیں تذکرۃ جو حسن جہاں بیگ صاحبہ کا نام آگیا ہو تو میں زرا واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ ندون فرحت اللہ بیگ صاحبہ کی چھٹی تھیں اور بڑی نیک صفات کی بیوی تھیں۔ فرحت اللہ بیگ صاحبہ کی والدہ کا چونکہ ان کی شیرخواری کے زمانے ہی میں انتقال ہو گیا تھا اس لیے حسن جہاں بیگ صاحبہ نے ان کو نہایت محبت اور اُلفت سے پالا اور جتنی خوبیاں میرا عارب کے کردار میں نظر آتی ہیں یہ سب انھی نیک بیوی کے اخلاق کا پرتو ہیں۔ ضمناً ایک بات اور منادوں کہ فرحت اللہ بیگ صاحبہ نے بھی اس مشاعرے میں غزل پڑھی تھی جس کا ایک مصرع مجھے یاد رہ گیا۔

ہم نے یہ پھبتی کسی لنگور پیراہن میں ہو



شعر کا پہلا مصرع آپ ان سے خود پوچھ سکتے ہیں اس میں رقیبِ رُسیاہ کا ذکر تھا۔ ان کی عمر ۱۸ وقت مولد یا سترہ سال کی ہوگی لیکن اس مصرع سے آپ ان کے منہ میں کے ماحیہ رنگ کا صیغہ بتا چکے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں نے لیے ہیں صائب کے موزون شعر پر عمل کرنا چاہیے۔

صائب : دینے می شکستہ قدر شہ را

آمین . شناس و سکوت سخن شناس

صحیح قدر دانی سے شہ کی ہمت افزائی ہونی ہو اور اچھے کلام پر سامعین کا سکوت اس کے دل کو نوڑ دیتا ہے۔ اگلا کلام میں ہی نقصان باغزش ہو تو مناسب طریقے سے اس کو بھی دینا چاہیے لیکن بھری مجلس میں مشکل اڑانا زیب نہیں۔ بیساکہ اکثر شاعروں میں ہوتا ہے کلمہ از کلمہ اس مجلس کے اراکین سے تو مجھے توقع ہو کہ وہ سخن میں نصفتِ اسلامی اور صحیح ذوقِ کلام میں لائیں گے اور عام شاعروں کے اس بڑے رواج کو ترک کر دیں گے۔

نئے اسلوب کی نظم نے پچھلے پچاس ساٹھ برس میں نوبِ نثر کی اور اقبال کی نثر نے تو اس کو مزاج پر پہنچایا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مغربی تعمیر کا عام رواج، ایک بیرونی قوم کے راج کی وجہ سے ملک میں حبِ وطنی، قومی ذہنیت کا پیدا ہو جانا، سیاسی اور اقتصادی کشمکش، اور اس صدی کی تین عالمگیر لڑائیاں۔ حالات کا تسلسلے دل و دماغ پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور ملکی اور قومی انگلیں اور جذبے پستوں کی طرح ابل پڑنے ہیں۔ ان پستوں کے پانی کی روانی بے شک دل آویز ہوتی ہے لیکن جب تک ان کا منبعِ عزم کی گہری ستر سے نہ ہو وہ پانی قلوٹی دہرہ کر خشک ہوتا ہے۔ اور اس کی سیرابی مام گیر نہیں ہوتی۔ میں تنوع کی بصیرت کو بڑھانے کے لیے مہم کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں اور ان الشعراء تلامذہ الرحمن پر صرف اتنا عقیدہ ہو کہ ایسا شاعر جو اکتسابی طریق سے مستثنی ہو سکیں میں یہ ہوتا ہے شکستہ اور ٹیکہ خاں خاص ناموں میں یہاں ہوجاتے ہیں لیکن ڈائری، مجلس اور اقبال کی اکتسابی علوم سے بہرہ نہ لے کر ان کو بہت اور بقا سے

عوام حاصل نہ ہوتی جو اب حاصل ہے۔ علم سے شاہدہ اور تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور کسی قوم یا ملک کی شاعری کو بحیثیت نکل جب ہم چاہتے ہیں تو اسی قوم یا ملک کا ادب ہمیں پیش پیش نظر آتا ہے جو دولتِ علم سے زیادہ سرشار ہے۔

خدا کے فضل سے اس وقت ہندستان کے ہر حصے میں نئی طرز کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ پنجاب میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، تاثیر۔ دہلی میں فیض۔ صوبہ جات متحدہ میں جوش، ساعر اور خود حیدر آباد میں بہت سی نمایاں ہستیاں ہیں۔ جن کا کلام میں نے ریڈیو پر یا رسالوں میں یا ان کے مطبوعہ نظم کے مجموعوں میں پڑھا ہے اور جس کی تازگی، ترقم اور جوش نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ ان شعرا میں سے بعض خاصے کہنے مشق ہیں مثلاً علی اختر صاحب اور جناب فضل الرحمان صاحب اور نوجوانوں میں عکرمش، مخدوم، وجد اور باقی، فضل الرحمان صاحب نے تو پچھلے جیسے میں اپنی عالمانہ نظم ”ابتدائے آفرینش“ متا کر ہم سب کو بے حد محظوظ فرمایا تھا۔ اور بعض کے کلام سے ہم شاید آج مستفید ہوں۔ حیدر آباد کی بیسیوں میں بھی شعر و سخن کا ذوق ہے اور ہماری عزیز بہن لطیف النساء بیگم نے بچوں کی نفسیات پر غور فرمانے کے بعد چند سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ایسے بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے بے حد مفید ہیں جو ’لوریوں‘ کی منزل سے گزر چکے ہیں۔

نئے زمانے کی شاعری کے ضمن میں ایک اور بات میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ذوقی مسئلہ ہے اصولی نہیں۔ شاعری کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ موسیقی کی دو قسمیں ہیں ایک فقط لگے کی، چاہے آپ اسے لحن کہیں خوش الحانی اسی سے بکلا ہے۔ اور دوسری ساز کے ذریعے سے۔ اردو شاعری میں غزل اور گیت کے ساتھ تو ساز لازمی ہے۔ کیوں کہ ساز سے ان کا اثر دو بالا ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے وہ بالکل پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مذہبی نظموں کے ساتھ ساز ذرا بے چوڑ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں ’ثنوی مولانا روم‘ کو پیش کرتا ہوں جس کو بعض منہی بغیر ساز کے ایسے موثر طور سے پڑھتے ہیں کہ دل ہل جاتا ہے۔ خود ہمارے محلے میں ایک صاحب حاجی قدرت اللہ نامی رہتے تھے۔ بڑی مقدس صورت تھی۔ لمبی خانی ڈاڑھی، بیس کتری ہوی، روشن بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، گورا۔

جو موجودہ صدی میں ترک ہو گیا ہو۔ آزاد انگریزی سے تھوڑے بہت ضرور واقف ہو گئے تھے۔ ان کی 'نیزنگ خلیل' سے صاف عیاں ہو کہ بنین کی کتاب 'پلگرس پروگریس' (Bunyan's Pilgrims Progress) ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ علم تنقید کے ایک اور امام سرسید کے رفقا میں مولانا خلی تھے۔ ان کی سہستہ اور مدلل تحریر نے اُردو ادب میں تاریخ کے لیے میدان صاف کر دیا اور سیرت پر جو قابل قدر کتابیں ان کے لائق تلامذہ نے اعظم گڑھ سے شائع کی ہیں وہ سب خلی ہی کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ حالی نے بھی سرسید کے حالات زندگی، حیات جاوید، میں لکھ کر اُردو نثر میں سوانح عمری لکھنے کا طریقہ بتایا۔ ادب کا ایک اہم شعبہ یعنی افسانہ انیسویں صدی میں پیدا تو ہو گیا۔ لیکن جن انگریزی ناولوں کے ترجموں پر اس کی بنیاد پڑی وہ نہایت اذنا درجے کی تھی۔ علاوہ ازیں خود اُردو زبان میں جو قصے مانج تھے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے دور انکار ہونے کے سوا فحش اور مبتذل بھی تھے۔ ہندستان کے رسم و رواج میں چوں کہ جوڑے کے خود پسند کرنے کا رواج اب تک مفقود ہو اس لیے ہیرد اور ہیرداین کے عشق کی ابتدا اور اس کا نتیجہ مصنوعی ہی سا رہا۔ انیسویں صدی میں علوم و فنون پر بھی کتابیں تالیف ہوئیں جو مدرسے کے طالب علموں کے لیے تو بے شک مفید ثابت ہوئیں لیکن ان کی کوئی اہم ادبی حیثیت نہیں۔ پچھلی صدی کے مترجمین میں سید علی بلگرامی مرحوم کا اہم گرامی ضرور قابل ذکر ہو۔ انھوں نے مشہور فرانسیسی مصنف کی بان کی کتاب کا ترجمہ 'تمدن عرب' کے نام سے کر کے اُردو داں طبقے کو اسلامی فنون اور علوم سے مغربی زاویہ نگاہ کے مطابق روشناس کرایا۔ ان کے ترجمے میں ایک خاص علمی شان ہو۔

بیسویں صدی میں اُردو ادب نے جو وسعت اور وقعت حاصل کی وہ حیرت انگیز ہو۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ ملک میں تعلیم کی ترقی، اس بات کا احساس کہ مادری زبان کے سوا غیر زبان میں مہارت حاصل کرنی نہایت دُشوار ہو، قومیت کے جذبے کا نمو، اور سیاسی جدوجہد۔ انجمن ترقی اُردو نے مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں نہایت قابل قدر کام کیا۔ لیکن اس زمانے کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہو جو اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی فرماں روا سے دکن کی علمی

سرپرستی کی بدولت عمل میں آیا۔ اور جس نے اُردو زبان کو دنیا کی اور بھی زبانوں کے ہم پلہ بنادیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جاتا ایک بڑی ہم تمی لیکن اس کے سر ہوتے ہی اُردو کا غلبہ تمام ملک پر چھا گیا۔ اور بعض کوتاہ نظر جماعتیں اس حقیقی ملکی اور قومی زبان کے کتنے ہی مخالف ہوں لیکن ان کی کوشش اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ میں اس زمانے کی ادبی ترقی پر تبصرہ کرنے میں بعض علما اور ماہرین کا ذکر کروں گا لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میرا تبصرہ مکمل ہو اور جو نام مجھ سے چھٹ گئے ہیں وہ میں نے دانت چھوڑ دیے ہیں۔ بلکہ یہ ایک سرسری تنقید ہے اقل نہیں صحافت سے شروع کروں گا جو ملک میں ہر قسم کی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ زبان میں ادبی صلاحیت پیدا کرنے کا بھی اچھا ذریعہ ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوشش خاص طور سے قابلِ ستائش ہے پنجاب میں ’پیشہ اخبار‘ اور ’دکیل‘ نے صحافت کا خاصا بے وقار قائم کر دیا تھا۔ لیکن محمد علی اور آزاد کی کوشش سے اُردو اخبار انگریزی اخباروں کی ٹکر کے ہو گئے۔ آزاد چونکہ عربی کے فاضل ہیں اور مصری صحافت کا ان پر گہرا اثر تھا۔ اس لیے ’البلاغ‘ کی زبان کا اثر تمام ہندستان کی زبانوں پر پڑا اور ایک طرح سے اس اثر نے اُردو اور ہندی زبان کی خلیج کو اور وسیع کر دیا۔ لیکن محمد علی نے صحافت کے لیے ایک سلیس زبان کا نمونہ پیش کیا جس میں ان کے عالمانہ تحریر کی وجہ سے ’زور‘ اور ان کی خداداد شوخی کی وجہ سے ’لطافت‘ پیدا ہو گئی۔ محمد علی کی تحریر کا نمونہ آپ آج کل کی صحافت میں قاضی عبدالغفار صاحب کے مضامین میں دیکھتے ہیں جو اس میدان میں مولانا مرحوم کے بہترین جانشین ہیں۔ تنقیدی ادب کی بنیاد جو حالی اور شبلی نے ڈالی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے عالمانہ مقدموں سے اس کو اور استوار کیا اور پروفیسر محمد الدین قادری زور ، ڈاکٹر عابد حسین عابد ، میرزا محمد سعید اور محمد مجیب نے مغربی اصولوں سے مزید استفادہ کر کے اپنے لائق پیش روؤں کی بنیاد پر ایک مستحکم عمارت قائم کر دی۔ چنانچہ حال میں جو کتابیں اُردو ادب پر تالیف ہو رہی ہیں ان میں تنقید کا معیار مغربی زبانوں کے معیار سے کم نہیں ہے سید اعجاز حسین صاحب کی کتاب ’نئے ادبی رجحانات‘ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تالیف

’ادب اور انقلاب‘، پروفیسر یوسف حسین خاں کی تصنیف ’رُوحِ اقبال‘، جس میں شاعر کے کلام پر بہ حیثیت مفکر اور صنعت گر بحث کی گئی ہو اور ڈاکٹر رضی الدین کا اسی شاعر کے فلسفے کا گہرا مطالعہ موجودہ اُردو ادب کے تنقیدی معیار کی چند روشن مثالیں ہیں۔

ہندستان کی آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے اس ملک کے رہنے والوں کی طبیعتوں میں محبت کے جوش کی کمی نہیں۔ اس لیے موجودہ اُردو ادب میں افسانوں کی بھرمار ہو۔ بیسویں صدی کے آخری دور کی تنقید میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ پردے کا رواج اب تک ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مغربی ممالک کے رہنے والوں کی طرح اپنے جوتے آپ تلاش کریں۔ تعلیم کی ترقی سے پردہ رفتہ رفتہ اٹھ رہا ہو اور ایک دن وہ اٹھ کر رہے گا۔ لیکن اس رواج کو مٹانے سے پہلے ہم کو پردے کے قیام کی وجہ پر غور کر لینا چاہیے۔ کردار کی پختگی اور متانت اس دم کو مٹا سکیں گے۔ لیکن عریانیت کا جذبہ خرابیاں پیدا کرے گا اور پردہ زیادہ عرصے تک قائم رہے گا۔ افسانہ نگاری میں بھی کیفیاتِ زندگی کے بیان کرنے میں عفت اور وقار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دہ مجھے ڈر ہے کہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ادب لطیف کے بے باک نمونوں کی تقلید میں ہمارے اور افسانہ نگار بھی تعزیراتِ ہند کی زد میں نہ آجائیں۔ ملک کے رسم و رواج کے مخالف ہونے کے باوجود کچھ پریم چند سرگ باشی نے افسانہ نویسی کے معیار کو نہایت خوش اسلوبی سے بلند کیا۔ غریبوں کی زندگی کے حالات اور سماجی خرابیوں کو انھوں نے بہت ہم دردی سے بیان کیا ہو اور جو انسانی خدمت انھوں نے اپنے افسانوں سے انجام دی ہو۔ وہ بڑے بڑے واعظین اور مصلحان قوم سے بھی پوری ہونی مشکل ہو۔ زبان اور فن کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کے بعد موجودہ زمانے کے افسانہ نویسوں میں ایم۔ اسلم، سیدرش، نیاز فتح پوری، اور اشتیاق حسین قریشی کے نام شمالی ہند میں اور مولوی فضل الرحمن اور قاضی عبدالغفار صاحب کے اسماعیلی گرامی حیدرآباد میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو پر بھی افسانوں کے نمونے پیش ہوتے رہتے ہیں اور سینماؤں میں بھی ہم رات دن دیکھتے ہیں۔ یہ سب معاشرتی خرابیوں کے رفع کرنے کے

لیے اچھے ہیں۔ سینما کے افسانوں کی بنیاد اکثر مذہبی قصص یا قدیمی روایات پر ہوتی ہے۔ جس کا اخلاقی اثر تو بے شک مفید ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے جو اصلی زندگی کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ اردو مغربی اور مشرقی افسانے میں صرف فرق یہی ہے کہ ایک ہر طرح سے زندگی کی اصلی کیفیات کا آئینہ ہوتا ہو اور دوسرے میں بڑا حصہ محض خیالی۔

یہ عربی مقولہ ”الملزاح فی الکلام کالملح فی الطعام“ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ادب لطیف کے لیے بھی ظرافت لازمی ہے۔ قدیم اردو ادب میں یہ عنصر آپ عمر عیار کی حکایات اور مختلف چٹکوں اور لطیفوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے کی تالیفات میں یہ رنگ آپ کو رتن ناتھ سرشار کے ’خوجی‘ کی کردار میں اور ’ادھ پنچ‘ کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانے کی مزاحیہ نثر میں سید امتیاز علی تاج کے ’چچا چھکن‘، خوجی ہی کے نئے خیال والے صاحب زادے ہیں۔ لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کا مرتبہ اس فن میں استاد کا سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے مزاح کو اپنے معاشرتی مضامین کے تانے بانے میں اس کمال سے بٹن دیا ہے کہ لطافت کا ہر پھول اپنی جگہ پر موزوں نظر آتا ہے۔ اور مصنوعیت کا شائبہ نہیں رہتا۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین میں بھی نفیس ذوق اور اعلا تفکر پایا جاتا ہے۔ لیکن میرزا صاحب کی زبان کی شادابی، روانی اور چاشنی پطرس کی زبان میں کہاں۔ ظرافت کے لیے ذہانت کے علاوہ نہایت لطیف ذوق کی ضرورت ہے۔ جو ہر کس و ناکس میں ہونا مشکل ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر نام نہاد مزاحیہ نگاروں کی تالیفات محض بکواس ہیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ اور پطرس کے بعد اس رنگ میں نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی اور امتیاز علی تلج کے نام ذکر کرنے کے قابل ہیں۔ حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کی فہرست اگر مرتب کی جائے تو اس میں میرزا عصمت اللہ بیگ کا نام ممتاز نظر آئے گا۔ یہ سرکاری رسالہ ’حبیت‘ کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا مشاہدہ اچھا ہے۔ لیکن خیالات کے اظہار میں لطافت اور پاکیزگی کا زیادہ خیال کرنے کی بجائے یہ اپنے قدر دانوں کو محاورے اور زبان کے چٹخارے سے ہنساتے ہیں۔

ادب لطیف کے لیے عورتوں کی بول چال، اور اسی میں ان کے خیالات کا اظہار، خاص

’ادب اور انقلاب‘ پروفیسر یوسف حسین خاں کی تصنیف ’روح اقبال‘ جس میں شاعر کے کلام پر بحیثیت مفکر اور صنعت گر بحث کی گئی ہو اور ڈاکٹر رضی الدین کا اسی شاعر کے فلسفے کا گہرا مطالعہ موجودہ اردو ادب کے تنقیدی معیار کی چند روشن مثالیں ہیں۔

ہندستان کی آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے اس ملک کے رہنے والوں کی طبیعتوں میں محبت کے جوش کی کمی نہیں۔ اس لیے موجودہ اردو ادب میں افسانوں کی بھرمار ہو۔ بیسویں صدی کے آخری دور کی تنقید میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ پردے کا رواج اب تک ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مغربی ممالک کے رہنے والوں کی طرح اپنے جوتے آپ تلاش کریں۔ تعلیم کی ترقی سے پردہ رفتہ رفتہ اٹھ رہا ہو اور ایک دن وہ اٹھ کر رہے گا۔ لیکن اس رواج کو مٹانے سے پہلے ہم کو پردے کے قیام کی وجہ پر غور کر لینا چاہیے۔ کردار کی پختگی اور متانت اس رسم کو مٹا سکیں گے۔ لیکن عریانیت کا جذبہ خرابیاں پیدا کرے گا اور پردہ زیادہ عرصے تک قائم رہے گا۔ افسانہ نگاری میں بھی کیفیات زندگی کے بیان کرنے میں عفت اور وقار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ورنہ مجھے ڈر ہو کہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ادب لطیف کے بے باک نمونوں کی تقلید میں ہمارے اور افسانہ نگار بھی تعزیرات ہند کی زد میں نہ آجائیں۔ ملک کے رسم و رواج کے خلاف ہونے کے باوجود کھنٹی پریم چند سرگ باشی نے افسانہ نویسی کے معیار کو نہایت خوش اسلوبی سے بلند کیا۔ غریبوں کی زندگی کے حالات اور سماجی خرابیوں کو انھوں نے بہت ہم دردی سے بیان کیا ہو اور جو انسانی خدمت انھوں نے اپنے افسانوں سے انجام دی ہو۔ وہ بڑے بڑے واعظین اور مصلحان قوم سے بھی پوری ہونی مشکل ہو۔ زبان اور فن کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے اعلا مرتبہ رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کے بعد موجودہ زمانے کے افسانہ نویسوں میں ایم۔ اسلم، سدرشن، نیاز فتح پوری، اور اشتیاق حسین قریشی کے نام شمالی ہند میں اور مولوی فضل الرحمان اور قاضی عبدالغفار صاحب کے اسامے گرامی حیدرآباد میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو پر بھی افسانوں کے نمونے پیش ہوتے رہتے ہیں اور سینماؤں میں بھی ہم رات دن دیکھتے ہیں۔ یہ سب معاشرتی خرابیوں کے رفع کرنے کے

لے اچھے ہیں۔ سینما کے افسانوں کی بنیاد اکثر مذہبی قصص یا قوی روایات پر ہوتی ہے۔ جس کا اخلاقی اثر تو بے شک مفید ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے جو اصلی زندگی کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ اردو مغربی اور مشرقی افسانے میں صرف فرق یہی ہے کہ ایک ہر طرح سے زندگی کی اصلی کیفیات کا آئینہ ہوتا ہے اور دوسرے میں بڑا حصہ محض خیالی۔

یہ عربی مقولہ ”المرآة فی الکلام کا لیلیم فی الطعام“ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ادب لطیف کے لیے بھی طرافت لازمی ہے۔ قدیم اردو ادب میں یہ عنصر آپ عمر عیار کی حکایات اور مختلف چٹکوں اور لطیفوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے کی تالیفات میں یہ رنگ آپ کو رتن ناتھ سرشار کے ”خوجی“ کی کردار میں اور ”دودھ پنچ“ کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانے کی مزاحیہ نثر میں سید امتیاز علی تاج کے ”چچا چھکن“، خوجی ہی کے نئے خیال والے صاحب زادے ہیں۔ لیکن میرزا فرحت اللہ بیگ کا مرتبہ اس فن میں استاد کا سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے مزاح کو اپنے معاشرتی مضامین کے تانے بانے میں اس کمال سے بٹن دیا ہے کہ لطافت کا ہر پھول اپنی جگہ پر موزوں نظر آتا ہے۔ اور مصنوعیت کا شائبہ نہیں رہتا۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین میں بھی نفیس ذوق اور اعلیٰ تفکر پایا جاتا ہے۔ لیکن میرزا صاحب کی زبان کی شادابی، روانی اور چاشنی پطرس کی زبان میں کہاں۔ طرافت کے لیے ذہانت کے علاوہ نہایت لطیف ذوق کی ضرورت ہے۔ جو ہر کس دناکس میں ہونا مشکل ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر نام نہاد مزاحیہ نگاروں کی تالیفات محض کبواس ہیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ اور پطرس کے بعد اس رنگ میں نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی اور امتیاز علی تاج کے نام ذکر کرنے کے قابل ہیں۔ حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کی فہرست اگر مرتب کی جائے تو اس میں میرزا عصمت اللہ بیگ کا نام ممتاز نظر آئے گا۔ یہ سرکاری رسالہ ”حبیت“ کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا مشاہدہ اچھا ہے۔ لیکن خیالات کے اظہار میں لطافت اور پاکیزگی کا زیادہ خیال کرنے کی بجائے یہ اپنے قدر دانوں کو محاورے اور زبان کے چٹخارے سے ہنساتے ہیں۔

ادب لطیف کے لیے عورتوں کی بول چال، اور اسی میں ان کے خیالات کا اظہار، خاص



اہمیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں مولوی سید احمد مواتف ’فرہنگِ آصفیہ‘ نے چند اچھی کتابیں شریف بیگمات کی زبان میں لکھی تھیں موجودہ صدی میں میرے عزیز دوست آغا حیدر حسن نے اُردو نثر کے اس موضوع پر خوب دل کھول کر طبع آزمائی کی ہے۔ اور چون کہ وہ دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہاں کی بیگمات کی زبان میں معاشرت اور خانہ داری کی نہایت سچی اور پُر لطف تصویریں کھینچی ہیں۔ آغا صاحب ہر فن لطیف کے دلدادہ ہیں ایسی دہ سے ان کی تحریر کے بعض مرقعے بے شک لاجواب ہیں۔ ہمارے گھرانے کی ایک باندی فیضونامی تھی۔ میاں نظام الدین اسے غدر کے بعد حیدرآباد سے لے گئے تھے۔ نسل سے وہ بہن تھی لیکن اس کو اپنے سُن پر بڑا ناز تھا۔ آغا صاحب نے اس کا حال اس خوبی سے لکھا ہے کہ میں سُن کر پھر دک گیا۔ شاید وہ آغا صاحب کی کسی کتاب میں چھپ بھی گیا ہے۔ حاضریں میں سے جو چاہے اس مضمون کو پڑھ کر لطف اٹھا سکتا ہے۔

اس صدی میں اُردو زبان کی علمی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے بعض قابلِ قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحق کی ’قواعد اُردو‘ اور ’مُنہی کے زیرِ نگرانی‘، اکسفورڈ کون ساؤنڈکسٹری‘ کا ترجمہ، مولانا وحید الدین سلیم کی کتاب ’وضع اصطلاحاتِ علمیہ‘ اور ڈاکٹر محی الدین قادری کی ’تالیف‘، لسانیات اور سوتیات‘۔ میں نے صرف چند نام گنائے ہیں لیکن اسی قبیل کی اور کتابیں بھی مرتب ہوئی ہیں۔ جن سے اُردو زبان کو علمی مرتبہ حاصل ہو جانے کے علاوہ اس کے لغت میں بھی بے حد وسعت ہوگئی۔

اُردو ادب کو ترقی دینے اور زبان کو مانجھنے میں ماہانہ اور سہ ماہی رسالے بھی نہایت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ابتدائی رسالوں میں ’محزن‘، اور ’زمانہ‘، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ’محزن‘ کو سر عبدالقادر نے جاری کیا تھا۔ جن کو اب تک اُردو زبان اور ادب سے بے حد شغف ہے۔ اور وہ ملازمت کی مصروفیت کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنی محبوب ’ملکی زبان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ’زمانہ‘ فشی دینارین کلم کے زیرِ ادارت نکلا اور مرتے دم تک

نشئی صاحب اس کے ایڈیٹر رہے۔ آج کل بے شمار رسالے بھل رہے ہیں۔ بعض ان میں نہایت اچھے ہیں بعض اوسط درجے کے بعض ناکارہ۔ ان کے مقاصد کی نوعیت اور علمی اور ادبی معیار پر تفصیل سے بحث کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہماری مجلس کا کوئی اور رکن اس موضوع پر اپنی عالمانہ رائے سے ہم کو آئندہ کسی اجلاس میں مستفید فرمائے۔ اتنا البتہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب کی موجودہ ترقی کے یہ نظر ہم کو ایک ایسے رسالے کی شدید ضرورت ہے جو سٹیٹ کے مشہور انگریزی رسالے ریویو آف ریویوز (Review of Reviews) کے مثل ہو اور جس میں ملک کے تمام رسالوں کے اہم مضامین پر ایک جامع تبصرہ شائع ہوا کرے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اُردو ادب کے شائقین ملک کے تمام ادیبوں کے کارناموں سے آشنا رہیں گے۔ اور دوسرے خود ان ادیبوں کو اپنے مضامین کے حسن و قبح پر صحیح تنقید حاصل ہو جائے گی۔ حیدرآباد میں اس وقت بہت سے ادبی اور علمی ادارے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اُردو زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے نہایت گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ریویو آف ریویوز (Review of Reviews) کے مثل اُردو کا تنقیدی رسالہ اگر حیدرآباد کے کسی ادارے کی زیر نگرانی شائع ہو تو مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ کام نہایت اہم ہے اور اس کے لیے نہایت لطیف ادبی ذوق اور علمی تبحر کی ضرورت ہے۔ ایسے رسالے کے شائع کرنے سے شاید آئندہ اُردو اکادمی کی بنیاد کے لیے زمین صاف ہو جائے جو مشہور فرانسیسی اکادمی کی طرح اُردو ادب اور زبان کے معیار کو ایک اعلا پیمانے پر پہنچا سکے۔

گزشتہ چالیس برس میں ترجموں سے بھی اُردو ادب اور زبان کو قوت اور بالیدگی حاصل ہوئی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کا کارنامہ ہی کچھ کم شان دار نہیں۔ لیکن شمالی ہند کے بعض اداہوں اور علما نے بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان ترجموں کی نوعیت دو قسم کی ہے۔ ایک قسم نے اُردو زبان میں علوم و فنون کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن ان کی کوئی ادبی شان نہیں اور غیر مانوس الفاظ اور بے سلیقہ عبارتیں صاحب ذوق کے کانوں پر کھٹکتے ہیں۔ دوسری قسم کے ترجمے ان ادیبوں کے ہیں

جنہوں نے اپنے ذوقِ سلیم اور طبّاعی سے اُردو میں اجنبی زبان کے مضامین کو بہ اصطلاح مولوی سلیم الدین مرحوم اپنار لیا ہو۔ ان مترجمین میں مولوی عنایت اللہ مرحوم کا نام سب میں زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ مرحوم کے والدِ بزرگوار مولوی ذکار اللہ صاحب نے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں زبان کی شستگی کا ایک خاص معیار قائم کر دیا تھا۔ سیدت بیٹے نے اس معیار کو کہیں اور زیادہ بلند کر دیا۔ ان کے ترجموں میں وہ سادہ سادہ اور روانی ہو کہ یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ اصل کتاب ہو یا ترجمہ۔ مولوی عنایت اللہ کے بعد میں اس میدان میں ڈاکٹر عبدالحمید کو سمجھتا ہوں۔ ان کے ترجمے میں بھی ادبی شان نظر آتی ہو۔ ڈاکٹر صاحب اصل کتاب کے مضمون کا مفہوم ایسی صفائی اور موزوں الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ ترجمہ ایک اصل تحریر معلوم ہونے لگتا ہو۔ ترجمہ ایک مشکل کام ہو اور خصوصاً علمی اور فنی کتابوں کا۔ بعض معترضین نے دارالترجمہ کی تالیفات پر عربیت کا الزام لگایا ہو۔ میں اصطلاح کی حد تک عربیت، سنسکرت یا انگریزیت کا قائل نہیں۔ اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا ہونا چاہیے نہ اگر اصطلاح بین الاقوامی ہو یعنی ہر ملک کی زبان میں ایک ہی استعمال ہوتی ہو تو اس کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر بین الاقوامی نہیں اور مختلف ممالک کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہو تو اُردو میں بھی اس کا ترجمہ کر دینا چاہیے۔ اب واضحین اصطلاح کا فرض ہو کہ دیکھیں اس کا مفہوم کن مادوں اور محققات سے اُردو زبان میں زیادہ عام فہم ہو سکتا ہو۔ اس قسم کے اصول، دارالترجمہ کے واضعانِ اصطلاح کے زیرِ نظر رہے ہیں۔ افراطِ تفریط ضرور ہوئی ہو جس کو ماہرینِ کیندہ حدست کر دیں گے۔ آج کل بڑی مصیبت یہ ہو گئی ہو کہ سیاسی جدوجہد نے ملک کی ایسی زبان کو جس نے یہیں جنم لیا اور یہیں پرورش پائی صرف پسند غیر مانوس الفاظ کی خاطر جو بد مذاق طبیعتوں کے جذبے سے داخل ہو گئے ہیں ایک اجنبی زبان سمجھ لیا ہو۔ اور اُردو اور ہندی کو علاحدہ علاحدہ دو زبانیں سمجھنے لگے ہیں حالانکہ دونوں کی ساخت ایک ہی ہو۔ لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ زبانیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح ان میں ترقی ہوتی ہو۔ سنسکرت کو مرحوم ہوئے ایک ہزار برس ہو گئے جن لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ہندی کے ڈھانچے میں یہ دوبارہ زندہ ہو جائے گی محض خیال ہی خیال ہو۔ نہ عربی و فارسی الفاظ کی بھرمار سے اُردو

پروان چڑھ سکتی ہے۔ ہر زبان کی ترقی کے لیے علوم و فنون کا فیضان لازمی ہے جن کا ذخیرہ دو ہزار برس کی قدیم زبانوں میں بالکل محدود ہے۔ اس کے علاوہ زبان کو رونق اور شادابی فروت لفظوں کی ٹھوس ٹھاس سے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ نئی قلمیں لگانے کے لیے ذوقِ لطیف کا مالی تازہ خردوار درختوں اور پھلنے ہوئے پھولوں کے پودوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں اردو ہندی کے جھگڑے کو ایک عارضی بیماری سمجھتا ہوں جو سیاسی آب و ہوا صاف ہونے پر خود بخود نائل ہو جائے گی۔ ہمارے ہندو بھائیوں کی آبادی زائد ہونے کی وجہ سے اگر الفاظ کا ایک غیر مانوس ذخیرہ ملکی زبان میں داخل بھی ہو گیا تو مضائقہ نہیں کیوں کہ ادب لطیف میں صرف وہ اسی وقت شامل ہو سکتا ہے جب صوت اور ساخت اور معنی کے لحاظ سے وہ گھل مل جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اردو کے حامیوں کو ہراساں نہ ہونا چاہیے یہ زبان اب بڑے تناور درخت بن چکی ہے جس کی جڑیں اور شاخیں برابر پھیلتی چلی جاتی ہیں اور سیاسی آندھیوں سے اس کے اکھڑ جانے کا ڈر نہیں۔

میں نے اپنے بُرے بھلے خیالات بیان کر دیے لیکن آپ میری جرأت اور بے باکی پر خیر نہیں دل میں کیا کہہ رہے ہوں گے کہ ساری عمر تو اس نے مٹی اور اینٹ کے گھر مندوں اور رنگوں اور پتھروں کی پتلیوں کی پوجا میں گزارے اور اب اردو ادب اور زبان پر گفتگو کر رہا ہے۔ خیر معاف فرمائیے۔  
مُرخصت ہوتا ہوں۔ آداب عرض۔

— (۲۰۲۰ء) —

**فنِ صحافت** | اردو زبان میں فنِ صحافت کے اصول و ضوابط اور اخبار کی تیاری کے مختلف مراحل کے متعلق کوئی کتاب موجود نہ تھی اور اردو صحافت کا شوق رکھنے والے نوجوانوں کو انگریزی کا دست نگر ہونا پڑتا تھا اس ضرورت کو محسوس کر کے اور نیز اس خیال سے کہ فنِ صحافت کی باضابطہ تربیت کی طرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو توجہ ہو چلی ہے۔ جناب چودھری جسم علی الہاشمی صاحب بی۔ اے نے انھیں اخبار نویسی کا پچیس سالہ تجربہ ہو اس فن پر پہلی کتاب تیار کی ہے جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۵۰ روپے مجلد ۶۰ روپے

## ترقی پسند ادب (۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

[جناب عزیز احمد صاحب استاد ادبیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)]

(\*)

حسرت موہانی کی عشقیہ شاعری کا نفسِ مضمون پڑانا اور مدایاتی ہو اگرچہ اس میں غضب کی انفرادیت اور تازگی ہو، اور یقینی طور پر ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہو کہ شاعر کی ربم شاعری کچھ ہی ہو وہ اپنے دل کی بات کہہ رہا ہو۔ حسرت موہانی نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں جو کچھ قربانیاں کی ہیں ان کا اثر، وہ ایک طرح کا خلاص اور جوشِ کردار ان کی سیاسی شاعری کی جان ہو ہے

او کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہو تجھ کو آرزو	ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے ہوا اہم نہ جان	روشنیِ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بے غدرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز	اُس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبولِ زمیندار	فنِ دہن کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہو گناہ	کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر، اعتماد کر

ہو مشتِ سخن جاری پکتی کی مشقت بھی اک طرہ تماشا ہو حسرت کی طبیعت بھی  
جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

باطن میں ہیں آزاد، بظاہر ہیں نظربند ہو دیدہ دل باز یہاں، دیدہ سر بند

فیضِ محبت ہو قیدِ محن میرے لیے ایک بلائے حسن

نیا جب اس نے کوئی شر اٹھایا  
شپ معراج مردانِ خدا ہو  
برمی ایذا پسندی نے دعا دی  
بہ قولِ شیخ ، روزِ نامرادی  
مجازی عشق بھی ایک شو ہو لیکن  
ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی  
۱۹۴۲ء سے حسرت کی سیاسی شاعری پر اشتعالیت کا رنگ گہرا ہو گیا ہے  
نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی  
نہ حکام کا جور بے جا رہے گا  
زمانہ وہ جلد آنے والا ہو جس میں  
کسی کا نہ محنت پہ دغا رہے گا

جسے کہتے ہیں اہسا اک اصولِ خودکشی تھا  
عمل اُس پہ ، کوئی کہتا ، نہ کبھی عوام کرتے

اور باوجود انتہائی مذہبی اعتقاد کے وہ یہ بھی کہتے ہیں ہے  
ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا ، اہلِ سوتیت نے  
دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوف دیں ہو کر

لازم ہو یہاں غلبہٴ آئینِ سوتیت  
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

گانڈھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرغ  
لینن کی طرح دیں گے نہ دُنیا کو ہلا ہم

لیکن اس انقلاب کا سب سے بڑا نہیں تو مجموعی طور پر نمایندہ شاعر جوش ہو۔ جوش کی شاعری میں ابتدا ہی سے حریت پسندی کی طرف کچھ کچھ رجحان تھا اگرچہ کہ وہ ان کے فمردائم کے بعد ثاوی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن حیدر آباد کی ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد ، کچھ نفسیاتی وجوہ ، اور شاید

طبعی رجحان کی وجہ سے انہوں نے عملی طور پر ترقی پسند مصنفین اور شاعروں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے، اور ایک ذہنی نفسِ مضمون جس کی اُن کی لاابالی شاعرانہ طبیعت کو بڑی ضرورت تھی، انھیں مل گیا۔

جوش کی شاعری میں بہت جوش و خروش، اور ایک غیر معمولی ہمت اور مردانگی ہو۔ یہ مردانگی ان کی شاعری کی عظمت کی سب سے بڑی وجہ ہو۔ ہر طرح کی جسمانی اور ارادی کم زوری کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں۔

مرد کہتے ہیں اُسے او مانگ چوٹی کے غلام جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام اسی وجہ سے ان کے تشبیہات اور استعارات میں آتش سیال کا سا اُبال اور جوش پیدا ہوتا ہو۔ ان استعارات کی جدت اور ندرت متحرک اور زلزلہ خیز ہو۔

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہو، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں  
تقدیر کے لب کو جنبش ہو، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہو، بے نور ہو چہرہ سلطان کا  
تخریب نے پرچم کھولا ہو، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں  
کیا اُن کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ ملت کو  
اُملیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسِ گی فلک سے شمشیریں

کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چُرایا کرتے تھے  
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے  
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ لڑائیں زنجیریں

کون انکار کر سکتا ہو کہ ایسی نظموں کی پُر شوکت روانی، ان کے وزن، ان کے الفاظ کی بے محابا ترتیب، ان کے جذبات کی خود سری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی ہو۔ جوش

کی ایسی نظموں میں جمالی قدر پرانی، صاف، ستھری، پامال مثالوں سے بھل کر کشافت، بیماری، گندگی کو اپنے طلسمی انقلابی سُس سے جان دار، اور موضوعِ سخن شاعری بناتی ہو۔ کیوں کہ ایک بار جب اس کشافت یا بیماری کی بے درد معاشی وجہ سمجھ میں آجائے تو اس سے نفرت باقی نہیں رہتی، اس کی جگہ ایک طرح کا غیض و غضب، جوش اور غصہ پیدا ہو جاتا ہو، جس کا مقصد اس غلاظت کو صاف کرنا ہوتا ہو۔ جوش کی ان نظموں کے اسلوب، ان کے طرزِ بیان اور ان کی اس نوع کی تشبیہوں اور استعاروں کا بعض ہونہار نوجوان شعرا مثلاً احسان دانش اور محمد محی الدین پر اچھا خاصہ اثر ہوا ہو۔

جوش کا ایک اور محبوب اسلوب ”نظم تکرار“ ہے۔ مسلسل غزل، یا قصیدے کی تشبیہ کی طرح یہ نظم — چمے سلیم مرحوم، آزاد انصاری اور خود جوش نے پروان چڑھایا ہے، کسی ایک موضوع کو مختلف اور متوازی مضامین یا تشبیہوں کی تکرار کے ذریعے ادا کرتی ہو۔ جوش نے بہت کامیابی سے اسے انقلاب کی خدمت کے لیے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ”نظام نو“ ملاحظہ ہو جو میرے خیال میں ان کی Imagery کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

آج اگر تو، ظلمتور، میں یا رسول! ہو تو کیا؟  
آج یوسف، بتدے چاہو کفاح! ہو تو کیا؟  
آج ناہوار سطحِ بزمِ امکاں ہو تو کیا؟  
ابو غم زلفِ جہاں پر بال جنباں ہو تو کیا؟  
آج اگر نادانی، ادھام و ایقان ہو تو کیا؟  
آج اگر بہتانِ عبیت پہ نازاں ہو تو کیا؟  
آج اپنا خون پانی سے بھی ارزاں ہو تو کیا؟  
آج راون کا محل، سینا کا زندان ہو تو کیا؟  
آج اگر ناہر بانی میرِ ساماں ہو تو کیا؟  
آج ابوسفیان کے گھر میں چراغاں ہو تو کیا؟

کھیل، ہاں اور نوعِ انسان، ان سیرِ راتوں سے  
چل چکی ہو پیشوائی کو نسیمِ بارِ مصر  
ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند  
ٹھہریں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب  
راہ میں ہو کارواں تشکیک اور تحقیق کا  
کل یہی بندہ، الوہیت سے ہو گا شاد کام  
کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بوند بوند  
آرہی ہو آگ لٹکا کی طرف بڑھتی ہوئی  
دستِ غم خواری میں ہوگی کل زلمِ آبِ دنان  
بن رہا ہو صرصر و سیلاب خونِ ہاشمی



ہو رہا ہے طبعِ فرمانِ حیاتِ جادواں موت اگر اب تک رگِ جاں پر خراں ہو تو کیا؟  
 نظم کی ساخت ، تضاد پر مبنی ہے ، اس تضاد کو واضح کرنے کے لیے شاعر نے روایتی رمزیت ،  
 عربی قصص الانبیاء ، ارسنیا ، عورتوں کے سنگھار ، جدید سائنس کے تجرباتی رُجحان ، فلسفہ ، جواہرات ،  
 دلائل ، روایاتِ میزبانی ، تاریخِ اسلام ، اور زندگی اور موت کی کشمکش سے اپنے مقصد کے لیے  
 تشبیہیں مستعار لی ہیں ۔ تقریباً ہر تشبیہ نادر ہے ، اور اگر کوئی نادر نہیں ، تو ترتیبِ الفاظ اُسے نادر  
 بنادیتی ہے ۔

جوشِ جب شاعرانہ وجدان سے الگ ہو کے لکھتے ہیں ، تو ان کی شاعری پُھس پُھسی اور آلودہ  
 کی شاعری معلوم ہونے لگتی ہے ۔ ان کے بلند کو ، میں بہ غایت بلند تو نہیں کہہ سکتا مگر پستش بہ غایت  
 پست کا اطلاق ان پر یقیناً ہوتا ہے ۔ اقبال کی طرح وہ شاعری میں ذہنی اور فلسفیانہ قوت پیدا کرنا  
 چاہتے ہیں لیکن چون کہ وہ اقبال کے عظیم الشان علمی پس منظر اور ذہنی پیش منظر سے محروم ہیں ، اس  
 لیے جب جوشِ گہرائیوں میں اُترنا چاہتے ہیں تو ان کی سطحیت اور نمایاں ہو جاتی ہے ۔ باوجود ان کے  
 اس تمام جوش و خروش اس تمام اہال اور شورش کے کبھی کبھی اُن کے خلوص ، اور اُن کے عقیدے  
 پر بھی شک ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ جوشِ الفاظ کی فراوانی ، لیکن جوشِ کوار کی کمی ہے ۔ پھر بھی اُردو  
 شاعری انقلابی نفسِ مضمون کو جاگزیں کرنے ، اور تشبیہات میں ایک ہل چل سی مچا دینے کی وجہ سے  
 انھوں نے اپنے لیے ایک لازوال جگہ پیدا کر لی ہے ۔

فیض کی شاعری ”وے برفروخت جانے خردیم“ کہ کے انقلاب کے ماحول میں قدم رکھنے کی  
 کوشش کر رہی ہے ، لیکن خرید و فروخت کا یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہو چکتا ہے ۔ عاشقی اور انقلاب کا درمیانی  
 خطِ فاصل ، جس کو وہ پار کرنا چاہتے ہیں ، کسی طرح پار نہیں ہو چکتا ۔ اُن کی شاعری عشق اور انقلاب  
 کے درمیان ایک گریز مسلسل بن گئی ہے ۔ ”سُنبِ محبوب کا تیاں تمسور“ کسی طرح ان کا پیچھا نہیں  
 چھوڑتا کہ وہ ہمہ وقتی طور پر انقلاب کی خدمت کر سکیں ۔ ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“

”سوچ“، ”رقیب سے“، ”چند روز اور مری جان“، ”موضوع سخن“، ”ہم لوگ“، ”مرے ہم دم“  
مرے دوست“ سب کا موضوع ایک ہی سا ہو۔ شاعر کی طبیعت کی اس ختم نہ ہونے والی کش مکش  
میں عشقیہ زندگی کے نقوش ہی — جن کو شاعر بھلا دینا چاہتا ہو، اور بھلا نہیں سکتا — زیادہ سچے،  
واضح، اور دل فریب معلوم ہوتے ہیں۔

یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد      اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شواہد  
چاندنی راتوں کا بے کار دکھتا ہوا درد      دل کی بے سوز تڑپ، جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

یا ”موضوع سخن“ کا یہ حصہ ہے  
آج پھر حُسنِ دل آرا کی وہی وجہ ہوگی      وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر  
زنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار      صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر  
یا ”مرے ہم دم“، ”مرے دوست“ کا یہ ٹکڑا ہے

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم      گرم ہاتھوں کی حرارت میں گھل جاتے ہیں  
کیسے اک چہرے کے ٹھیرے ہوئے نازِ نقوش      دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں  
کس طرح عارضِ محبوز کا شفاف بلور      یک بہ یک بانہٴ احمر سے دھک جاتا ہو  
کیسے جھمکتی ہو سہر شلخ سے خدِ برگِ گلاب      کس طرح رات کا ابران ہبک جاتا ہو  
اس میں کیا شک ہو کہ اس شخص نے واقعی عاشقی کی ہو، اور عشق اور دیدارِ حُسن کے ہر لمحے  
سے ایسا جمالی حظ حاصل کیا ہو کہ وہ لاکھ اس سے گریز کر کے خالص جوشیلی انقلابی شاعری کو اپنا مسلک  
بنانا چاہے، وہ اپنے تجربوں کو نہیں بھول سکتا۔

لیکن میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری کا انقلابی پہلو ناکام یاب ہو۔ ناکامی سہی، مگر ناکام یاب  
ہرگز نہیں عشق سے انقلابی جذبہ سبق بھی لے سکتا ہو۔ اپنے رقیب سے فیض یہ کہتے ہیں۔  
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہو کیا سیکھا ہو؟      بجز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی یاس و جرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے  
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا سرد آہوں کے، بُخ درد کے معنی سیکھے

ان کی خالص انقلابی نظموں میں سب سے زیادہ تعمیری، میرے خیال میں ”بول“ ہے

دیکھ کر آہن گر کی ڈکاں میں تہہ ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن

گھٹنے لگے قفلوں کے دہانے پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے جسم و زباں کی موت سے پہلے

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا زندگی کی رفتار سے بہت گہرا تعلق ہے، یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے۔ ”تنہائی“ اور ”موضوع سخن“ میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہے۔

”تنہائی“ میں استعارتاً گرد و پیش کا سارا ماحول شاعر کا ساتھ دیتا ہے

نوح پچی رات، یکبھر نے لگاتار دن کا غبار لکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُرخ

استعاروں کی سرکاری، شاعر کے جذبے کا اتنا ساتھ دیتی ہے، کہ خارجی اور داخلی احساس ایک

ہو جاتے ہیں۔ اور فطرت اور انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ”موضوع سخن“

میں یہ تشبیہ ہے

”ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے! کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلن رنگیں

اس ایک شعر میں رمزی تشبیہ کی وجہ سے مشرقی شاعری کی حیاتِ عاشقہ کی صدیاں آباد ہیں۔ کتنی پابندیاں

کتنے روک، کیسا صدیوں کا مسخ شدہ جمالی معیار اس شعر کے باطن سے بھانکتا ہے۔ یہ غالباً فیض کا بہترین

شعر ہے۔

ن۔م۔ راشد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظم آزاد کو اردو میں مقبول کیا۔ نظم

عاری کے تجربے اردو میں کچھ عرصے سے ہو رہے تھے۔ طباطبائی اور بخوری مرحوم نے اس سلسلے میں کوشش کی تھیں۔ لیکن نظمِ عاری کا سب سے کامیاب نمونہ عابد نواز جنگ کا "ہیلٹ" کے کچھ حصوں کا ترجمہ ہے۔ نظمِ آزادِ نظمِ عاری سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ عام اردو شاعر یا ناظر دونوں کو تقریباً ایک ہی سمجھتا ہے۔

انگریزی اور امریکائی شاعری میں "نظمِ آزاد" (*free verse*) کا تحریکِ تصویریت *Imagism* کے ساتھ زور بندھا۔ یہ تحریک، فرانسیسی رمزیت کے ابہام اور سہل پسندی کا ردِ عمل تھی۔ لیکن اس کی نظمِ آزادِ فرانس ہی کے اثر، یعنی فرانسیسی ادب یا مخصوص لافورگ *Laforgue* کی نظمِ آزاد *Verse libre* کی مرہونِ منت ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلٹ جن نے نظمِ آزاد کو سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا فرانسیسی نظمِ آزاد اور عہدِ الزبتھ کی انگریزی نظمِ عاری میں تقریباً وہی خصوصیتیں دیکھتا ہے اور دونوں کو ایک ساں قرار دیتا ہے۔ "لافورگ — جو فیثاً بہت اہم تکنیکی سوجد تھا — کی نظمِ آزاد، زیادہ تر اسی طرح کی نظمِ آزاد ہے، جیسے شکسپیر، میسٹر، لورنر کا آخری دور کا کلام نظمِ آزاد ہے۔ عہدِ الزبتھ اور سیکوین زملنے کی شاعری، نظمِ عاری کی بحر کو پھیلاتی ہے، سکیرتی ہے، اس کی شکل بگاڑتی ہے۔"

اردو شاعری میں اظہار کی آزادی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اگر راشد صاحب نہ بھی لکھتے تب بھی ایک طرح کی نظمِ عاری یا نظمِ آزاد کی مقبولیت ضروری تھی۔ لیکن راشد صاحب نے اس طرز کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس نظمِ آزاد کو قافیے اور ردیف سے بالکل بے نیاز نہیں کر سکے۔ چاہے جان کو قافیے اور ردیف کا سہارا لینا پڑتا ہے

تیرے رنگیں رُس بھرے ہونٹوں کا لمس

جس کے آگے پہنچ جراتِ شراب

یہ سنہری پھل، یہ سیمیں پھول مانندِ سراب

سوزِ شمع و گردشِ پروانہ گویا داستان

نغمہٴ ستارگان، بے رنگِ دآب

قطرہٴ بے مایہ طغیانِ شباب

ایسی مثالیں بہکثرت ملیں گی۔ اور حیرت ہونے لگتی ہو کہ کیا واقعی اُردو نظم نے بحر و قافیے سے وہ آزادی حاصل کر لی، جس کی وہ عرصے سے جویا تھی؟۔ یا کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ پابندی اور بڑھ گئی۔ اور اگر یہ بات ہو تو نظم آزاد کو ابھی اہل زیادہ آزادی کی ضرورت ہو۔ راشد صاحب کی نظم آزاد، نظم میں وہ دعائی اور سلاست بھی نہ پیدا کر سکی، جو اس کی سب سے بڑی وجہ جواز ہو، مغلط ترکیبیں جو نامانوس بھی ہیں راشد صاحب کی نظم کا دوسرا سہارا ہیں۔ انگریز کی مثال ہی میں دیکھیے ”قطرہ بے مایہ طغیانِ شباب“ اسی طرح ”مژ تازہ و ناب“، ”ساعتِ دزدیدہ و نایاب“، ”بسترِ سنجاب و سمور“ اور ایسی بیسیوں ترکیبوں سے راشد صاحب کی نظم ذہنی اور شعری سہارا لیتی ہو۔ اس طرح وہ نظم کا ذہنی وزن بڑھانا چاہتی ہو، اور یہ اس کی کم زوری کی نشانی ہو۔

بحیثیت طرزِ اظہار نظم آزاد کی کامیابی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں رمزیت کو پیش کرنے کی بڑی صلاحیت ہو۔ ”خودکشی“ اور ”زنجیر“ میں راشد صاحب نے اپنی نظموں کو رمزیت کا رنگ دیا ہو۔ مثلاً ”خودکشی“ کے یہ حصے

”شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں

چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں

صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند“

محاورے کی خامی سے قطع نظر، اس ٹکڑے میں رمزی جدت ہو، اُس سے زیادہ کامیاب یہ ٹکڑا ہو۔

”آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس

اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر

آج میں نے دیکھ پایا ہو لہو

تازہ و رخشاں لہو

بوسے محو میں بوسے خون اُلجھی ہوئی“

”زنجیر“ میں پوری نظم کا ”بنیادی رمز زنجیر ہے۔ پہلے بند کی رمزیت کی تشریح دوسرے بند کی نیم رمزیت اور نیم تشریح سے، اور تیسرے بند کی صاف تشریح سے ہوتی ہے۔ ان کی نظم آزاد میں غیر مانوس خیالات کے بیان اور ان کے پیہم اظہار کی بھی صلاحیت ہے۔ مثلاً ”جراتِ پرواز“ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

”میرے سینے ہی میں پیچاں رہیں آپیں میری  
کر سکیں رُوح کو غریباں نہ نگاہیں میری !  
ایک بار اور محبت کر لوں  
سُئی ناکام ہی

اور اک زہر بھرا جام ہی  
میرا یا میری تمناؤں کا انجام ہی  
ایک سودا ہی سی، آرزوے خام ہی ؟

نظم آزاد میں قافیے اور ردیف کی سخت پابندی سے نجات مل جانے کی وجہ سے نئی طرح کی ٹھوس تشبیہیں اور استعارے اپنا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ شبہیں، چلتی پھرتی زندگی سے آئی ہیں کبھی کبھی ان میں مشاہدہ اور احساس ایک ہو جاتا ہے جیسے  
تیری مڑنگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول  
بس سے موصول جانے کو ہے غازہ ترا ۔  
(”اتفاقات“)

تیرے سینے کے سمن زادوں میں اُنھیں لرزشیں  
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لیے  
(”ایک رات“)

عشق کا ہیجان، آدمی رات اور تیرا شباب

تیری آنکھ اور میرا دل  
عنکبوت اور اُس کا بے چارہ شکار  
(”آنکھوں کے جال“)

یا

شمع کے سائے سے دیوار پہ محراب سی ہو  
(”عہد وفا“)  
کبھی کبھی ان تشبیہوں میں سچی جدت اور ندرت بھی نظر آجاتی ہو  
رقص کی یہ گردنیں  
ایک مبہم آسیا کے دُور ہیں  
(”رقص“)

اور

نیند، آغازِ زمستان کے پرندے کی طرح  
خوفِ دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے  
اپنے پر تولتی ہو، چنیتی ہو !  
(”بے کراں رات کے سنلے میں“)  
اس نظم آزاد کی سب سے بڑی خامی یہ ہو کہ ایک ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سی لغزش سے اس میں  
”شکمہ خیز نثریت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کی طور پر ”خودکشی“ میں یہ حصہ  
”جی میں آئی ہو لگا دوں ایک بے باکانہ جست  
اس دریچے میں سے جو

جھانکتا ہو ساتویں منزل سے کوئے دِ بام کو“

یہی وجہ ہو کہ اس کثرت سے نظم آزاد کی نقل اُتار اُتار کے ہنسی اڑائی گئی ہو۔ کھنیا لال کپور  
اور چراغِ حنِ حسرت کی نقلیں خصوصیت سے بہت دل چسپ ہیں، اور مُصلح بھی ہیں۔

لیکن تکنیک ہی پر ن۔م۔راشد کی سدی خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ترقی پسندی ان کی کچھ ہی  
نظموں میں ہو مثلاً ”شرابی“، ”زنجیر“، ”دریچے کے قریب“ اور وہ بھی ذرا کم کم۔ صرف ایک ہی  
جگہ اس میں حقیقت جھلکتی ہو، ”دریچے کے قریب“ میں سے

”دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم  
 بے پنہ سیل کے مانند دھواں  
 جیسے چنات بیابانوں میں  
 مشعلیں لے کے سرشام نکل آتے ہیں !  
 ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں  
 ایک دھن سی بنی بیٹھی ہو  
 ٹھنڈی ہوئی ، نفیسی خودی کی قندیل  
 لیکن اتنی بھی توانائی نہیں  
 بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلہ جوالہ بنے  
 ان میں مغلّس بھی ہیں ، بیمار بھی ہیں  
 زیرِ افلاک مگر مُظلم ہے جاتے ہیں۔“

لیکن چند مشالوں سے قطع نظر ان کی شاعری اور طبیعت کا مجموعی رجحان زندگی کی کشمکش  
 سے گریزاں اور مفروز ہو اور رجعت کی طرف مائل ہو۔ ”وادی پنہاں“ میں انھیں ایک ایسی  
 جگہ کی تلاش ہو جہاں خیر و شر کے تصورات نہ ہوں۔ ”رقص“ میں وہ اپنے فرار اپنی بے طاقتی  
 کا صاف صاف اقبال کرتے ہیں۔

”بندگی سے اس درد دیوار کی  
 ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں  
 جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں  
 زندگی پر نہیں بھیسٹ سکتا نہیں!“

اس کی وجہ یہ ہو کہ صرف دو طاقتیں ان کے دل و دماغ پر مسلط ہیں۔ جنس ، اور جنسی تشنگی  
 کی وجہ سے خواہش مرگ۔ جنس ان کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی قدر ہو۔ ”اجنبی عورت“ کو



پڑھ کے شک ہونے لگتا ہے کہ جنس میں محویت ان کے نزدیک احتسابِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔  
 ”حُزنِ انسان“ سے معلوم ہوتا ہے جنس ہی کی وجہ سے انھیں تصورات سے دشمنی ہے۔ راشد صاحب  
 کے نزدیک تصورات کا واحد تصور یہ ہے کہ وہ جنس پرستی کو دھوکا دیتی ہے۔

آہ انسان کہ ہے دہوں کا پرستار ابھی

حُسنِ بے چارے کو دھوکا سا دیے جاتا ہے

ذوقِ تقدیس پہ مجبور کیے جاتا ہے

مُسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب

ہو یہی حضرت یزداں کے مسخر کا جواب

اسی ہمہ گیر جنس پرستی، جسم پرستی کی روشنی ہی میں راشد صاحب فطرت کو دیکھتے ہیں اور اس

طرح ایک سہل انگار لا ادریت کی طرف ان کا قدم اٹھتا ہے۔

پھول ہیں، گھاس ہے، اشجار ہیں، دیواریں ہیں

اور کچھ سائے کہ ہیں مختصر و تیرہ و تار،

تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟

یہ لا ادریت اس وقت دہریت بن جاتی ہے، جب راشد صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے نام پر

بنائے ہوئے تمام مذہبوں میں — انسان کی ہزار ہا سال کے مرتب کیے ہوئے ناذنِ اخلاق کی

حد تک تو وہ افلاطون کو جواب دے ہی چکے ہیں — جنس کو قدرِ واحد اور زندگی کی سب سے

بڑی حقیقت نہیں سمجھا جاتا۔

میری رائے میں راشد صاحب کی اس بے حد و انتہا جنس پرستی کی تہ میں ایک گہرا جنسی

احساس کم تر ہے۔ ”رقص“، ”اجنبی عورت“ اور ”انتقام“ میں یہ جنسی احساس کم تر ہے خصوصیت

سے نمایاں ہے۔ دیوارِ رنگ ”اصل میں خود ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ

ایک سفید نام عورت سے ہم بستر ہونے کو قوی انتقام سمجھتے ہیں۔ اگر انتقام اتنا سہل اور اتنا لذیذ

ہوتا تو کیا کہنے۔ لیکن احساس کمتری کے سوا بھی، مجھے تو یہ بڑا ہی بورڈ و آ انتقام معلوم ہوتا ہے جس کی تعریف کیونٹ مینی فیسٹو میں یوں کی گئی ہے۔ ”وہ ایک دوسرے کی بیویوں کی عصمت ریزی میں انتہائی لذت محسوس کرتے ہیں“ ظاہر ہے کہ یہ مریضانہ جنس پرستی کوئی حقیقی توت تخیلی نہیں اس لیے اس کا منتہا ایک طرح کی مرگ انگیز رھانیت ہے۔

”صبح جب باغ میں رس لینے کو زہور آئے

اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب

شبہنی گھاس پہ دو پیکرِ رخ بستہ ملیں

(”اتفاقات“)

اور خدا ہے تو پشیمان ہو جائے

جس زندگی میں جنس کے برابر اور کوئی قدر نہ ہو، اس میں موت کی خواہش ضروری ہے۔ یہ فراد کی انتہا ہے۔ چنانچہ راشد صاحب کے پہلے مجموعہ کلام کی مریضانہ جنس پرستی کا خاتمہ ”خودکشی“ پر ہوتا ہے۔ اس صدی کے سب سے بڑے شاعر نے سچ لکھا ہے۔

نہیں ہنگامہ پیکار کے لائق وہ جاں جو ہوا نالہ مرغانِ چمن سے مدہوش

راشد صاحب کی بہت سی نظمیں سترھویں صدی کے انگریز METAPHYSICAL شاعر سے

ماخوذ ہیں۔ ماخوذ اس طرح ہیں کہ مرکزی خیال ان نظموں سے لیا گیا ہے، مگر اس کی تجدید کی گئی ہے

یعنی اس خیال کو راشد صاحب نے اپنی لادری جنس پرستی پر منطبق کیا ہے۔ اور ان نظموں کی

تمام وجدانی خصوصیتوں اور جالی خیروں کا خون ہو گیا ہے۔ چنانچہ ”خزنِ انسان“ ایک حد تک

DONNE کی نظم EXTASIE سے متاثر ہے۔ اسی طرح ”سپاہی“ دن کی سلوہیں ELEGIE

کی ایک جدید شکل ہے۔ ”زوال“ MARVELL کی نظم TO HIS COY MISTRESS سے

ماخوذ ہے۔ لیکن راشد نے کہیں خیال یا موضوع کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

اسرار الحق مجاز نے شاعری کو انقلاب پر قربان نہیں کیا۔ وہ کبھی نہیں کہتے تھے کیوں کہ

تغزل ہی سے اُن کی شاعری کا خمیر بنا ہے۔ اُن کی دو ابتدائی غزلیں جو شاد کے رنگ میں ہیں بہت اچھی ہیں۔ عشقیہ شاعری اُن کا قِطری موضوع ہے اور اسی میں وہ جدت طرازیں دکھاتے ہیں۔ شاہدے ادبیان کی مُدرت کبھی کبھی لطف دے جاتی ہے، جیسے ”بتانِ حرم“ میں یہ شعر ہے

آہ وہ دوشیزہ لب، گُل ریز لب، گُل نار لب      آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خوں بار لب

انقلابی رجحانات میں آزادیِ نسواں پر انھوں نے بہت زور دیا ہے۔ یہ ان کے لیے ایک نفسیاتی اور جمالی ضرورت بھی ہے۔ ”نوجوان خاتون سے“ اپنے لطفِ استدلال اور شوخی کے باعث بہت دلچسپ ہے

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے      تو اس نشتر کی تیزی آزمائیتی تو اچھا تھا  
اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل      بھری محفل میں آکر سر جھکالیتی تو اچھا تھا  
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن      تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا  
عورت کی عصمت اور عمل دونوں کی روح پر دے میں نمایاں نہیں ہو سکتی ہے

قسم شوخیِ عشقِ سنجوگتا کی  
قسم جوئے کے عزمِ صبرِ آنا کی  
قسم طاہرہ کی قسمِ خالدہ کی

کوئی اور شاعر یہ عصمت نہیں ہے

”رات اور ریل“ ”خانہ بہ دوش“ اور ”خوابِ سحر“ اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن مجاز کی بہترین نظم ”آوارہ“ ہے۔ یہ نظم اُن کے انقلابی عقیدے اور تغزل کے امتزاج سے بنی ہے۔ اس کی رومانیت انقلابی ہے۔ ”آوارہ“ ایک خالص رومانی فرد ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے جرمن ادب انگریزی رومانی مڈر میں بھی WANDERER اور WANDERLUST کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ اب ہمارے ترقی پسند ادب نے ”آوارہ“ کو اپنایا ہے، اور اپنی انقلابی رومانیت کی ایک ممتاز شخصیت بنایا ہے کرشن چندر کے ایک ڈرامے ”نیل کنٹھ“ میں بھی ”آوارہ“ ہی حقیقی انسانیت کا نمائندہ بتایا گیا ہے۔ یہ

اقبال کے قلندر کی انقلابی رومانی صورت ہو۔ مجاز کی اس نظم کا زاویہ نگاہ شاعر کا داخلی احساس ہو۔ اسی لیے منظر کا احساس فوراً داخلی بن جاتا ہے۔

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ ، پھر وہ چھوٹی پھل چھڑی  
جانے کس کی گوہ میں آئی یہ موتی کی لڑی  
ہنک سی سینے میں اٹھی ، چوٹ سی دل پر پڑی

ای غمِ دل کیا کروں ، ای وحشتِ دل کیا کروں  
”غمِ دل“ اور ”وحشتِ دل“ بھی داخلی احساسات ہیں۔ ”آوارہ“ کی ذہنی بغاوت کی ہزیمت شہر کی سرمایہ دارانہ خارجیت ہو۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے کو بے گانہ اور آزاد محسوس کرتا ہے۔  
بڑھ کے اس اندر بھکا ساز و سامان پھونک دوں  
اس کا گلشن پھونک دوں ، اُس کا بستان پھونک دوں  
تختِ سلطان کیا ، میں سارا قصرِ سلطان پھونک دوں

ای غمِ دل کیا کروں ، ای وحشتِ دل کیا کروں  
مجاز کے سوا یوپی کے دو ایک اور ترقی پسند شاعر قابلِ ذکر ہیں۔ جذبی کے اس ایک شعر کو  
یاس پسند ہندستان کے پورے طول و عرض میں لافانی شہرت حاصل ہو چکی ہے  
جب کشتی ثابت و سالم تھی ، ساسل کی تمنا کس کو تھی اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے  
مجازی کی کچھ نظمیں میں نے ”ادھر ادھر سالوں میں دیکھی ہیں ، کچھ ان کی زبانی سنی ہیں۔ یاس کا رنگ ،  
اور موت کا خوف غالب ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ”فردناں“ زیرِ طبع ہے ، جب تک اُن کا پورا کلام  
پڑھ نہ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ اسی طرح علی جاوہر زیدی کے کلام سے بھی ، بجز ان کی چند  
نظموں کے جو سری نگر میں ان کی زبانی سنی تھیں ، میں واقف نہیں۔

احسان دانش کا مزدور طبقے سے تعلق رہا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے کلام میں دردِ اس قدر ہو کہ



کے دو پہلو اُنھوں نے واضح کیے ہیں۔ ایک طرف تو امیر مرثیوں پر ڈاکٹروں کی پوری توجہ سے کہیں تپ دق کی جاں گزاری تو اس کے سانچوں میں دھل ہی تھی کہیں ہلاکت جھجک جھجک کر حیات کے ساتھ چل رہی تھی نجیفِ سرسام کسچروں کے نقشے میں بے خود پڑے ہوئے تھے برآمدوں میں قدم قدم پر بخار ہے ہوئے کھڑے تھے دوسری طرف جنرل وارڈ میں مفلس مرثیوں سے

دوائیں باسی، خراب پوشش، نہ تازہ کھانا، نہ صاف پانی نہ خون میں زندگی کی گرمی، نہ سانس میں جاں فزا دوائی نہ کوئی اشارتِ دوستی، نہ کوئی خدمت گزار اُن کا وہ نوجوان خود پسند لڑکے، ابھی جو تعلیم پارہے تھے غریب فاقہ کشوں کی جانوں کو تجربوں میں گنوار ہے تھے اس معاشی تفریق، عدل کے اس فقدان، اس ظلم کا اُنھوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے، اور اُن کی توجہ مشاہدہ تیز ہے۔ آج کل اُن کا کلام فیشن ایبل نہیں رہا، کیوں کہ اُن کی ترقی پسندی اکادمی ترقی پسندی نہیں۔ لیکن وہ بہت سے اکادمی شاعروں سے زیادہ پُر خلوص، جان دار، اور سچے شاعر ہیں۔ ڈرامنگ روم میں بیٹھ کے مزدوروں کے متعلق شاعری کرنا اور چیز ہے اور مزدوروں میں عمر گزار کے شاعری کرنا دوسری بات۔

مخدوم محی الدین کی شاعری، تمام انقلابی شاعری کے مقابل اپنے خلوص، جوش کردار اور انقلابی جدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اور یہ زبان، محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود۔ نظمیں تھوڑی ہی ہیں، لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی، ایک آتش فشاں اندرونی حرارت ایک سچا مخلص جذبہ اُن کا محرک ہے۔

مخدوم کے کلام کا مجموعہ جو ”سرخ سویرا“ کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے اُن کی ایک ابتدائی عشقیہ نظم ”طور“ سے شروع ہوتا ہے۔ ”طور“ مخدوم کے لیے مجازی محبت کا ایک رمز ہے۔ یہ اُس کا انتہائی نقطہ یا مقام یا کیفیت ہے جس کے اظہار کے لیے اُنھوں نے عشق حقیقی سے ایک تسلیج مستعار لی ہے۔ مخدوم کا عشق جہانی آرزوؤں کی تکمیل کا عشق ہے۔ اُس میں انفرادیت ہے۔ اعدان

دونوں چیزیتوں سے وہ حسرت موہائی سے متاثر ہو۔ اس عشق کی وارداتوں کے بیان میں ایک ناقابل انکار واقعیت ہے۔ ”سجدہ“، ”اختصار“، ”وہ“ اور ایسی کئی نظموں کی جان یہی واقعیت ہے۔ ان نظموں کو پڑھ کے یقین آجاتا ہے کہ اس شخص نے سچ محبت کی ہے۔ ”لمحہ رخصت“ اور ”نامہ حبیب“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا ہے، اور اس کی نفسیات کو اپنی داخلیت کی روشنی میں دیکھ کے، اُس میں جوش و حرارت، اُلوکھاپن، اور جدت پیدا کر دی ہے۔

کچھ مُسنے کی خواہش کاؤں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں  
گردن میں حائل ہونے کی بے تاب تمنا باہوں میں  
دارفہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک اداسے زلیخائی  
اندازِ تغافل تیور سے، رُسوائی کا سماں آنکھوں میں (”لمحہ رخصت“)

اور ”نامہ حبیب“ میں آوارہ ہواؤں کی زبانی، عاشق کی شکایتوں پر محبوبہ کا جواب ہے  
مُنا ہے ضبط کو تُم دِل کی سنگینی سمجھتے ہو  
اداسے خوفِ رُسوائی کو خود بینی سمجھتے ہو  
لیکن محبت ”کچھ کلی کی بے زبانی“ پر غالب آجائے گی ہے

جنوں پرورِ اداؤں کے سنورنے کے ارادے ہیں  
خدا کے عشقِ انفت سے اُترنے کے ارادے ہیں  
زمین و آسمان کو ایک کرنے کے ارادے ہیں  
آخری شعر سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ عشق میں بھی ایک انقلابی کیفیت بڑستی جاتی ہے، ایک ایسا لمحہ آجاتا ہے جب شاعر کی بھی، اپنے معشوق کی بھی، غلامی نہیں کر سکتا ہے  
آہ پہلے نارِ ساقی، اب کہیں رُکئی نہیں اب کسی کے آستانے پر جہیں ٹھکتی نہیں  
اس کے بعد ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انقلاب اور عشق ایک ہو جاتے ہیں۔

انقلابی خیالات کی رفتار شروع میں تو زیادہ تیز نہیں یعنی ”باغی“ اور ”جنگ“ میں لیکن ”مشرق“

میں اپنے ماحول سے بے زاری مخدوم کی انقلابی حرارت میں جوالا لکھی کا سا رور اور اشتعال پیدا کر دیتی ہے۔ وہ مشرق جس کا ڈانڈا اقبال نے آسمان سے جا بلایا ہے اُس کی اصلیت اس نئے شاعر کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ہم زائیدہ خداؤں کا ، روایت کا غلام پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جدام اک مسلسل رات جس کی صُبح ہوتی ہی نہیں خواب اصحاب کہف کو پالنے والی زمیں اجتماعی زندگی کی طرح خانگی زندگی میں بھی شاعر کو ہر طرف موت کے مڑتے ہوئے آثار نظر آتے ہیں یہ گھر کے ہر دروازے سے ناسور کی بو آتی ہے قبر کی ، عود کی ، کافور کی بو آتی ہے اس اشتعال کا پہلا مقصد تخریب ہے ”اول اس بنیاد را ویراں کنند“ جوالا لکھی کا پہلا کام اس پُرانے نظام کو جلا کے خاک کرنا ہے

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں  
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں  
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں  
”موت کا گیت“  
نہیں صرف نظام نو نہیں ، بلکہ پوری کائنات تباہ کر دیے ، نہ کی مستحق ہے کیوں کہ اُس نے ایسا وحشت ناک نظام پیدا کیا ہے کہ

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی  
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی  
لیکن ”مشرق“ اور ”موت کا گیت“ دونوں تخریبی نظموں کا خاتمہ ایک نئی انسان پرست اور عدل پرست دنیا کی بنیاد کے تصور پر ہوتا ہے۔ بہت جلد نئی دنیا کی تعمیر کے اہم فرض کا احساس ، اس ذمے داری کا احساس ، شاعر کے جوش تخریب کو ایک تعمیری راستہ دکھاتا ہے۔ ”جہان نو“ اور اس کے بعد کی نظموں کی رُوح عمل تعمیری ہے۔

جب ایک بار مخدوم نے یہ محسوس کر لیا کہ شاعری کا بہت بڑا فرض مزدوروں کے بڑے بڑے جتھوں کو جگانا ہے ، تو ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض ذہنی گورکھ دھندوں کی انقلابی شاعری ، ترقی پسند



بورژوا حلقوں میں تو مقبول ہو سکتی ہو لیکن اپنا اصلی فرض انجام نہیں دے سکتی۔ انگلستان کے بعض ترقی پسند شاعروں نے بھی اس طرح کی نظموں کی ضرورت محسوس کی تھی جو کم علم مزدوروں میں مقبول ہو سکے۔ ۱۹۳۷ء میں برنگھم میں ادوئن نے مجھے سترھویں صدی کے گیتوں کا ایک مجموعہ دکھلایا اور کہا تھا ”اب میں اس قسم کی شاعری کا زیادہ تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اس کے بغیر وہ عوام کے کام کی نہیں۔“ مخدوم محی الدین نے انقلابی گیت کی اہمیت کو بہت جلد معلوم کر لیا۔ ”مسافر“ ”سپاہی“ ”جنگ آرن“ اور ”بنگال“ ان کے اچھے خاصے کام یاب گیت ہیں۔ ”سپاہی“ میں بلند تر ذہنی شاعری کا پیرایہ اظہار ایسے سیدھے سادے الفاظ ہیں کہ عالم کی طرح ان پڑھ سپاہی بھی محسوس کرتا ہو کہ ساری کائنات، اس لڑائی کو خوف و عبرت سے دیکھتی ہو، جو غلامی کے لیے لڑی جائے لیکن اس لڑائی سے ہم دردی رکھتی ہو جو مسادات اور آزادی کے لیے ہو۔

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے  
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے  
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہو  
سُرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

حانے والے سپاہی سے پوچھو

وہ کہاں جا رہا ہو

لیکن جو لڑائی مسادات اور آزادی کے لیے ہو، اس سے ساری کائنات ہم ددوی رکھتی ہو۔

رگ رہا ہو سپاہی کا ڈیرا

ہو رہا ہو میری جاں سویرا

او دطن چھوڑ کر جانے والے

کھل گیا انقلابی پھریرا

”جنگ آزادی“ مخدوم کا سب سے جوشیلا گیت ہو، جس کا کورس یہ ہو۔

یہ جنگ ہو جنگِ آزادی      آزادی کے پرچم کے تلے  
ہم ہند کے رہنے والوں کی      محکوموں کی مجبوروں کی  
آزادی کے متوالوں کی      دھقانوں کی مزدوروں کی

لیکن اس جنگ کی بنیاد قوم پرستی نہیں، بین الاقوامیت ہو سہ

سارا سنسار ہمارا ہو      پورب، پچھم، اُتر دکن  
ہم افرنگی، ہم امریکی      ہم چینی جاں بازانِ وطن  
ہم سرخ سپاہی، ظلم شکن      آہن پیکر، فولاد بدن

اسی طرح ”بنگال“ کا کورس ایک ایسے ہندوستانی اتحاد کی تعلیم دیتا ہو، جس میں تمام سیاسی جماعتوں کو  
بیلے ایک دوسرے کی مخالفت کے، ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اس کے لیے بڑی بے نقصان،  
وسیع نظری اور بے لوث ہم دردی کی ضرورت ہو سہ

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم  
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم  
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم  
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

گیت کے کورس میں اس خیال کی بڑی اہمیت ہو، کیوں کہ یہ اس طرح عوام کے دل تک پہنچ سکتا  
ہو۔

مخدوم محی الدین کے یہاں ایک طرح کی انقلابی طنز نگاری بھی ہو سہ

او خداے دو جہاں، او وہ جوہر اک دل میں ہو      دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہو  
کوڑھ کے دھتے مچھا سکتا نہیں ملبوس دیں      بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

مخدوم محی الدین کے انقلابی محاکات اور شبیہات میں ایک ایسی پُر جوش ندرت ہو جو مشرقی اور  
مغربی تشبیہوں کے امتزاج کا نتیجہ ہو۔ یہ تشبیہیں سبھی کبھی ایک آدھ شعر میں وہ سب کہہ جاتی ہیں

جر کی تشریح میں صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے۔ ۷  
 جھڑپکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھ  
 دہشت کی تصویر کھینچنے میں شاعر کو کمال حاصل ہے۔ ۶  
 ملک الموت کے پہرے کا تبسم دیکھو

دور سے

جن کے وطن کچلے ہوئے، جن کی تنہا پائمال جھانکتا ہو جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال  
 کبھی کبھی ان کی تشبیہیں دیکھی، مگر اپنی اندرونی حقیقت کی وجہ سے بڑی سچی ہوتی ہیں ۶  
 خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال  
 اثر استعارے ایسے ہیں، کہ پوری کائنات ان کا پس منظر بن جاتی ہے، اور اس پس منظر سے پس ماندہ  
 انسان ۱۹۸۰ء اور زیادہ نمایاں ہوتا ہے

فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے جزیروں میں زمیں کے درد کو اذپر بٹلا رہا ہے قمر  
 اُداس رات ہے، افلاس ہے، غلامی ہے کفن سے مُٹھ کو بچالے ڈار رہا ہے قمر  
 ر. ر. مخدور، کی یہ غیر مرئی تصویر ملاحظہ ہو ۷

دنتر خواجگی، رُوح غارت گری موت کی ہم سفر، مرگھٹوں کی پری  
 اعضا اوقات ان تشبیہوں کے پیچھے علمی دنیا کا پس منظر ہوتا ہے، مثلاً یہ مصرع، جس میں آزادی گفتار  
 کے فقدان کی مثال دی گئی ہے، عبرانی اور یونانی علم الاصنام کی یاد دلاتا ہے۔ اور تصویر کیسی دل فریب  
 ہے۔ ۷

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے گلوں زہہ میں پیوست تیر ہیں کب سے  
 یہی انقلابی استعارے اور شبیہیں، محمد مکی الدین کی انقلابی رمزیت کا راستہ کھولتی ہیں۔ ”اندھیرا“  
 اس کی بڑی اچھی مثال جو۔ یہ اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے، جہاں ہر چیز مانگی ہوئی ہے، اصلی مالک  
 سے حاصل کی ہوئی ہے

رات کے ہاتھ میں راک کا سہ درپوزہ گری  
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند  
بھیک کے ڈر میں، مانگے کے اُبالے میں گمن  
یہی بلنوس سڑسی ہو یہی ان کا کفن

اس کے بعد اس تمدن کے پیدا کیے ہوئے جنگ کی تصویریں ہیں، اور ایک تصویر بہت نئی اور  
دہشت ناک ہو ہے

لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے، اُس پار تک  
سرد ہوا

نوحہ و نالہ و فریاد گناں

یہاں تک کہ معاشی نظام کائنات بن کر پھر ماتم کرنے لگتا ہو ہے

پابند کے، تاروں کے ماتم کی صدا

رات کے ماتھے پہ آزدہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہو

”انقلاب“ میرے خیال میں مخدوم کی کام یاب ترین، اور سب سے زیادہ موثر نغم ہو۔ اس نظم میں

انقلاب اور عشق ایک ہو جاتے ہیں۔ سر راہ لوگ انقلاب کے نفیبِ اول کا اس طرح انتظار کر رہے

ہیں، گویا وہ کوئی معشوق ہو۔ اس کی آمد کا انتظار، عشقیہ انتظار ہو، عشق، شمن، نغمہ اور روحانی زندگی

کے تمام پُرانے معیار، اُس کی سواری کے گزرتے ہی خاک بسر ہو جائیں گے

اگر جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہو

ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہو

ہجومِ شوق سربہ گزار کب سے ہو

گزر بھی جا کہ ۱۲ انتظار کر

اس انتظار میں حسن پر مروفی سی چھا گئی ہو، جمادات لحد نباتات، دڑے اور بیڑل، ساری کائنات مغنوں

ہو

نہ تاب ناکِ رُخ ہو، نہ کاکلوں کا ہجوم

ہو دڑہ دڑہ پریشاں، کلی کلی منموم

ہو کُل جہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہو

”ہو دڑہ دڑہ پریشاں، کلی کلی منموم“ اس مصرع میں وہ درد دسوز ہو کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کسی غزل میں یہ مصرع شاید کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا، لیکن شاعر نے اُسے عشقیہ موضوع سے اٹھا کے انقلابی موضوع میں کچھ اس خوبی سے رکھ دیا ہو کہ اُس کا گداز وہ چند بڑھ گیا ہو۔

(۵)

## ترقی پسند افسانہ اور ناول

مضمون کی طوالت بڑھتی ہی جا رہی ہو۔ اس لیے ہم ترقی پسند افسانے اور ناول کا اس تفصیل سے مطالعہ نہ کر سکیں گے، جیسے ہم نے شاعری کا کیا تھا۔ اسی لیے ہم پریم چند کے متعلق بھی یہاں کچھ نہ لکھیں گے۔ سرسری طور پر ان کا ذکر کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہوگا کہ ہم آئندہ کسی اور موقع پر ان کی فن کاری کا مفصل مطالعہ کریں۔ پریم چند کا اپنے آخری زمانے میں ترقی پسند تحریک کی طرف مائل ہونا اس تحریک کی بڑی خوش قسمتی تھی اس سے ترقی پسند افسانے کو وہ بہت، حقیقت نگاری کی وہ صلاحیت نصیب ہوئی، جو آج اُسے ترقی پسند ادب کی سب سے کامیاب شاخ بنائے ہو۔ اگر ان کا افسانہ مثل راہ نہ ہوتا، تو بہت سے نوجوان اذراہ نگار — جو آج کامیاب اور مشہور ہیں — اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہوتے، اور تقلیدی اسالیب کی مقبولیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار کا ”لیلہ کے خطوط“ پہلا ترقی پسند ناول ہے، ناول کا اطلاق اس کتاب پر زرا مشکل ہی سے ہوتا ہے جو ”انشا پر دازی“ — پُرانے معنوں میں — سے قصے کا کام لیتی ہے قاضی صاحب نے ناول کی اس نوع کی پیردی کی ہے، جو اٹھارویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں بہت مقبول تھی اور ”خطوط کا ناول“ کہلاتی تھی۔ ”قصہ پن“ اور ”قصے کی تفصیلات زیادہ نہیں۔ اور مصنف کا یہ مقصد بھی نہیں ”مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا انشاء سمجھ کر پڑھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرن میں خراب آباد ہندستان کی نسوانی زندگی کے چند نفوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر اس بد نصیب ملک میں کچھ لوگ ان نفوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں۔“ اس مقصد میں اپنی سحر طرازی، اپنے ہمہ گیر طنز، اپنی فطرت شناسی کی وجہ سے مصنف کو غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ ان خطوط کے لکھنے والی ”لیلہ بنت لیلہ“، بنت لیلہ، پیشہ عصمت فروشی، وطن ہندستان — سمجھ دار، زرد فہم، چالاک، ذہین، شریر، بد معاش، حرافہ — ۲۲ برس کی بڑھیا کھوسٹ — ”کوئی معمولی بیوا نہیں۔ وہ ایک مجسم استعارہ ہے جس کے پردے میں ہندستان کی زخم خوردہ اور مظلوم نسوانیت نظر آتی ہے۔“

لیکن ان خطوط میں دوداد کی بھی جھلک نظر آہی جاتی ہے۔ ”ہم کہیں جارہے ہیں، ریل کا اسٹیشن ہے، میرے والد کے ساتھ ایک خوش رو جوان ہے، مردانہ حسن کی ایک تصویر، جو ہنوز مکمل نہ ہوئی تھی۔ یہ میرا منگیتر ہے، جس کے ساتھ میری جوانی، میرا بڑھاپا گورنا چاہیے تھا! میں اس کی طرت نیچی نگاہوں سے اس طرح دیکھ رہی ہوں کہ گویا دیکھ نہیں رہی۔۔۔۔۔۔ پھر ایک ۲۲ سالہ جوان رعنا اس دریچے کے سامنے سے گزرا — یہ میرا پہلا مرد ہے جس نے مجھے عورت بنایا مگر بیوی نہ بنایا۔ جس نے مجھے میری شاخ سے چُن کر چند روز گلے کا ہار بنایا، پھر مسل کر بدر رو میں پھینک دیا۔ جس ظالم نے میری دوشیزگی کو دہاں پہنچا دیا، جہاں اب تم دیکھ رہے ہو، جس نے

۱۹۳۵ء کے خطوط“ پر میرا تبصرہ ”دُرد“ اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اور اب مجھے اس تبصرے میں کچھ نقائص نظر آتے ہیں۔ اس حصے میں میں نے اس تبصرے سے کافی استفادہ کیا ہے۔

مجھے اب وہ بنادیا جو میں اب نظر آتی ہوں۔“

رفتہ رفتہ لیلہ کی میسائی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے، جس کو قاضی صاحب کے سحرکار قلم نے ہزار طریقوں سے ظاہر کیا ہے۔ اُس کی شخصیت اتنی مکمل ہو جاتی ہے، اُس کی داخلیت پر دُنیا، اور خصوصاً طرح طرح کے مردوں کے خارجی تجربوں کا ملمع ایسا چڑھ جاتا ہے، کہ وہ اس سوداگری کے عالم میں بھی تماشائی ہو کے ہندستان کے تمدن کا کھیل دیکھتی ہے۔ اور طنز، گہرے چُھتے ہوئے طنز سے اُسے محسوس اور بیان کرتی ہے۔ سینکڑوں قسم کے مرد اُس کے تصویر خانے کی زینت ہیں ”ڈیڑھ سو گھوڑوں کی طاقت“ والے عاشق۔ ”سور کی طرح سر جھکا کر سیدھا حملہ“ کرنے والے عاشق۔ اخبار نویس، طلسم ہوش رُبا پڑھنے والے، گل زاہد داغ پڑھ پڑھ کر رونے والے، مولانا، لیڈر، افلاطونی، دوست، بھانت بھانت کے مرد جو اس کے خلوت خانے میں نہ صرف اپنے جسم، بلکہ اپنی دُوح کی ساری گندگی، سارے سطحی پن، ساری بھوک، ساری خود غرضی کو عریاں کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری اختلافات کے باوجود، بیسوا سے اُن کا رشتہ ایک ہی ہے۔ بکتے ہوئے حُسن کی قیمت وصول کرنا۔ بس کو وہ عشق کہتے ہیں وہ ایک غزل ہے، جس کا مقطع وہی خلوت بے ناموس ہے! جب وہ میرے پہلو میں آکر بیٹھتے ہیں، اور بسور بسور کر سوز و گداز عشق کا حال بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں دین مرتا ہوں، میں تم پر جان دیتا ہوں، مجھے جیسی تم سے محبت ہو ایسی تو کبھی کسی سے نہیں ہوئی، تم میری دل و جان کی مالک ہو۔ تم بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا، دین دل میں ہنستی ہوں اور کن آنکھیوں سے دیکھتی ہوں کہ اس اظہارِ التفات بے پایاں کے ساتھ اب وہ میری طرف کھسکتے آتے ہیں۔ اس عالم بے اختیاری میں اُن کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف آتا ہے، اُن کا سر میرے شانے کی طرف، اُن کا دُوسرا ہاتھ میری کمر کی جانب رہیں اندازہ کر لیتی ہوں، کہ غزل کا مقطع قریب ہے۔ پھر چند روز ان کا عشق گرم رہتا ہے۔ تا اُن کے ہوس کا اشارہ کسی دُوسری جانب ہوتا ہے اور میرے باسی بوسوں کی تھکن وہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ کسی دن وہ غائب ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی میری طرف نہیں آتے، کبھی سُن لیتی ہوں

کہ اب اُن کے عشقی سمندر بادیا کی باگ کسی دوسری طرف پھر گئی ہو۔“

لیلہ اپنے ایک مجنون کی سلسلہ الحاح و زاری کے بعد آہستہ آہستہ محبت میں گرفتار ہونے لگتی ہو۔ مگر وہ ہوس پرستی اور ہوس ناکی کی اس قدر عادی ہو گئی ہو کہ اس سچی محبت کے جذبے کو ایک خطرناک اور نقصان رساں کم زوری سمجھ کے وہ اپنے عاشق کو چھوڑ کے چلی جاتی ہو۔ اور سال بھر تک دونوں میں خط و کتابت نہیں ہوتی۔ اس دوران میں وہ اپنے آپ کو اور بھی زیادہ بے احتیاطی سے، ایک مجنونانہ جذبے کے ساتھ، سفلی تعیش میں غرق کر دیتی ہو یہاں تک کہ اس کی شباب کی تازگی رخصت ہونے لگتی ہو۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ جب اُس کا عاشق بہت بیمار تھا وہ اُس کی تیمارداری کرتی ہو۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ ایک نئی زندگی کا خواب دیکھنے لگتی ہو۔

”چند روز اس نئی دُنیا میں مجھے دم لینے دے جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں۔ اس دیرانے کو آباد ہونے دو۔ مجرموں سے میرے انتقام کا وہ وقت آئے گا جب میں بیوی اور ماں بن کے بغاوت کا علم بلند کروں گی۔“

میسواؤں کے متعلق اس سے پہلے بھی اُردو میں اچھے اچھے ناول لکھے جا چکے تھے، جیسے ”امراؤ جان ادا“ یا وہ بے مثل قصہ جس کا ترجمہ سجاد حسین کسمندوی نے ”نشر“ کے نام سے کیا تھا۔ ان دونوں ناولوں میں خارجی حقیقت نگاری ”لیلہ کے خطوط“ سے زیادہ ہو۔ امراؤ جان اور خانم جان کے کردار قاضی صاحب کی لیلہ کے مقابل زیادہ انفرادی ہیں، خارجی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن ان پرانے ناولوں میں میسوا کے وجود کو بلا احتجاج تسلیم کر لیا گیا ہو، تو بہ کی بھی گنجائش تھی گئی ہو۔ قاضی صاحب کی لیلہ اس پیشے کی باطنی حقیقت ہو، اور وہ ایک انقلابی علم بلند کرتی ہو۔ اُس کی انفرادیت کے نقوش نمایاں نہ سہی لیکن وہ قاضی صاحب کی ڈیوٹی ما (Diotima) ہو، اُن کا شمار اسی کے شعبے سے لوثا ہو۔ یوں تو انھوں نے مشرق اور مغرب کے بہت سے ”مخفیانے“ دیکھے ہیں، لیکن اس ناول میں ان کے تجربے نے مستقبل کی طرف قدم بڑھایا ہو۔

”لیلہ کے خطوط“ پڑھ کے ایک اور خیال آتا ہو اور وہ یہ کہ کاش قاضی صاحب ”مجنون کی



ڈاڑی" اور "تین پیسے کی چھوڑی" اور اس قسم کی اور کتابیں نہ لکھتے۔

"انگارے" کے مصنفین میں احمد علی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے دہلی کی قدیم رجعت پسند زندگی اور اُس کے مشغلوں، خصوصاً کبوتر بازی کی بہت اچھی تصویریں کھینچی ہیں۔ کبوتر بازی کے سلسلے میں اچھی خاصی کردار نگاری کا بھی موقع مل جاتا ہے جیسے "اُستاد شتو خاں" ان کا ایک بڑا دل چسپ افسانہ "موٹر لاری کا سفر" ہے، جس کا ڈھکا ہوا مگر بے پناہ طنز، ہندوستانی سلیج کی جنسی بھوک کی تصویر بڑی نزاکت اور لطافت سے کھینچتا ہے۔ "انگارے" میں بھی بہترین افسانے احمد علی ہی کے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ احمد علی صاحب کے وہ افسانے جو "انگارے" یا "شعلے" میں شائع ہوئے ہیں، ترقی پسند تحریک، اور ترقی پسند افسانے کی تعمیر کے ابتدائی دور کے ہیں۔ اس لیے اگر ترتیب و ترکیب یا تکنیک میں کچھ خامیاں ہیں، یا اگر اُس میں دقت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے افسانے کے فنی توازن پر اثر پڑتا ہے، تو یہ سب کم زوریاں قابل معافی ہیں۔ احمد علی صاحب کا ایک ناول *Twilight in Delhi* انگریزی میں شائع ہوا ہے، اور انگلستان کے چوٹی کے ناول نگاروں مثلاً *ورجینا وولف* اور ای ایم فارسٹر نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ فارسٹر نے اپنے مشہور ناول "سفیر ہند" کے جدید ترین ایڈیشن (۱۹۹۷ء) میں اپنے ایک تازہ نوٹ میں ان کے اس ناول کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کا ذکر ہم نے یہاں اس لیے کیا کہ اُس کا اسلوب اُس پرانے طرز کے اردو ناول کا ہے، جو پریم چند سے پہلے بہت مقبول تھا، جس میں لا تعداد اشعار، قصے اور عمل کی مدد کرتے تھے۔ احمد علی کی ذہانت اور صلاحیت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اردو کو ان کی بہت ضرورت ہے، اور اردو میں ان کی شہرت انگریزی کے مقابل محدود ہے، مگر بہت زیادہ پاسے دار ہوگی۔

سجاد ظہیر نے لندن کے ہندوستانی طلبہ و زندگی کے شعلق ایک چھوٹا سا ناول "لندن کی ایک

رات ” لکھا ہو۔ شروع میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سیاسی اور معاشی تعلقات اور نئی معاشی تحریکوں پر بحثیں ہیں، پھر ناچ کے ایک جلسے کا حال ہو، پھر سوٹزر لینڈ کے رومان بھڑے ناول میں ایک ہندوستانی لڑکے اور انگریز لڑکی کے عشق کا ایک چھوٹا سا خاکہ ہو۔ اس خلع کی بنا پر یہ تصنیف ناول ہونے کا دعوا شاید ہی کر سکتی اور مصنف نے اپنے تمہیدی نوٹ میں لکھ بھی دیا ہے کہ اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔ کتاب کا آخری حصہ دل چسپ ہے۔ نعیم کا کردار۔ اس کتاب کی کامیاب ترین پیش کش ہے۔ وہ اُن سست طالب علموں میں سے ہے، جن کی بڑی یہ ہے ”آخر۔ تمھاری تھیسس کب ختم ہوگی“ نعیم کی تھیسس کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ ساہبا سال تک آتش دان کے پاس بیٹھا ناول پڑھتا رہے گا۔ ہندوستانی طالب علم اُسے پسند کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ بلا ڈگری لیے ہندستان واپس جانے کا زمانہ آجائے گا۔

پریم چند کی روایات کی سب سے زیادہ نگہداشت ادپندر ناتھ اشک نے کی ہے، اور اپنے لیے موضوع اور بیان کے نئے راستے بھی تلاش کیے ہیں۔ پریم چند کی طرح انھیں بھی سچے متوہط طبقے کے مصائب، مسائل، خرابیاں، بے ہودگیاں، پریشا۔ بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔ پریم چند کی طرح ان کے افسانوں میں بھی ایک طرح کا ضبط اور ٹھیراؤ ہے، اگرچہ کہ بعض نئے افسانوں — مثلاً ”ترغیب گناہ“ ”چٹان“ اور ”اُبال“ میں انھوں نے اس ٹھیراؤ کو گوارا نہیں کیا ہے، یہ شاید ترقی پسند افسانوں کے اس رجحان — جنس کے نفسیاتی مطالعے — کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے۔ عموماً ادپندر ناتھ اشک جو لکھتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کے۔ اسی وجہ سے نہ ان کے یہاں رقت انگیزی ہے، نہ تحریبی افراط۔

افسانے کے ”فن“ کی طرف وہ بہت توجہ کرتے ہیں جیسا کہ ”کونپل“ کے مقدمے سے ظاہر ہے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ افسانہ نگار ”ایک کامیاب مقرر کی طرح پھلے ہی فقرے سے ناظر کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھائے، اپنے ناظر کی دل چسپی

میں اضافہ کرتا جائے۔ حتاکہ کلائمکس پر پہنچ کر وہ اس طرح افسانے کو ختم کر دے کہ جو اثر ۵۰ اپنے ناظر پر ڈالنا چاہتا ہو، وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے۔ ”ادبِ درنا تھ“ کو ان افسانوں پر اعتراض ہو جن میں ”افسانویت“ کم ہوتی ہو۔ پلاٹ کے مکمل اور قرین قیاس ہونے پر وہ بہت مصر ہیں۔ اور پلاٹ کی بے ترتیب روانی انہیں پسند نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ زندگی کے پلاٹ کی روانی بے ترتیب بھی ہوتی ہو۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ افسانے کا مقصد بڑی اہمیت رکھتا ہو، اور واقعے کی حقیقت کو بھی بشرطِ ضرورت مقصد پر قربان کیا جاسکتا ہو۔ ”فن“ پر انھوں نے ہر افسانے میں کافی توجہ کی ہو، اسی وجہ سے ان کے افسانے کی ابتدا اُس کی اُٹھان، اور اُس کا خاتمہ سب ایک ترتیب کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ پابندی افسانے کے داخلی مقصد میں حارج نہیں ہوتی، بلکہ اُس کے نقوش کو اور زیادہ واضح کرتی ہو۔

اس کی وجہ یہ ہو کہ ادبِ درنا تھ اشک کے بہت سے افسانوں میں بڑی داخلیت ہو۔ پڑھنے والا محسوس کرتا ہو کہ وہ یا تو افسانہ نگار کی آپ بیتی، یا اُس کے احساسات کا مرقع، یا اُس کے گہرے مشاہدے کی چیز پڑھ رہا ہو۔ مثلاً ”یہ انسان“ کی داخلیت سے کون انکار کر سکتا ہو۔ ادبِ درنا تھ اشک کا ایک محبوب داخلی موضوع ایک آرٹسٹ کی ایک کالج کی لڑکی سے ناکام محبت ہو۔ یہ ان کے ناول ”ستاروں کے کھیل“ کا موضوع ہو۔ گہری داخلیت کے ساتھ ”ناسور“، ”ہارجیت“، ”شاعر کی شکست“ کا بھی یہی موضوع ہو، اور صاف معلوم ہوتا ہو کہ اس کی بنیاد مصنف کے کسی ذاتی تجربے یا احساس پر ہو۔

بچے متوسط طبقے میں جنسی عدم مساوات اور طبعوں کے مقابل زیادہ نمایاں ہو۔ کیوں کہ اس طبقے میں بیوی معاشی طور پر شوہر کی زیادہ محتاج ہوتی ہو۔ یعنی نہ وہ مزدور عورت کی طرح خود اپنا پیٹ پالنے کی کوشش کر سکتی ہو، نہ اعلیٰ طبقوں کی طرح تعلیم یا رُپی کی وجہ سے اس کی محتاجی کم ہوتی ہو۔ اس بچے متوسط طبقے میں عورت کی عدم مساوات، اُس کی تشنگی، اُس کی بے بسی، اور اُس کے شاذ و نادر انتقام کی تصویریں ادبِ درنا تھ اشک نے کئی افسانوں میں کھینچی ہیں مثلاً ”کونپل“

”نقص“ ”چٹان“ ”چٹن کی باں“ وغیرہ۔ ادبِ نثر ناتھ اشک نے اس طبقے کی سماجی نفسیات کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا ہے، یا کم از کم اس کے مشاہدے کا اثر ان پر اچھا خاصا گہرا ہے۔ اگرچہ کہ بنیادی طور پر وہ اس طبقے کے افسانہ نگار ہیں لیکن مزدور طبقے کے مصائب کے متعلق انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی بڑا درد اور غلوں ہے، اور سستی رقت انگیزی بہت کم۔ ان میں طبقاتی کشمکش بھی نظر آتی ہے، اور انفرادی نفسیات کا لطیف اور طنز آمیز مطالعہ بھی۔ ایسے افسانوں میں ”وہ میری منگیتر تھی“ ”تین سو چوبیس“ اور ”کاکڑاں کا تیلی“ بہت دلچسپ ہیں۔ ”کاکڑاں کا تیلی“ واقعہ نگاری کا شاہ کار ہے۔ طبقاتی تفاوت کا جنسی پہلو ”ابال“ میں نظر آتا ہے۔ ادبِ نثر ناتھ اشک کے نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم بلند، اور وسیع ہے۔ ”ترقی پسندی مجھے مرغوب ہے۔ لیکن افسانے میں یہ ترقی پسندی کسی مزدور یا کسان یا میسوا، یا کسی دوسرے پسماندہ شخص کا قدمے غریاں نقشہ پیش کر دینے تک ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ اور نہ افسانے میں دو چار دیدہ و دانستہ لکھی ہوئی گالیاں یا کراہت پیدا کرنے والے مناظر کا ذکر اسے ترقی پسند بنانا ہے۔ درحقیقت کسی افسانے کا ترقی پسند یا رجعت پسند ہونا مصنف کے اپنے نقطہ نظر پر منحصر ہے جسے سامنے رکھ کر وہ افسانہ لکھتا ہے یا جو اس کے افسانے سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔“

ادبِ نثر ناتھ اشک میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ آرٹ اور ترتیب پر بہت زیادہ دھیان کرنے کی وجہ سے ان کے یہاں وہ جوش اور روانی نہیں جو بندشوں کو توڑ دیتی ہے۔ اس سے قطع نظر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ادبِ نثر ناتھ اشک جدید دور کے دو یا تین بہترین افسانہ نگاروں میں ہیں۔

---

دیوبند ستیارتھی کے افسانوں پر افسانے، یا قصے کا انطباق محض اس حد تک ہو سکتا ہے، کہ وہ ان گیتوں کا جدید پس منظر بن جاتے ہیں، جو ہندوستان میں صدیوں سے گائے جاتے رہے ہیں۔ ان کے اکثر و بیش تر ”افسانے“ ان کی خانہ بدوش زندگی کے واقعات ہیں۔ جن کو اپنے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے انھوں نے گیتوں کی سماجی، معاشی یا دارالدینی کیفیتوں کو نمایاں

کرنے ۔۔ لیے ایک طرح کا افسانوی رنگ دیا ہو۔ جاہِ جاؤن کی ذاتی رائے، یا سفر کے معمولی معمولی تاثرات، ان واقعات کو شخصی رنگ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں واقعے میں سچی افسانویت بھی ہوتی ہو جیسے ”برہم چاری“ یا ”میری زندگی کا ایک درق“ کبھی ایک یا کئی گیت ریل کے خود ایک افسانہ سناتے ہیں، جس کی جڑیں سینکڑوں سال پُرانی ہیں، اور جس سے کئی شاخیں پھوٹ چکی ہیں، جیسے ”تین گیت“، ”مامونٹی“، ”لاچی“ وغیرہ۔ آپ بیتیوں میں بھی جیسے ”دیا جلع ساری رات“

دیویندر ستیا رتھی کی ان تصنیفوں کو افسانہ کہہ لیجیے یا مضمون، لیکن یہ ان گیتوں کی وجہ سے جن کے لیے یہ ایک طرح کی ’زیریں عمارت‘ کا کام دیتے ہیں، ’اُردو‘ میں یہ یادگار رہیں گے۔ ان کی وجہ سے گیت، اُن کا ماحول، اُن کے تعمیری اسباب زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ اور اُن کے جانچنے کے لیے افسانوی معیار مقرر کرنا غلطی ہوگی۔ وہ بجائے خود ایک نئی صنفِ ادب ہیں، جس میں افسانہ، واقعہ، سفرنامہ، تبصرہ، تحقیق سب باہم ریل جُل کے ایک ہو گئے ہیں۔

تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں، جتنا کرشن چندر کا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث، باغلوں انسانیت ہے، جو اُن کی ہر تحریر سے مترشح ہے۔ اسی پر ان کے تحیل، اور اُن کے فن کی بنیاد ہے۔ اس انسانیت کی وجہ سے ان کی ترقی پسندی کبھی دل آزادی نہیں کرتی۔ وہ دلوں میں اُتر کے اپنا کام کر جاتی ہو، سب کو متاثر کرتی ہو، لیکن کسی کا دل نہیں دکھاتی۔ یہ خصوصیت ترقی پسند ادیبوں میں شاید ہی اور کسی میں پائی جاتی ہو۔ یہ ایک خداداد نعمت ہے۔ ایک طرح کی بے غرض نفسیاتی کیفیت ہے۔

اس انسانیت، اس انسان پرستی کی وجہ سے کرشن چندر کے دل میں مظلوم انسان سے سچی ہم دہدی ہے۔ اس ہم دہدی کی بنیاد ایک طرح کی رومانیت، اور فطرت پرستی پر ہے۔ اسی وجہ سے وہ مزدور مرد سے زیادہ مزدور عورت کے افسانہ نگار ہیں۔ مزدور عورت کی بدقسمتی ہندستان میں دُہری ہو ایک تو طبقاتی اور دوسرے جنسی۔ اُن کا محبوب ترین موضوع سرمایہ دار ہوس پر تاحار عورت کی

قربانی ہو۔ اس موضوع پر انھوں نے بیسیوں افسانے لکھے ہیں ، اور اس کی جدت اور اس کا تنوع ختم ہونے میں نہیں آیا۔ کیوں کہ ان میں سے ہر افسانے کا پس منظر مختلف ہوتا ہو۔ اس طرح ”جنت اور جہنم“ ”بند والی“ ”سفید پھول“ ”ٹوٹے ہوئے تارے“ ”اندھا چھترپتی“ اور اس قسم کے کئی اور افسانے عورت کے جسم کی فروخت ، اودھ اس کی رُوح اور اُس کے دل کی تباہی اور بربادی کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں فطرت ان بد نصیبوں سے ہم دردی کرتی ہو۔ مناظر فطرت کا سُن ، اور انسان کی یہ تباہ کاریاں ، ایک ایسا تضاد پیش کرتی ہیں ، جن کو کرشن چندر کی مسافر نظر اور اُن کا سحر طراز قلم بہت اچھی طرح دیکھتا اور بیان کرتا ہو۔ یہ فروخت اور تباہی صرف مرد و عورتوں تک محدود نہیں ، یہ کرشن چندر کے نزدیک ہندوستانی کی طبقاتی کش مکش ، ہندستان کے مہاجنی نظام کی بدترین لعنت ہو۔ ”شکت“ سے معلوم ہوتا ہو کہ اس قسم کا کوئی تلخ تجربہ یا احساں اس موضوع کی تہ میں کارفرما ہو۔ ”شکت“ ہی میں انھوں نے ہندوستان کی عورت کے متعلق یہ بے مثل فقرہ لکھا ہو :-

”رام اور لکشمی گنڈ دن کے اُجیلے میں تھے ، لیکن سیتا گنڈ پر رات کی ہولناک تاریکی مسلط تھی۔ اور اُسے سیتا ، دھرتی کی بیٹی کے آخری دن یاد آئے۔ وہ چودہ سال اپنے خاندان کے ہم راہ جنگلوں میں گھومتی رہی تھی۔ وہ ایک ظالم راجا کے پُنگل میں پھنس کر لٹکا کے ایک باغ میں اپنی عصمت کو بچاتی ہوئی پرہ کے دن کاٹتی رہی تھی ، اور جب وہ برہ کے دن پورے ہوئے ، اور وہ بن باس ختم ہو گیا ، تو مسرت کے چند مختصر ایام کے بعد ایک جاہل دھوبی کے کہنے پر اس کی زندگی میں پھر ایک نیا بن باس شروع ہوا ، نیا ، آخری ، ابدی۔ وہ بن باس جو ایک دفعہ شروع ہو کر پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ اسی لیے تو سیتا گنڈ تاریک ہو ، خاموش ہو ، اُداس ہو ، اُتھا ہو۔ شام کو احساس ہوا کہ جیسے اس گنڈ میں صرف سیتا کے ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستانی سماج کی عورتوں کے آنسو چھلک رہے ہیں جن کی زندگیاں صدیوں سے تاریک ، خاموش اور اُداس ہیں ، اور شام کو اپنے احساس کی تلخی میں یہ بالکل مناسب معلوم ہوا کہ سیتا گنڈ سب سے نیچے بنایا گیا تھا۔ نیلے آسمان کے مسرت بھرے نور سے دُور ، ایک چٹان کی سنگلاخ چھاتی میں ، چادروں پتھروں کی دیواروں کے بیچ۔ یہاں روشنی کسی درزیں سے

گزر کر بھی نہ پہنچتی تھی یہی ہندستانی عورت کی صبح جگہ ہو۔ سب کے نیچے، قدموں میں۔“

ہندستانی عورت کی اس مظلومیت کا، کرشن چندر کی انقلابی رومانیت نے رنگا رنگ اسالیب میں اظہار کیا ہو، جہلم میں ناؤ پر ایک نامعلوم عورت کے پہرے پر بے پناہ غم اور اُداسی، دُور کی جھیل میں ایک ڈوٹنگ چلائے والی، ایک بیچہ کی ماں، جس کا شوہر تماشِ معاش میں اُسے بے آسرا چھوڑ کے بدیس چلا گیا ہو، اور وہ اپنے آپ کو پانچ روپے کے عوض بیچ ڈالتی ہو، پہاڑی عورتیں جو امیروں کے ہاتھ بچی جاتی ہیں، پڑھی لکھی عورتیں جن کی مرضی کے خلاف شادیاں کی جاتی ہیں، اور ان کے معصوم دل توڑ دیے جاتے ہیں، ان کی خاموش زبانیں، اور گرم گرم آنسو۔ ”شکت“ کے کردار بیسے دختی اور چندرا، یہ سب اس انقلابی رومانیت کے شاہ کار ہیں۔ ”موٹر کے آگے اور پیچھے، چیلر اور دیودار کے گھنے اور سبز جنگلوں کے درمیان، چاندی کے تار کی طرح پکتی ہوئی پکٹی سڑک پھیلتی جا رہی ہو ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک، ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک، ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک، یہ دہی نقرئی تار ہو جس نے انسانوں کے دل تاریک کر دیے ہیں، عورتوں کی عصمتیں ویران کر ڈالی ہیں۔ اور سماج کی روح کو آتشک کے جہنم میں جھلس دیا ہو۔“

اس انقلابی رومانیت کی تہ میں ایک طرح کی انفرادیت، ایک رومانی شکستگی اور تشنگی بھی ہو، جو کرشن چندر کے نقطہ نظر پر حاوی ہو۔۔۔ شاید ضرورت سے زیادہ حاوی ہو۔ ابھی وہ اپنے ذہنی نشوونما کے رومانی دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ابھی سے انھوں نے اُردو افسانے میں وہ جگہ حاصل کر لی ہو، بس کہ پریم چند نے سو اور کسی نے حاصل نہیں کیا تھا۔ ان کا افسانہ پریم چند کے افسانے سے بہت زیادہ آزاد ہو۔ وہ ابتدا۔ درمیانی حصہ، انتہا کے پوارے لشیب و فراز کی پابندی بہت کم کرتا ہو۔ بہت کم وہ پیشہ ور افسانہ نگاروں کے افسانوں کی طرح اُٹھان یا کلائمکس کی طرف توجہ داتا ہو قدرت، مناظر فطرت اور مصنف کی انفرادی نظر کے بوا وہ کسی اور قید کا پابند نہیں۔ اس میں زندگی کی سی آزادی ہو۔ کرشن چندر کے سحر نگار قلم پر اس کی

بنیاد ہے، اُس کا پس منظر کشمیر کے بلند پہاڑ، پنجاب اور ہندستان کے شہر اور اُس کا ہیرو تباہ حال، مظلوم، لٹتا ہوا انسان ہے۔ اُس کا نقطہ نظر ہم دردی، طنز، تشریح ہے۔ اُس کا موضوع انسان ہے اور فطرت - بدلیب انسان، حسین قدرتی مناظر میں ریگتا ہوا کیڑا، جس کو اپنی نوع کو نقصان پہنچانے، اپنی نوع کا ذن چوسنے کے سوا کسی اور کام میں لطف نہیں آتا۔ جو اس حسین، بادقعت، مہاں نواز، پتچی اور کھڑی فطرت کی نہ تسخیر کرتا ہے نہ تقلید۔

منظر کشی میں کرشن چندر کا مقابلہ اردو کا کوئی اور نثر نگار نہیں کر سکتا۔ کسی ادیب یا شاعر نے کشمیر کے پہاڑوں، داویوں، چشموں، ندیوں، جھیلوں، مرغ زاموں، قصبوں اور دیہاتوں کی ایسی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہوں گی۔ مناظر قدرت کرشن چندر کی نگاہ کو وہ وسعت اور وہ معیار عطا کرتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ انسان کو اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اس سے اور زیادہ ہم دردی کر سکتا ہے۔ اکثر انسانے منظر کشی کے شاہ کار ہیں۔

”وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف بھل گیا، آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فز زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی ٹنگی میں ایک عجیب سی تازگی تھی، اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حُسن۔ کیکر اور تیشو کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے سینے ابھی تک پیپ پیپ کیے جاتے تھے، در کوئی نامعلوم پرندہ کونڈہ، کونڈو رٹ رہا تھا۔ ہیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹلاے ابھی سو رہے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدور کے مندر ٹھکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر آگ، ہوئی گھاس، نیلے نیلے بیجوں اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر دُور کہیں اُس نے رہٹ کے چلنے کو، دوں روں سنی اور پورب میں حدائق پر روشنی کی کیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔“

”تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا، اور بجلی کے پُر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے ایک جہتی منظر تھا جس میں بادلوں کی گرج، ہوا کی دھنیاں جھینیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے دھنیاں تہقے سٹائی دیتے تھے۔“

کرشن چندر کے آرٹ کی طرح ان کی منظر نگاری کا کمال بھی ان کے ناول ”شکت“ ہی میں دیکھنے میں



سمتا ہے۔ ماندر ندی، جو گاؤ کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ تین چٹنے جن کے نام ”چھوہارا“، ”بادام“ اور ”موتی چور“ تھے۔ ”موتی چور اور باقی دونوں چشموں کا پانی ریل کر کھیتوں سے بہتا ہوا ماندر میں جا گرتا تھا۔ یہاں منہ کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور دو پن پکیاں۔ منہ کے درختوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے، اور اس جھنڈ کے سارے میں دہر کے وقت گڈریے اپنے ریڑوں سمیت سویا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب ترنگ آتی تو پروا نہیں پیٹنگ بڑھاتیں اور منہ کی شاخوں کو چھونے کی کوشش کرتیں۔ گڈریے گھنٹوں تک پانی میں کھڑے ہاتھوں سے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے۔“

منظر نگاری ”شکست“ کے پڑے قصبے کو ایک ایسا دل فریب دہمانی رنگ دیتی ہو کر گویا اس میں قدرت کی نیا کی زندگی کا رس اور نور بھر دیتی ہو۔ لیکن ”شکست“ اس سے بہت زیادہ ہو۔ غالباً وہ دُرد کا بہترین ناول ہو۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ کرشن چندر ناول میں افسانے سے بھی زیادہ کام یاب ہوں گے۔ بشرطہ کہ وہ اس کی طرف اور توجہ کریں۔ اس ناول میں شیام، ایک کشمیری تحصیل دار کا بیٹا اور کالج کا طالب علم، مصنف کی شخصیت، اس کی رومانیت، اس کے بننے ہوئے سیاسی عقیدے اس کی بے تسبی، اور اس کے ذہنی اور نفسی انقلاب کی ترجمانی کرتا ہو۔ ناول میں دو عشقیہ سلسلے ہیں۔ ایک کا شیام خود ہیرو ہو، اور اس کی محبوبہ دُتی، ایک ایسی عورت کی لڑکی ہو، جس کے جنسی کردار کو گاؤ کے پنڈت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ لیکن پنڈت سری کشن اپنے اپناج، بد صورت لڑکے درگا داس کی شادی دُتی سے کرنا چاہتے ہیں، اور اسی لیے اس کے ماموں کو رشوت دیتے ہیں۔ دوسرا عشقیہ سلسلہ ایک نیم برہمن، نیم چار لڑکی چندرا اور ایک چھتری نوجوان مہن، سنگھ کی باہمی کشش کا ہو۔ اس سلسلے میں شیام ایک حساس ناظر، اور ہم درد دوست ہو۔ مہن سنگھ کو شکار میں ایک جنگلی سورنی زخمی کر دیتی ہو، وہ اچھا ہوتا ہو تو دیکھتا ہو کہ پنڈت جی کے بھائی صاحب اس کی مجاہد کی عصمت کے دہلی ہیں، ان پر وہ قاتلانہ حملہ کر کے گرفتار ہوتا ہو، پڑا، نہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں، اور وہ ”رجاتا ہو۔“ دوسرے دُتی کا بیواہ درگا داس سے ہو جاتا ہو۔ جب بیواہ ہوئے لگتا ہو، تو اس کی ماں روکنا چاہتی ہو۔ لیکن دُتی کے ماموں کو تو رشوت دی گئی تھی وہ اُسے ایک کمرے میں بند کر دیتا ہو، اور وہ گرفتار لڑکی طرح ہندستانی عورت

ہونے کی وجہ سے بے بس ہو کے پھڑپھڑاتی ہو۔ ”اردوئی کی دیواریں سب کچھ جانتی ہیں، حرکت کرنا نہیں جانتیں، وہ قید کر سکتی ہیں، لیکن راستہ نہیں دے سکتیں، وہ پناہ دے سکتی ہیں، لیکن آزادی نہیں“۔  
 دنتی کی درگاہ داس سے شادی ہوگئی اور شام کی ماں نے مجبور کر کے کسی اور لڑکی سے شام کی نسبت ٹھیرائی۔ شام کے شگن کے دن دنتی کی جینے کی طاقت، زندگی کی قوتِ ارادی ایک سخت ختم ہوگئی۔ اُس کی موت کا منظر اردو نثر کے زندہ بادیہ شاہ کالوں میں شمار ہوگا:-

”اور اس کی سہیلیاں زور زور سے چلانے لگیں۔“ دنتی۔ دنتی۔ لیکن دنتی وہاں نہ تھی، وہ دُور بہت دُور چلی گئی تھی، اور ایک لافانی گلیشیر کی گہرائیوں میں سا گئی تھی۔ اور گو انھوں نے بہت شور مچایا، اور اس کے ہاتھ پاؤں سے، اور اُس کے سرد رخساروں سے اپنے گرم گرم ہو سے رواں دواں گال چھوئے، لیکن نہ دنتی کی گھنی پلکوں پر کوئی لرزش ہوئی، نہ اس کے لبوں کے کونے کانپے، نہ اُس کے تھنوں سے زندگی کا لطیف سانس پیدا ہوا۔ وہ ایک برف کی صورت کی طرح اس شہوت کے تنے کے نیچے پڑی تھی، اور ڈال ڈال پات پات ہرے ہرے توتے چلتا رہے تھے۔ دنتی اُٹھ، دنتی جاگ، دنتی آج تیرے محبوب کا شگن ہو، دیکھ دھند پہاڑوں پر پھیل رہی ہو، سورج کا سونا ندی کی آنکھوں میں چمک رہا ہو۔ تیری سہیلیوں کے دلوں میں محبت کے گیت رُکے ہوئے ہیں۔ اُٹھ پیاری دنتی، لاجنتی، چھوئی موی ایسی نازک شربیلی، کنواری اُٹھ، دیکھ تیرے محبوب کے ماتھے پر شگن کا سرخ ٹیکا چمک رہا ہو اور تیری مانگ سہاگ کے سینہ دُر سے رچی ہوئی ہو۔ اُٹھ پیاری دنتی، دیکھ دُنیا کتنی خوب صورت ہو۔ شہوت کے پیڑ پر گلجانی قمری شہوت لے لے آویزوں کی طرح لٹک رہے ہیں، اور پہاڑوں پر دھند، محبوب کے نازک گدازلس کی طرح پھیلتی جا رہی ہو۔ . . . . .

اور گو توتے دیر تک چلاتے رہے، اور اُس کی سہیلیاں دیر تک شور مچاتی رہیں، حتاکہ بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے، اور گو کائنات اسی طرح خوب صورت تھی، اور نیلے آسمان پر ستمبر کے بادل شہزادے اپنا لباسِ فاخرہ جس میں دھند کا ریشم اور کرنوں کے سنہری تار گندھے ہوئے تھے، پہن کر خراماں خراماں گزر رہے تھے، لیکن دنتی کو فرصتِ نظارہ کہاں تھی۔ اُس نے کسی کی طرف پلک اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور چُپ چاپ برف کے گلیشیر کی طرف بڑھتی گئی۔“  
 اس ناول میں کردار نگاری بھی بہت اچھی ہو۔ چھایا، نوران، چندرا، سب میں اور خصوصیت سے

چندرا میں بڑی انفرادیت ہے۔ مام دیو کا کردار دگلیوں، اور اپنی انسانیت دونوں کی وجہ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تھانے دار یار محمد پیسے کی نہیں، عورت کے جسم کی رشوت چاہتا ہے۔ اور موہن سنگھ وہ غیور راج پوت ہو شاید چندرا کے بعد اس ناول کا سب سے جیالا کردار ہے۔ علی جو ایک ہندو ریاست کا چھوٹا سا مسلمان عہدہ دار، جس کا اصلی اور سچا ہم درد ہندو تحصیل دار کا بیٹا شیام ہے، اور جو علی جو سے سیاسیات پر بحث کرتا ہے، اور قدامت پرستی کی جگہ انسانی اشتراکیت، اور اس بے تعصبی کے اصول سمجھاتا ہے جو اس ناول کی جان ہیں۔

کرشن چندر کا طرزِ تحریر اردو افسانوی ادب میں ایک نئی اور بڑی ہی لطیف اور انوکھی چیز ہے۔ اس میں کہیں لفاظی نہیں، کہیں طوالت نہیں۔ اس طرزِ تحریر کی کامیابی کی بنیاد انسان کی داخلی ضروریات اور فطرت کے خارجی اظہارات کی ہم آہنگی پر ہے۔ اسی ہم آہنگی سے کرشن چندر کے اسلوب میں وہ انقلابی رمزیت پیدا ہو گئی ہے، جو ان کی تحریر کی جان ہے۔ فطرت کا احساس چوں کہ شعور انسانی کی حدود میں اچھی طرح جذب ہو کے نمایاں ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے اظہار کے لیے نئی تشبیہیں، نئے نئے خطوطِ متوازی تلاش کرتا ہے۔ رومانیت اور انسان پرستی نے اس طرزِ تحریر کو لطیف اور ہاذب بنا دیا ہے۔ اُس میں سختی یا کرخنگی کم ہے، اور اگر اُس کی ضرورت ہو تو طنزیہ خدمت انجام دیتا ہے۔ طنز جو دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ اس طنز سے انسان کی غلط روی، اور فطرت کی دل کشی کے احساس کا تضاد اور زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کرشن چندر اس طرف گئے رہے تو شاید ایک دن ان کا مرتبہ پریم چند سے بھی بڑھ جائے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوگی اور رومانیت کو کسی قدر دبانا بھی پڑے گا۔ انقلابی رومانیت سے جتنا کام لینا تھا وہ لے چکے، اب زرا آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اچھی بے لوث واقعیت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ یہ واقعیت قطعی نہیں، اسے رومانیت، اور نتیجہ خیز فحشیت کا امتزاج حاصل ہے۔ ”گرہن“ کے پیش لفظ میں خود بیدی صاحب

نے لکھا ہے: ”مجھے تخیلی فن پر یقین ہو۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہو تو میں اُسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہو، اُسے احاطہ تحریر میں لانے کی سہی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہارِ حقیقت کے لیے ایک رومانی نقطہ نظر کی ضرورت ہو۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے اندازے کے متعلق سوچنا بجائے خود کسی حد تک ایک رومانی طرزِ عمل ہو اور اس اعتبار سے مطلق حقیقت نگاری بحیثیت فن غیر موزوں ہو۔“

بیدی کے پہلے مجموعے ”دائے دوام“ کے افسانے ترقی پسند ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہو۔ متداول روایات کی ایک زیریں لہر ان افسانوں کو ہندستان کی ہزار ہا سال زندگی کا ایک پر تو بناتی ہو، جس کا نقطہ نظر اب بدل گیا ہو۔ اس طرح ”بھولا“ ایک بیوہ ماں کا بچہ، اپنے بوڑھے نانا سے دن کو کہانی سنتا ہو، جس کی وجہ سے کوئی مسافر راستہ بھٹک جاتا ہو۔ بھولا خود کھو جاتا ہو، لیکن رات کو شمع جلائے وہ اپنے ماموں کو لانے گیا تھا، جو راستہ بھٹک گیا تھا، اور گئی رات تک نہ آیا تھا۔ دیہاتی زندگی میں یہ متداول روایات بڑی ہی رومانی چاشنی رکھتی ہیں۔ ایک بھولے بھالے بچے نے اپنی ماں سے سوال کیا کہ میں کہاں سے آیا۔ ماں کے پاس بہت سے روایتی جواب ہیں، جن میں سے ایک بہت دل چپ ہو: ”تمہارا باپ ایک سو بیالیس گھنٹیوں والا جال لے کر رام تلای یا شاہ بلور کے جوڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا، صرف جوئیں تھیں۔ ایک ننھا سا میٹک عمرو جولاہے کے گھر کے سامنے روٹی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی غشی میں گارہا تھا، وہ تمہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔“ یا ”منگل اشٹکا“ میں سماجی اور مذہبی امن و سکون قائم رکھنے کا یہ فلسفہ پنڈت نے سنایا: ”سکری جو تیر مارنا چاہتا تھا، اُسے جانوروں نے اپدیش دیا۔“

- |                                |                        |
|--------------------------------|------------------------|
| ۱۰۔ بکریوں کا مارنا برابر ہو   | ایک بیل مارنے کے       |
| ۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہو   | ایک براہمن کو مارنے کے |
| ۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہو | ایک استری کو مارنے کے  |

۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہو ایک گریہ وقتی (حاملہ) استری کو مارنے کے

۱۰۱ گریہ وقتی استریوں کا مارنا برابر ہو ایک گائے مارنے کے . . .

بیدگی کے انسانوں کا ماحول دیہاتی زندگی ہو۔ اس کے مسائل، اس کی گندی معاشرت، اس کے مصائب بیان کرنے میں کوئی اور ترقی پسند ادیب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بچلے متوسط طبقے کی زندگی، جو ہمیشہ تنہا ہی کے غار پر ایک دھاگے سے لٹکی ہوتی ہو، اُن کے افسانوں میں اپنے پورے انسانی درد اور دہشت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ اس کا انھوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا ہو، اسے بھگتا ہو اور اس کی تکلیف کو محسوس کیا ہو۔ ”بھولا“ کی ماں کی ولی اذیت میں اس کی جھلک ہو۔ بچلے متوسط طبقے کی خانگی زندگی کا نقشہ شاید ہی کسی نے ایسا اچھا کھینچا ہو۔ اس کا کام یاب ترین نمونہ شاید ”گرم کوٹ“ ہو۔ اس افسانے میں محبت، اور معاشی حاجت مندی کی وہ تمام زنجیریں، وہ تمام کڑیاں نمایاں ہیں جو ایک غریب متوسط درجے کے خاندان کے اذاد کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے لیے قربانی کرنا چاہتا ہو، پر مجز بچوں کے جو ابھی اچھی طرح دُنیا کے مصائب اور مسائل کو نہیں سمجھتے اور مٹھائی اور کھلونوں کے لیے جائز طور پر ضد کرتے ہیں، اور ان کی ماں جو ڈرتی ہو کہ اگر اُس کے خاندان کو گرم کوٹ نصیب نہ ہوا تو شاید اُسے کچھ ہو جائے اور فاقوں کی نوبت آجائے، اپنی ضد کرنے والی بچی کے منہ پر درد سے ایک تھپڑ لگاتی ہو۔ اس خاندان کے لیے دس روپے کے نوٹ کا گم ہو جانا ایک قیامت صغرا ہو، جس کے غم میں خاندان کے سردار کو خودکشی کا کچھ خیال سا آتا ہو، مگر اس موسم میں رادی کا پانی گھسنے گھسنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا کیوں کہ سارا پانی تو اوپر سے اوپر بادی دُوب لے لیتی ہو۔ اس افسانے میں متوسط طبقے کی ہندوستانی بیوی کی پتی محبت اور ہم دردی کی تصویر ہو، ایک خاندان کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ جذبات، احساسات، ضروریات، معاشی دشواریوں، محبت اور قربانی کی ایک دُنیا آباد ہو۔

”چھوکر کی لوٹ“ میں خوشیاں اور اُمگلیں ایک طرف ہیں، جو سماج کی رسموں میں جھانکتی ہیں، تو دوسری طرف طنز اور تلخی ہو۔ ”غلامی“ پوسٹ آفس کے ایک کلرک کی نفسیات، اور اس کی

گھریلو زندگی کے پس منظر کا بڑا ہی دلکش مطالعہ ہے۔ غلامی بھی ایک عادت ہوتی ہے جو کسی طرح نہیں چھوٹی، ساری عمر پوسٹ آفس کا کام کر کے یہ کلرک پنشن پاتا ہے لیکن بیٹوں، بہوؤں، پوتوں میں اسے مسرت نہیں ملتی، پھر وہ ایک چھوٹے سے پوسٹ آفس میں نوکری کر لیتا ہے، اس کو دمہ ہے اور وہ مارے تکلیف کے لوٹتا ہے، مگر اُسے جو کٹف آفس کی غلامی میں ہے، وہ کسی اور کام میں نہیں مل سکتا۔ ”آلو“ میں ایک نوجوان کی اشتراکی تصوراتیت اور اس کے بال بچوں کی بھوک کا تقابل ہے۔ چھکڑوں سے وہ بچے کچھے آلو چُن کے جیب میں ڈال لیا کرتا تھا اور اُس کی بیوی، اس کی بچی کامریڈ انھی آلوں کو اُبال کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی، مگر اس اشتراکی نے گاڑی بانوں کو ہڑتال کرنے کی تحریک میں مدد دی، ہڑتال ہوئی اور رزق کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس لکھی سنگھ کے بچے جن کو ماں دن بھر یہ کہہ کے بہلا رہی تھی کہ شام کو باپ آلو لے کے آئے گا، بلک رہے تھے، اور جب باپ خالی ہاتھ آیا تو بچہ اور زور زور سے روتے لگا، لکھی سنگھ کی بیوی اس پر برس پڑی تو نوجوان اشتراکی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ ”کیا بسنتو رجعت پسند ہو گئی ہے۔“

بچے طبقے کی زندگی کے نقشے بھی انھوں نے بڑی خوبی سے کھینچے ہیں، اگرچہ کہ ایسے افسانے لکھنے میں ان کا نقطہ نظر اور طرزِ تحریر اس طبقے سے باہر کے آدمی کا سا ہوتا ہے۔ ”من کی من میں“ ”دس منٹ بارش میں“، ”لچھن“، ”گرہن“، ”رحمان کے جوتے“، ”ہڈیاں اور پھول“ اور ”لادوے“ اس قسم کے اچھے افسانوں میں سے ہیں۔ ”لچھن“ میں بڑے طنز سے اس افسانے کے زرا عجیب اور مضحکہ خیز سے ہیرو کے کردار اور اس کی نفسیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کی نفسیات کی تہ میں ایک رومانی عشق ہے، جس میں چتا کی آگ کے سوا کہیں کامیابی نہیں۔ ”گرہن“ گھریلو زندگی میں اس اجنبی لڑکی کی مصیبت کی داستان ہے جو بہو بن کے آتی ہے، کالیاتھوں کو چار بچے دیتی ہے، وہ نہ نباب جادی تھی نہ سرچھ جادی۔ اسی لیے وہ ایک متکار شرابی کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اس افسانے پر چاند گرہن کا پس منظر اپنی پوری ہیبت کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ ”رحمان کے جوتے“ میں زندگی

کا طنز ہے۔ ”ہڈیاں اور پھول“ میں شک اور محبت اور بیماری کی لعنت ہے جو گھریلو زندگی کے شکوک و گمان کی طرح کھا جاتی ہے۔ اور شک اور رشک کبھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرتا۔ ”لاروے“ اس قسم کے افسانوں میں سب سے زیادہ تلخ ہے۔ غریب اور گندے بچے طبقے کے انسانوں اور کیڑوں اور مکوڑوں کی زندگی میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں غلاظت میں پیدا ہوتے، اور پلتے ہیں، اور غلاظت سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔

بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تمنی، اور اس کی مصیبتوں کے ساتھ تھوڑا سا وہ لطف بھی ہے، جو ان مصائب میں امید کی ہلکی سی روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ لطف محبت اور ہم دہی کا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے بچے متوسط طبقے، اور مزدور اور کسان کی زندگی قابل برداشت ہے۔

بیدی کے پاس طنز ہے، لیکن ظرافت یا ہنسی بالکل نہیں۔ طنز چُھتا ہوا، سخت اور ناخوش گوار ہے۔ قصور زندگی کا ہے۔ اس کے ہوا بیدی صاحب کی زبان بھی زرا غلطیاں کر جاتی ہے، لیکن یہ غلطیاں ان کے محاسن کے آگے بیچ معلوم ہوتی ہیں۔

علی عباس حسینی ترقی پسند افسانہ نگاروں میں بڑی اچھی جگہ کے ستی ہیں۔ ان کا رجحان قطعی انقلابی نہیں، لیکن اصلاحی ضرور ہے ان کے نقطہ نظر میں انسانیت دوستی اور قوم پرستی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر اردو میں ایک بڑا موثر افسانہ ”ایک ماں کے دو بچے“ ان کے شاہکاروں میں ہے۔ اس افسانے میں نفرت سے محبت کا، اور دشمنی سے برادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے، وہاٹ وے کی دکان سے ایک مسلمان کچھ خرید کے بھٹکتا ہے، ایک ٹیکسی والے کو آواز دیتا ہے، جب ٹیکسی میں بیٹھ جاتا ہے تو ایک ہندو جو اندر چھپا بیٹھا ہے اُس کی گردن پر پھری تاننا ہے۔ گاڑی ایک خاموش جگہ جاتی ہے۔ مسلمان ہندو سے پوچھتا ہے کہ تم میرے خون کے پیاسے کیوں ہو؟ ہندو کہتا ہے کہ اُس کا بیٹا اپنے چھ ماہ کے بچے کے لیے غذا لینے کو نکلا ہی تھا کہ مسلمانوں نے اُسے مار ڈالا۔ ہائے انھی پھوٹی آنکھوں کے سامنے میرے بالک کے سر سے بھیجا بہ گیا اور میں

کھڑا ہاتھ ہی ملتا رہ گیا۔ اب اس ظلم کے بعد تم کیسے امید رکھتے ہو کہ میں اپنے بس میں لانے کے بعد کسی مسلمان کو زندہ چھوڑ دوں گا؟“ یہ سن کے مسلمان اس سے صرف ایک خواہش اور کرتا ہوا: ”بابا تم سے صرف اتنی تمنا ہے کہ مجھے مارنے کے بعد جب تم یہاں مجھے پے گور و کفن چھوڑ جانا تو ذرا تکلیف کر کے ڈکریا اسٹریٹ کے مسلم ہوٹل میں نمبر ۲۸ کے کمرے تک چلے جانا، وہاں تم کو دو لاشیں ملیں گی۔ ایک میرے نوجوان بیٹے کی۔ اور دوسری میری سال بھر کی بیٹھی بیٹی کی! ہوٹل والے کو یہ میرا بڑا دین وہ ان کے دفن کا سامان کر دے گا۔ لیکن بھائیو! وہیں میری بیٹی کے پہلو میں اُس کا تین دن کا نوہال سسکتا ملے گا۔ اُسے یہ لمن فوڈ پیٹ بھر کے کھلا دینا۔ اُس کے بعد اسی چھڑے سے جس سے ابھی مجھے ذبح کرنے والے ہو، اس کو بھی مار ڈالنا۔“ غلام ہو کہ اس کے بعد بھائی کو بھائی پر پیار کیسے نہ آتا۔ جونت راس اس شیخ سعید سے پٹ کیا ہے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ دونوں جا کے شیخ سعید کے نواسے کو بد وقت تمام لے آئے۔ جونت راس نے شیخ سعید سے ان کا نواسا لے کر اپنی سڑکی گود میں دسے دیا اور بولے۔

”ہو ایک مسلمان نے تیری مانگ کا سیندھ چھینا اور تیری چوٹیاں ٹھنڈی کر دیں! دوسرے نے تیرے جیسے ہوئے دل پر پھایا رکھا اور اپنے لختِ جگر سے تیری بھری گود اور بھردی! لے یہ تیرا دوسرا بچہ ہو جس کے دو دو بچے ہوں اس کو شوہر کا غم کیوں ہو“ بھارت ماتا کی طرح اس دیوی نے ان دونوں بچوں کو سینے سے لگا لیا اور چپکے سے بولی ”یہ میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں۔ جب ان میں سے ایک پھوٹی تو میں کافی ٹھیری، اور جب دونوں تو بالکل اندھی“ ————— انی طرح ہندو سمن اتحاد کے موضوع پر عباس حسینی نے اور بھی کئی افسانے لکھے ہیں جیسے ”لوٹھا اور بالارا“ اور ”دیش اور دھرم“ یہ افسانے دیہاتوں کی زندگی میں ایسے ہوئے ہیں، اور ان کا موضوع فرقہ پرستی کے بصوت کے سامنے انفرادی رفاقت اور دوستی کی فریاد اور قربانی ہو۔

یو۔ پی کی دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں علی عباس حسینی کو کمال حاصل ہو۔ دیہاتی زندگی کی مصروفیتوں، اس کی صعوبتوں، اُس کی خوشیوں اور اس کی پریشانیوں کو وہ بڑی خوبی سے بیان کرنے ہیں۔ نفسِ قصہ کی حد تک وہ تخیل، اور جذبات کے تجاذب کو اس کا پورا موقع دیتے ہیں کہ وہ



داتے کو دیہاتی زندگی کے عام نقوش میں واضح اور نمایاں کر کے دکھائیں۔ ”بہو کی ہنسی“ جذبات کے تجاویز اور اس ہسٹریا اور خواہش کی کہانی ہے جو اپنی اور دوسروں کی جان لیتا ہے۔ بعد کے افسانوں میں ترقی پسند تصویریت، دیہاتی زندگی کے مسائل کو ایک نئی روشنی میں پیش کرتی ہے جیسے ”عدالت“ جس کا موضوع ایک غریب لڑکی کو پھسلا کے دغا دینا، اور پھر اس لڑکی کا خوف ناک رومانی انقلاب ہے۔ ”شکاریا شکاری“ میں دیہاتیوں کی مصیبتوں کا ذکر ہے۔ جس کا کم سے کم خراج انسانی ہم دردی ہے۔ لیکن ”حق نمک“ اس قسم کے افسانوں میں اپنے درد، اپنی واقعتاً اور اپنی معاشی معنی نیزی کی وجہ سے بہت ممتاز ہے۔ جس میں ایک کم سن زر خرید لوکر، چھوٹے سے پانچ امیر زادے کی جان بچانے کے لیے — جس کی خدمت کے لیے وہ نوکر تھا — اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے، اور مرنے کے بعد جب اُس کے مالک اس کی اتنی تعریف کر دیتے ہیں کہ ”مرتے مرنے حق نمک ادا کر گیا“ تو ٹھکرائن تنک کے کہتی ہیں ہونہ! اچھا کیوں نہ ہوتا! چھو برس کی جان کے لیے مٹھی بھر پیہ نہیں دیا تھا۔“

چرنولی کی زندگی کے متعلق علی عباس حسینی نے دو بہت دل چسپ افسانے لکھے ہیں۔ دونوں کا موضوع محبت، نفرت، خود غرضی، اور تعصب ہیں۔ ”سکھی“ کا موضوع دو نوجوان چارنوں کی دوستی ہے۔ جو اس دنیا میں ان دونوں کو اس نہیں آئی۔ تفصیلات کے بیان میں مصنف نے اس غضب کا جوہر دکھایا ہے کہ ان چاروں کی جیتی جاگتی زندگی نظر میں پھر جاتی ہے۔ ”آم کا پھل“ ایک باہمت چور اور ایک بانگی لیکن بدنام اور مطعون چارن کی کامیاب محبت کی داستان ہے۔ دیہاتی زندگی کے مصائب ہی علی عباس حسینی کے پیش نظر نہیں۔ اس کے دل کی محبت بھری دھڑکن، اُس کی خوشیاں، اُس کا سہاگ، یہ سب اُنھوں نے دیکھا ہے۔ ”جھولا“ کا موضوع اس زندگی کی وہ تھوڑی بہت مسرت ہے، جو شوہر کی محبت میں ملتی ہے۔ ساس نندوں کی لڑائیاں اور گھر بھر کا کام کاج اور برہ کی آگ کے بعد شوہر کے تدموں کی پہچانی ہوئی آہٹ آتی ہے۔ اب دیہاتی دلھن کا جھولا پڑ گیا۔ وہ روٹھے موئے سیان کو مناتی ہے۔

ہندو اور مسلمان متوسط طبقے، اور زمینداروں وغیرہ کے متعلق بھی علی عباس حسینی نے اچھے خاصے

افسانے لکھے ہیں۔ کبھی کبھی وہ پُرانی قدروں کی حمایت بھی کر جاتے ہیں ، جیسے ”نہرو عشق“ میں ہمدے کی حمایت۔ لیکن یہ افسانے جو ۱۹۳۳ء میں پہلی بار شائع ہوئے تھے ، ترقی پسند تحریک سے بہت پیچھے لکھے گئے تھے۔ کہیں ”سنیائی“ یعنی ضرورت سے زیادہ خوش آئند اور کامیاب محبت کے قصبے بھی ہیں جیسے ”سو بیگم“ ، ”گونگہ بری“ وغیرہ۔ مگر علی عباس حسینی کو متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی زندگی ، اور خصوصیت سے عشقیہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں یدِ طولا حاصل ہے۔ ”باسی پھول“ اور ”انسپکٹر کی عید“ اس قسم کے بہت اچھے افسانے ہیں۔ ”باسی پھول“ میں عشق چلن ، لذت دیدار اور اقربا محبت سے آگے نہیں بڑھتا لیکن دلوں کو گھٹن کی طرح گھما جاتا ہے۔ لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو جاتی ہے ، اس کا شوہر مرجاتا ہے ، اور اس کا پہلا پرستار آخر تک اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے۔ آخر میں اپنی محبت کا پھل پاتا ہے۔ یہ پاکیزہ محبت کی کہانی ہے ، جس کی تہ میں سچا خلوص ہے۔ ”انسپکٹر کی عید“ بنتِ عم سے دالہانہ محبت کی داستان ہے ، جس کو ایک متوسط مسلمان گھرانے کا معاشی اُتار چڑھاؤ ، اور طبائع کا اختلاف متاثر کرتا رہتا ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں تنہائی ایک خاص موضوع ہے۔ اس کا بہترین اظہار ”تار بابو“ میں ہوتا ہے ، جو ایک مکڑی کو اپنی محبوبہ کی طرح رکھتا ہے ، اور جب ایک حسین لڑکی اس کی تنہائی پر ترس کھا کے اُس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے تو کہتی ہے: ”آپ کو راج رانی (مکڑی) کو بھگانا پڑے گا۔ مجھے سوکن نہیں پسند“

ان کے اکثر افسانے ایک طرح کے شاعرانہ انصاف پر ختم ہوتے ہیں۔ اگرچہ کہ جرم کے بعد وہ عقوبت کے ضرور قائل ہیں۔ لیکن مصیبت کے بعد اپنے کرداروں کو خوش دیکھ کے اور خوش کر کے انھیں دلی مسرت ہوتی ہے۔ کاش فطرت بھی اسی اصول کی پیروی کرے۔

مجھے خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ ”فیصلہ“ ، ”ایک لڑکی“ اور ”ناگن“ کی روایت مریضانہ ہے۔ ”سرکشی“ کی قسم کے افسانوں سے بجائے

فائدے کے، اور زیادہ مخالفت، اس لیے اور زیادہ نقصان کی توقع ہو۔ ”تین عورتیں“ اور ”معمار“ البتہ انقلابی اور انسانی تصویریت کی وجہ سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے یقیناً دل چپ ہیں۔ اس دل چپی کا بڑا سبب ان کی تکنیک ہے۔ انسانوں کا انجام غیر متوقع ہوتا ہے، اور ناظر افسانہ ختم کر کے تعجب میں کھوسا جاتا ہے۔ یہ امریکی افسانہ نگاری کا بڑا کام یاب اصول ہے۔ اور ہنری نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس اصول کو برتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے موضوعات میں غضب کا تنوع ہے۔ اکثر ہمیشہ تر فسانوں کی بنیاد ان کے مشاہدات پر ہے۔ دوستوں کی نفسیات، انڈین کرپشن حورتوں اور رنڈیوں کی نفسیات، اور ان کی زندگی اور خواہشات کے متعلق ظلم کمپنیوں کے شب و روز کے متعلق، اور اپنے تجربوں اور خواہشوں کی بنیاد پر انھوں نے بکثرت افسانے لکھے ہیں۔ شہری زندگی ان کا اصلی موضوع ہے۔ انھوں نے..... کی ایک آدمہ لڑکی اور بیگیا شیرو کی مالکہ سے عشق کی مریضانہ حکایات بھی لکھی ہیں۔ لیکن صرف ایک کہانی ”نامکمل تحریر“ میں صحت مند، آزاد، اور زندگی بخشے والا عشق نظر آتا ہے۔ ورنہ جنس کا ظلم جس میں ان کا شعور اور لاشعور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے، حد درجہ مریضانہ ہے۔ انھوں نے عنفوان شباب کے متعلق بہت سے افسانے لکھے ہیں جن کو اکثر ترقی پسند ادیب گھناؤنے بتاتے ہیں۔ ”دھنواں“ ”پچھایا“ اور ”بلاؤز“ میں واقعہ نگاری کے سوا کچھ نہیں۔ وہ واقعہ جو زندگی پر صحت مند اثر نہ ڈالے قدرت کا ایک فعل عبث ہے اور اس کا ذکر نہ صرف تسبیح اوقات ہے، بلکہ انسانی سہودی کے لیے نمر بھی ہے۔ ”دھنواں“ کسی کچی لکڑی کا دھنواں نہ سہی، لیکن میرے خیال میں یہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کو اچھی طرح مہضم نہ کر سکنے کی وجہ سے پینہمی کی ڈکار ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی ساجی نقطہ نظر سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہیے۔ لیکن اس خامی کو وضع کرنے کے لیے ایسے ترغیب انگیز افسانے لکھنا، جن کو پڑھ کے بھی بچے جنس کو اور زیادہ مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطہ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔ جنس نے سعادت حسن منٹو کے

یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہو ”کیور والا سائیں“ جو افسانے کی حیثیت سے بہت دل چسپ ہو، جنس کی طاقت کو ایک مذہبی رمز کی طرح پیش کرتا ہو۔ عظیم بیگ چغتائی کی طرح — اور ان کی ظرفیت کے بغیر — منٹو صاحب نے لڑکیوں سے نوک جھونک کے افسانے بھی لکھے ہیں جیسے ”چوہے وان“ اور اس کا اور میرا انتقام“ کہیں کہیں منٹو کے یہاں قابلِ قدر محبت کے افسانے بھی ملتے ہیں جیسے ”بانجھ“ جس میں واقعے اور تخیل کا درمیانی پردہ اٹھ گیا ہو، اور طبقاتی کشمکش سے ابھر کے محبت اپنی آزادی کا حق منوائے قریان ہو جاتی ہو۔ یا ”شو شو“ جس میں لڑکیوں کا الٹ پن اور تخیل اور ایک لڑکی کے اٹھتے ہوئے احساسات کا بڑا اچھا تجزیہ ہو۔ کاش منٹو صاحب جنس کے متعلق ایسے افسانے لکھیں جن کو پڑھ کے کچھ فائدہ ہو، لوگ خور کریں، اور سوچیں۔ ورنہ مرلینا جنس پرستی سے بڑھ کے ایک ایسے سماج کا اور کوئی دشمن نہیں، جو انقلاب کا خواہاں ہو۔ کرتن چندر کے افسانوں کی آزادی چاہنے والی، کھلی ہوئی ہوا میں پردان چڑھنے والی محبت کے تصور کا مقابلہ جب کوئی منٹو کی رعبانہ محبت کے تصور سے کرتا ہو، تو محبت کے انقلابی تصور، اور جنس پرستی کا فرق سمجھ میں آتا ہو۔

جس مصنف کے ذہن یرجنس چھائی ہو، جنون بھی اُس سے زیادہ دور نہیں رہتا لائرس اور مویاساں کی مثالوں سے یہ ظاہر ہو۔ جنون سعادت سن منٹو کا دوسرا محبوب موضوع ہو ”اُس کا پتی“ میں ہم درد کو جنون ہو جاتا ہو، ”نفرہ“ میں نفرہ لگانے والے کو۔ انیسویں تو یہ ہو کہ منٹو کا انقلابی ہیرو بھی، بجائے اس کے کہ سبھے ہوئے عمل سے محنت اور کوشش سے، تبلیغ سے، ملک کو کوئی فائدہ پہنچائے، بالعموم اپنے جوش جنون میں پاگل خانے یا مرگھٹ پہنچتا ہو کاتس وہ قید خانے پہنچتا۔ قربانی کا صحیح راستہ ان کے انقلابی کو نہیں معلوم خواہ وہ منگو کوچان ہو یا سیم انقلابی یا گل زان سماج کی جو کیفیت منٹو کی سمجھ میں اچھی طرح آتی ہو وہ سماجی ہستیا ہو، جس کی بڑی اچھی مثال ”آلو“ کا پٹھا“ اور ”وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے“ میں ملتی ہو

نفس مضمون کی حد تک سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہو کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔ انسان اور انسان کی دوستی ہم دردی، رفاقت، محبت جس پر ہر

اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہو، ان کے یہاں نہیں ہو۔ جنسی محبت اور کشش کی محبت میں فرق نہیں (ملاحظہ ہو "فیرو")، انقلابی کو اگر جنون نہ ہو تو وہ خودکشی کا ارادہ ضرور کرتا ہو، دوست جمع ہوتے ہیں تو اس لیے کہ اپنے رجعت پسند مریضانہ احساسات کا اظہار کریں۔ منٹو صاحب اپنے ساتھی ترقی پسندوں سے بھی خوش نہیں۔ "دھنواں" کے پیش لفظ میں غالباً احمد علی اور رشید جہاں کی طرف اشارہ ہو۔ "ترقی پسند" جو ہجو کا شاہ کار ہو غالباً اردو ترقی پسند کے دو بہت بالا تر نمائندوں راجندر سنگھ بیدی اور دیوبندر ستیا رتھی کا مذاق اڑانے کے لیے لکھا گیا ہو۔

عصمت چغتائی کو ترقی پسندوں میں شمار کرنا، ترقی پسند ادیبوں کی محض سرپرستی اور خاتون پرستی ہو۔ ان کا رجحان سعادت حسن منٹو سے بھی زیادہ رجعت پسند اور مریضانہ ہو۔ ان کا یہ دعو کہ عورت اور مرد برابر ہیں، بالکل صحیح ہو لیکن اس آزادی کے ثبوت اور اظہار کے لیے وہ جو مضامین انتخاب فرماتی ہیں، وہ شاذ و نادر ہی کسی کو نے سے ترقی پسند معلوم ہوتے ہیں۔ یوں عصمت چغتائی میں بڑی صلاحیت ہو۔ اُن کے طرزِ تحریر میں نسوانیت ہو۔ یعنی وہ اس طرح لکھتی ہیں جیسے کوئی عورت اپنے نقطہ نظر سے لکھ رہی ہو ذہنی طور پر مرد بن کے نہ لکھ رہی ہو۔ اسلوب میں عورتوں کی چلتی ہوئی زبان کی سی روانی ہو، اور اس پر انگریزی تحریر کا جدت پسند اثر پڑا ہو۔ ان کا یہ دعو غلط سہی کہ متوسط درجے کی مسلمان لڑکی کا ذکر، انھوں نے اس طرح سے کیا ہو جیسے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے لیکن اُس کی نفسیات کو کبھی کبھی وہ اچھی طرح بیان کر سکتی ہیں جیسے "جھری میں سے"، "ساس" "پردے کے پیچھے سے"، "اُف یہ بچے" اور اس قسم کے چند افسانوں میں۔

اگر اُن کے نقطہ نظر میں صحت مندی ہوتی تو یہ اسلوب، متوسط طبقے کی لڑکی کی نفسیات کے حقیقی مطالعے کا انھیں اور زیادہ موقع دیتا۔ لیکن ایک طرح کی غیر معمولی نفسیاتی جنس پرستی نے اُن کے ذاتی نفسی احساس کو اتنا ابھارا ہو کہ وہ ساری دُنیا میں اپنے آپ ہی کو دیکھتی ہیں یا ساری دُنیا میں ایسی ہی چیزیں انھیں نظر آتی ہیں، جن کی سب سے بڑی قدر جنس کی بے راہ روی، گمراہی،

غلط روی ہو۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنی ہم جنس لڑکیوں کی پوری زندگی کے ہر پہلو کا معائنہ کرتیں، انہیں ہر طرف جنس ہی جنس نظر آتی ہو۔ جنس سے متعلق طرح طرح کے امکانات اُن کی نظر پر عادی ہیں۔ ”لحاف“ ”بھول بھلیاں“ ”جال“ اور اس قسم کے دوسرے افسانوں کی واقعیت سے انکار کرنا تو محض حماقت ہوگی، لیکن سوال یہ ہو کہ زندگی کی ان غلط کاریوں کو ان افسانوں میں کس طرح پیش کیا گیا ہو۔ اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں ہو۔ مزالے لے کے یہ رقصے لکھے گئے ہیں۔ ان کا انجام اور زیادہ گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہو۔ اگر عصمت چغتائی کو انہی حقائق سے زیادہ واقفیت تھی، تو انہیں کم سے کم ان واقعات کو اس طرح پیش کرنا چاہیے تھا کہ کراہت ترغیب پر غالب آئے۔ حقیقت نگاری کا اصلی مقصد زندگی کے نت نئے امکانات پیدا کرنا ہو، نہ کہ پُرانے رُخوں کو گریڈ گریڈ کر اُنہیں اور زیادہ سڑانا۔ اور وہ یہ بھول گئیں کہ عورت کی زندگی کی ایک بڑی حقیقت اس کا ماں ہونا بھی ہو۔

بعض اور افسانے جو عصمت چغتائی نے ترقی پسندوں کو خوش کرنے کے لیے لکھے ہیں، اُن میں اگر پروپاگنڈے کی قدر موجود ہو تو تفصیلی واقعیت باقی نہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں ”میرا بچہ“، ”ذرا اس کا علی عباس حسینی کے افسانے سے موازنہ کیجیے“ ”کافر“ اور ”خدمت نگار“ شامل ہیں۔ تفصیلی واقعیت کی کمی کی وجہ سے یہ افسانے وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے جو ان کا مقصد ہو۔

لیکن ان کے بعض افسانوں میں حقیقی ترقی پسندی بھی ہو، واقعہ نگاری بھی، اور اسلوب میں غضب کا جوش اور جدت بھی۔ اس قسم کے افسانوں میں سب سے اچھا ”جوانی“ ہو جو غالباً عصمت چغتائی کا سب سے مکمل، سب سے اچھا افسانہ ہو۔ اپنے مرحوم بھائی کو وہ مرنے کے بعد بھی اچھی طرح معاف نہ کر سکیں۔ غالباً عصمت کی جنس پرستی کی تہ میں کوئی شعوری یا لاشعوری خاندانی بھید ہو۔ اور انہوں نے ”باغی“ لکھ کے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا اُن پر اچھا خاصا اثر ہو جس کا نتیجہ ”پنکچر“ اور خصوصیت سے ”ایک شوہر کی خاطر“ جیسے کام یاب مزاحیہ افسانے میں ظاہر ہوتا ہو۔

اگر ان کی جنس پرستی میں زرا دھوک اور ٹھیراؤ پیدا ہو، زرا اور توازن ہو، اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو وہ ان کی اصلی جگہ پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں، تو یقین ہو کہ اپنی جدت پسند تحریر اپنی قوتِ مشاہدہ، اپنی بے جھجک جرات کی وجہ سے وہ درحقیقت اپنے لیے اُردو ادب میں جگہ پیدا کر سکیں گی۔

میں نے صرف چند اہم افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ بہت سوں کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کی تصانیف سے میں واقف تھا، لیکن طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہ کر سکا۔ ان سب سے میں معافی چاہتا ہوں۔

(۶)

## ترقی پسند ڈراما

اگر آل انڈیا ریڈیو کی سرپرستی نہ ہوتی تو شاید مختصر ڈرامے کی طرف ترقی پسند ادیب توجہ نہ کرتے۔ اس سرپرستی کی وجہ سے اُردو میں ریڈیائی ڈراما وجود میں آیا ہے۔ سب سے زیادہ ریڈیائی ڈرامے سعادت حسن منٹو نے لکھے ہیں۔ ’پیش لفظ‘ میں وہ لکھتے ہیں: ”میں چوں کہ اس میدان میں سب سے آگے ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ مبتدی اور غیر مبتدی ڈرامہ نویس دونوں میرے یہ پندرہ ڈرامے پڑھ کر مفید معلومات حاصل کریں گے۔ اور بھی اچھا ہوگا اگر یہ لوگ میرے ڈرامے ریڈیو پر بھی سنیں۔ اس سے وہ میرے محاسن اور اپنے عیوب اچھی طرح معلوم کر سکیں گے۔ میں اسی طریقے سے اپنے عیب معلوم کرتا رہا ہوں۔“

اس تعلیٰ کو پڑھنے سے جو اُمید ہوتی ہے، وہ ڈرامے پڑھ چکے کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ڈراموں کی ڈرامائی ترتیب اور پیرائے اظہار میں بڑی جدت ہے۔ جیسے ”انتظار“ اور ”کیا میں اندر آسکتا ہوں“ بعضوں میں لطیف رومانی ابہام ہے جس کی وجہ سے وہ

پراسرار معلوم ہوتے ہیں جیسے ”کبوتری“ اور ”اکیلی“ اور کم سے کم ایک افسانے میں پُرستعجاب انجام کی تکنیک کو انھوں نے کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ ”جیب کترا“ میں۔ لیکن ان کے سوا باقی تمام ڈراموں میں سطحیت ہے، اور تکنیک کے سوا کچھ اور نہیں۔ شاعر اور اس کی مجزبہ کے متعلق تین ڈرامے ہیں، ”نیلی رگیں“، ”ساڑھی“ اور ”نقش فریادی“ جن کی رومانیت بہت سستی ہے۔ ٹیڑھی لکیر“ ”جرنلسٹ“ ”مکہ فبرہ“ میں زندگی سے کوئی خاص مناسبت نہیں پائی جاتی۔ دو فائرس (مزاحیہ ڈرامے) البتہ غلیٹ ہیں۔ ”قانون کی حفاظت“ اور ”بیمار“ لیکن ”تین انگلیاں“ میں ترقی پسند ادیب جاسوسی پر اتر آیا ہے اور ”تحفہ“ میں اپنے پُرانے افسانوی موضوع رومانی جنون پر۔

کرشن چندر کے ڈراموں کا مجموعہ ”دروازہ“ پڑھ کر بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ کاش وہ ناول اور افسانے ہی میں لگے ہتے۔ اُن کے اکثر ڈراموں میں سطحیت اور سرسری رومانیت ہے۔ لیکن کم سے کم دو ڈرامے واقعی اچھے ہیں۔ ایک تو ”نیل کنڈھ“ جس میں شوہری اور پاربتی اکاش سے اتر کر دنیا پر اس ذلیل انسان کی خود غرض زندگی دیکھتے ہیں۔ بالآخر وہ ایک مندر پہنچتے ہیں جہاں ایک آوارہ سادھو پھٹے پُرانے کپڑے پہنے آگ جلائے بیٹھا ہے۔ پاربتی کو بھوک لگی ہے۔ آوارہ، ایک بدبودار سا روٹی کا ٹکڑا، جو ایک کتے نے سونگھ کر چھوڑ دیا، اور جسے آوارہ نے اپنے لیے اٹھا رکھا تھا۔ پاربتی کو یہ کہہ کے دیتا ہے کہ تمھاری بھوک میری بھوک سے زیادہ ہے۔ پاربتی اس بدبودار ٹکڑے کو لینے میں تامل کرتی ہیں تو شوہری کہتے ہیں ”یہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیا دیکھ رہی ہو۔ پاربتی! اسے سویکار کرلو۔ یہ ایک بدبودار روٹی کا ٹکڑا نہیں ہے۔ یہی وہ امرت ہے پاربتی، جس کی خاطر ہم نے ادب سب دیوتاؤں نے سمندر کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا تھا۔ یہی وہ جیون کا آخری بھید ہے جسے ایک آوارہ سادھو اپنے کلیجے سے چٹائے ہوئے ہے۔“ کرشن چندر کے ڈراموں میں اُن کے افسانوں کے مقابل خارجیت بہت زیادہ ہے۔ اُن کا دوسرا اچھا ڈراما ”سرائے کے باہر“ اس اصول سے مستثنیٰ ہے، اس پر اثر ڈرامے میں آوارہ شاعر کے کھلم میں انھوں نے اپنے لیے جگہ تلاش ہی کر لی ہے۔ یہ ڈراما اپنی حقیقت نگاری، اور اپنے اسلوب اور ترتیب کی وجہ سے بہت دل چسپ ہے۔



اوپن رناتھ اشک نے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ مگر ان کے ڈرامے بھی کرشن چندر کی طرح ان کے افسانوں کے مقابل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

## ترقی پسند ظرافت

ترقی پسند تحریک نے صرف ایک اچھا ظریف اور مضحکہ بھار پیدا کیا ہے۔ کھنڈیا لال کپور۔ اس مضحکہ نگاری میں جو قوت ہے وہ سنجیدہ سے سنجیدہ تنقید اور سخت سے سخت تنقید میں نہیں۔ ”رومان کی تلاش“ ”ایک آرٹسٹ“ ”چینی شاعری“ ”مٹانے کا مرض“ سب میں ترقی پسند ادیبوں کے رجحانات کی طرف مزاحیہ اشارے ہیں، لیکن ”اندو افسانہ نویسی کے چند نمونے“ اور ”غالب“ جدید شعرا کی ایک مجلس میں ان کے اہم ترین اور مقبول ترین مضامین ہیں۔ جدید افسانے کے سلسلے میں انھوں نے ترقی پسند افسانے کے ان رجحانات کا بھی مذاق اڑایا ہے، جن میں مبالغہ اور رقت انگیزی زیادہ ہے، اور خلوص اور زندگی کم۔ ترقی پسند افسانوں میں کھنڈیا لال صاحب کے نزدیک مزدور اور اس کی مظلومیت اور بیماریوں کے متعلق افسانے محض پچیس فی صدی ترقی پسند ہیں۔ پچاس فی صدی ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں مزدور پر ظلم اور مزدور کی عورت سے عشق کیا جاتا ہے۔ پچھتر فی صد ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں مزدور سرملے دار کی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ سو فی صد ترقی پسند وہ افسانے ہیں جن میں بیٹا ماں سے یا بھائی بہن سے عشق کرے! مصنف اکثر اپنے ذاتی تجربات کسی اور شخص کی زبانی بیان کرتا ہے اور ”بعض دفعہ تو اتنا بتانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا کہ آج کل مصنف کن جنسی امراض میں مبتلا ہے“ یہ تنقیدیں ذرا سخت ضرور ہیں، اور شاید نامہ زبان بھی، لیکن یہ انقلابی تحریک کو ایک بھڑی، گندی روایت بن جانے سے ضرور روکیں گی۔ اس کے بعد کھنڈیا لال کپور نے اسی بے دردی سے جذباتی، نفسیاتی، دیہاتی، رومانی اور حقیقت نگاری کے افسانوں کا مذاق اڑایا ہے۔

ان کا دوسرا مضمون ”غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں“ بہت زیادہ دل چسپ ہے کیوں کہ

اس میں اکثر ترقی پسند شاعروں کی نقل بڑی کامیابی سے اُتاری گئی ہے، یہاں بھی اصلی مقصد اصلاح ہے۔ اور یہ اصلاحی طریقہ تنقید سے کہیں زیادہ موثر ہے۔ چنانچہ اُن کے ”م۔ن۔ا۔رشد“ صاحب فرماتے ہیں۔

”آمری جان، مرے پاس اُٹلیٹھی کے قریب

تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلِ نامِ رترا

اور اسبابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں

اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر

اور شبِ عیش گزر جانے پر

بہر جمعِ دم و دام بھل جاتا ہے“

”غیظ احمد غیظ“ کی حقیقی دل کش نظم کی بھی نقل اُتاری گئی ہے۔ یہ نظم نقالی کی مستحق تو نہیں تھی

لیکن اس کا کیا علاج کہ نقل بھی بہت اچھی ہے۔

”فون پھر آیا، دل زار؟ نہیں فون نہیں

سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات، اُترنے لگا کھبوں کا بخار

کمپنی بارغ میں لنگھانے لگے مردِ چراغ

تھک گیا رات کو چلا کے، ہر ایک چکی دار

گل کر دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ

ہر انقلابی تحریک کے ساتھ اس کے ادیبوں کی نقلیں بڑی ضروری ہیں۔ انگلستان کی انٹی حیکوں

شاعری اس کی مثال ہے۔ اس تحریک میں اور تسفائی پیدا ہوتی ہے۔ اور نقائص کم ہوتے جاتے ہیں۔

چراغِ حسن صاحب حسرت اور دو ایک اور صاحبوں نے بھی ترقی پسند شاعری کے بعض اسلوبوں

کی بڑی اچھی نقلیں اُتاری ہیں۔

## ترقی پسند تنقید

ترقی پسند تنقید میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے اور نشوونما کی بڑی ضرورت۔ ائمہ حسین صاحب رائے پوری کا مضمون ”زندگی اور ادب“ اس قسم کا پہلا مضمون ہے۔ اسے وہ پوری کامیابی حاصل ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس مضمون میں بزدلی خامیاں بھی ہیں، مثلاً ’اُردو‘ نامی کے ساتھ ’عموماً‘ اور اقبال کے ساتھ خصوصاً اس کی ناانصافی۔ اس پر ہم بحث بھی کر چکے ہیں لیکن ان جزئیات سے قطع نظر یہ مضمون ایک بہت بڑی تعمیری ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ اختر صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”ادب اور انقلاب“ کے نام سے شائع ہوا ہے، لیکن ان کا کوئی اور مضمون ”ادب اور زندگی“ کو نہیں پہنچتا۔

احمد علی صاحب کا ایک مضمون ”ادب کا ترقی پسند نظریہ“ رسالہ ’اُردو‘ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اعلا ذہنی معیار پر پورا اُرتتا ہے، اور شاید ’اُردو‘ میں اعلا ترقی پسند تنقید نگاری کی بہترین مثال ہو۔ احمد علی صاحب کو مغرب کے ترقی پسند ادب پر بھی اچھا خاصا عبور ہے اور وہ اکثر مغربی ادیبوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اُردو میں وہ ترقی پسند تنقید کی طرف اور زیادہ توجہ کریں۔

پھر کتابوں کے مقدمے ہیں، یا وہ مضامین ہیں جو رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں ان میں سے سجاد ظہیر، شاہد لطیف اور فیض احمد فیض کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر نے ہر اہم مصنف یا شاعر کے کسی نہ کسی مجوزے کا مقدمہ ضرور لکھا ہے، اور اکثر تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکالا ہے۔

خواجہ غلام السیدین صاحب کا ایک مضمون اقبال کی ترقی پسندی پر رسالہ ’اُردو‘ میں شائع ہوا تھا۔ مجھے ایسوس ہے کہ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، ورنہ شاید مجھے اقبال کی حمایت میں اتنی طول طویل بحث نہ کرنا پڑتی۔

# سر سید خطوط کے آئینے میں

(بقلم جناب خواجہ احمد فاروقی ایم اے)

— (۰۰۰) —

اُردو کی فضائے ادب جن روشن اور تاب ناک ستاروں سے مزین ہو اُن میں ”فرزانہ علی گڑھ“ سر سید احمد خاں کا نام بڑی شہرت اور وقعت رکھتا ہو۔ مولانا حالی نے انھیں ”نثر اُردو کا مورثِ اعلا“ قرار دیا ہو۔ اس لیے کہ انھوں نے تقریباً تیس برس کے اندر اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور وہ زبان جو عشق و عاشقی کے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی تھی اس میں اب یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ فنی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین کو بخوبی ادا کر سکے۔ مولانا شبلی نے صحیح لکھا ہو کہ ”سر سید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ری فائیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہو لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ اُن کی اصلاح کی بدولت دُور سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے۔“ سر سید مرحوم نے ”بادِ وجود اس کے کہ وہ امامِ بخش سہیائی کے جلیس اور ہم صحبت رہے تھے اور یہ وقت ظہوری اور بے بدل کا کلمہ پڑھتے تھے، قدیم تصنیع نگاری پر ایک ضرب کاری لگائی اور نثر اُردو کا قصہ، سلاست اور سادگی پر قائم کیا۔

اس وقت مغلیہ حکومت کا علم سرنگوں ہو چکا تھا اور تمام مُلک میں انگریزی تسلط کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ سیاسی نظام کے بدلنے سے تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام متزلزل ہو چکا تھا اس وقت زندگی کی دوبارہ تنظیم، نظریات میں ضروری تبدیلی اور نئی باتوں سے تطابق اور ہم آہنگی

سہ ”سر سید مرحوم اور اُردو لٹریچر“؛ شبلی نعمانی

پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ادب ان تبدیلیوں سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ یہ قدم سرسید نے اٹھایا جو بدتر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھیں پوری قدم کو مغلوب کرنا تھا۔ وہ قوم جو حکومت جانے کے بعد اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی تھی اور جس کے پاس اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، تعلیم و تربیت، ضبط و خود داری، صداقت و حق پرستی، ہمت و بلند نظری میں سے ایک شے بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کثیر التعداد عجم کو (جس پر قوم کا اطلاق نہیں ہوتا) سادہ سے سادہ اور آسان سے آسان زبان ہی میں مخاطب کیا جاسکتا تھا۔ اسی لیے سرسید کی تحریروں میں الفاظ مطالب لے ماتحت ہیں۔ اور مضمون پر اسے سے زیادہ اہم ہر۔ ان کا مقولہ تھا کہ تحریر میں معانی زیادہ اور تصنیف کم ہونا چاہیے۔

## خصوصیات

آدم نثر جدید، بانی مدرسۃ العلوم، اور حامی ملک و ملت یعنی سید اعظم کو اگر براؤنگنڈ نقاب دیکھنا ہو تو ”مخطوط سرسید“ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہاں انھوں نے اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ خطوط ان کے اخلاق و عادات، اعتقادات و نظریات، اور عصری معلومات و تحریکات کا خزانہ اور گنجینہ ہیں۔

**قوم پرستی** | سیرت :- سرسید کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی اور ان کا کوئی لمحہ اس کی اصلاح اور درستی کے خیال سے علاحدہ بسر نہیں ہوتا تھا۔ ایک رہ نما اور مجتہد کو بہت سی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سرسید کو بھی کرنا پڑا۔ سینکڑوں کا بُرا بھلا سنا، بہت سے مولویوں نے کُفر کے فتوے دیے ہزاروں نے اُن پر طعن طرح کے اتہامات رکھے۔ لیکن اُن کی دل سوزی اور مجتہد قومی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں :-

”افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے۔ ہمارے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہمارے افسوس ہاتھ کیڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں

اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اسی بھائی مہدی! کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہو اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہو اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہو اور علم کیوں کرتا ہو۔ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کا فر مردود و گردن مردی ہوئی مرغی کھانے والے۔ کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون منے گا؟ سہ

نواب سجاد الملک کو لکھتے ہیں :

”جناب مجھ کو قوم کی طرف سے اور اس کی بھلائی اور ترقی کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی اس خیال سے کہ کوشش کرنا ہمارا فرض ہو، کیے جاتے ہیں سہ

مولوی نیاز محمد خاں وکیل نے سید حامد مرحوم کے انتقال پر تعزیت کا تار بھیجا۔ اس کا جواب دیتے ہیں اور اس آزمائش کے وقت بھی قوم کے خیال سے غافل نہیں ہیں :-

”مخدومی دکر می نیاز محمد خاں صاحب آپ کا تار ہم دردی پہنچا جو دل محبت اور عنایت آپ کی تجھ ناچیز پر ہو اس کا میں صرف شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اس کی نہایت محبت اور قدر سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت مددہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا تو اور حکم دیا ہے کہ قوی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو۔ کیونکہ وقت بہت معدوم نہیں ہے۔ تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے۔ پس قوی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو سہ

کم ظرف قوی لیڈروں میں غرور اور تکبر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کی نظروں میں وقعت یا اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سرسید اس نقص سے بالکل بری ہیں۔ ایک مہدی مولوی سید شرف الدین لکھی کو معلوم ہوا کہ سرسید نماز مغرب میں جو نہ ستہ کی سجدہ میں ہوتی تو شریک نہیں ہوئے۔ انھوں نے شکایت کی اور طاعت کے سولات کہے۔ اس



”نغم الاخبار کا مضمون جو سوسائٹی کے اخبار میں مندرج ہوا تھا میں نے دیکھا اور حیران ہو گیا کہ کون شخص میرا خریدار پیدا ہوا۔ مجھ کو تو اپنے ہم وطنوں اور بالخصوص اپنے ہم مذہبوں سے بڑبڑا ہنت کے پھٹ اور جوتی پینار کے کسی چیز کی توقع نہیں ہو اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہو اور نہ میں ان کو برا جانتا ہوں“ ۱۷

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں :-

”میں نے جو ایک خط علی گڑھ اخبار میں لکھا۔ میں سنتا ہوں اس سے ناراضی پیدا ہوئی اور لوگ نہایت برا بھلا کہتے ہیں۔ ناچاری ہو۔ میری قسمت میں یہی ہو“ ۱۸

خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سرستہ نے اپنا ترقی من دھن سب لگا دیا تھا۔ اس سلسلے میں قوم سے چند کرنا چاہا تو مولوی امداد علی نے اس کو ”جندہ دست گیرئی مسافر لندن“ کے نام سے تعبیر کیا۔ نواب محسن الملک کو اسی تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں :-

”میرے ہم قوم اس محنت کی جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہو قدر نہیں کریں گے۔

بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتلائیں گے کیوں کہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں“ ۱۹

نواب محسن الملک نے مدرسہ عربیہ دہلی کے متعلق ایک تقریر نہایت ”دل سوز اور رقت خیز و

درد انگیز“ کی۔ اس میں اہل دہلی کو خوب برا بھلا کہا اور ان کی بے حس پر سخت ماتم کیا۔ اس کے

متعلق سرستہ نواب صاحب کو لکھتے ہیں :- ”یہ اپنی قسمت ہو ہم زرا سی بات کہیں تو فضیحت ہو اور ہم

دشنام کے قریب تک کے الفاظ کہو اور کوئی کچھ نہ کہے“ ۲۰

سرستہ کی تقلید دشمنی، انگریز دوستی اور اجتہاد مذہبی نے دوستوں کے دلوں میں بھی شکوک

پیدا کر دیے تھے۔ ذبیح اور غیر ذبیح کی بحث نے اتنا طول کھینچا کہ محسن الملک بھی شبہ میں پڑ گئے

لندن کے قیام نے مخالفوں کو اور بھڑکایا۔ سرستہ نے جب لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا تو





از ضمیمہ 'نور الآفاق'، نمبر ۱، جلد ۱ - ۲۲ نومبر ۱۳۵۳ھ

## نقل خطِ اول سر سید احمد خاں بہ نام سید امداد علی ڈپٹی کلکٹر (صفحہ ۲)

”جناب ڈپٹی صاحب مذکور و مکرم بندہ سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام التماس میں کہ آپ جو میرے مکان میں تشریف لائے مجھے کمال خوشی ہوئی کہ یہ ایک ذریعہ میرے یاد آنے کا ہوگا۔ بہر حال اگر ملاقات نہیں ہوتی تو مکان دیکھ دیکھ کر یاد کیا کر دو گے۔ میں یہاں بہت خوش ہوں کام بہت کم ہے۔ تصنیف کتب کو بہت فرصت ہے۔ چھاپے خانہ فضل الہی سے جاری ہو گیا ہے۔ تفسیر چھپ رہی ہے۔ مجھ کو بڑا اشتیاق اس بات کے دریافت کرنے کا ہے کہ آپ کے اور احباب ہمارے شفیق صدر الصدور صاحب بہادر ولی اللہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ میں سنتا ہوں کہ جناب ممدوح بڑی دھوم دھام سے کچری فرماتے ہیں اور اگلوں کی نیک نامی مٹانا چاہتے ہیں۔ یزید دن ان یطفوا نور اللہ بانفواہم و یا بی اللہ الا ان یلتمہ نورہ ولو کسرہ الکافر دن۔ امید کہ آپ اپنی خیر و عافیت سے مطلع فرما دیں اور اطلاع دیں کہ شفیق سوتی بہاری لال صاحب کے یہاں کون مر گیا ہے تاکہ میں تعزیت نامہ لکھوں۔ معلوم نہیں کہ منصف صاحب خاص شہر وہاں ہیں یا اپنے گھر گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب کی خدمت میں سلام نیاز اور یہ پرچہ ان کو بھی دیکھا دیکھیگا۔ منصف صاحب امداد مراد آباد میں میرے بعد آگئے ہوں تو حال لکھنا کہ وہ کہاں رہے اور ملاقات ہو تو میری زبان سے یہ شعر پڑھنا

باسایہ ترانمی پسندم

عشق است دہزار بدگمانی

تحصیل دار صاحب مراد آباد تو ہم سے پہلے ہی خفا ہو گئے تھے۔ ان کی خدمت میں کیا لکھوں۔

والسلام۔

خاک سار

سید احمد ۳ جولائی ۱۳۵۳ھ غازی پور

اسی ضمیمہ 'نور الآفاق' میں ایک خط مولوی امداد علی کے نام ۱۴ جولائی ۱۳۵۳ھ کا غازی پور

سہ 'نور الآفاق' سر سید کی تردید کے لیے ۱۳۵۳ھ میں جاری ہوا۔ اس پرچے کے مقاصد (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

سے لکھا ہوا ہے لیکن وہ فارسی میں ہے (صفحہ ۲ تا صفحہ ۳)

## نقل خط سوم سید احمد خاں بنام سید امداد علی صاحب (ص)

”جناب ڈپٹی صاحب مخدوم کرم بندہ سلامت۔

بعد سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ بندہ فضل الہی سے بہ خیریت ہے۔ اخبارات مراد آباد سے جو الفاظ غنایت و شفقت آپ نے بعض اوقات نسبت میرے ارشاد فرمائے معلوم ہوئے۔ میں اس کا نہایت شکر گزار ہوں مجھے آپ کی صفائی اور یک رنگی سے یہی توقع تھی۔ درحقیقت آپ بنسبت حضوری کے غیبت میں زیادہ تر پاس و لحاظ محبت اور دوستی کا رکھتے ہیں۔ برخلاف ابنائے زمانہ کے منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ۔ میں ایک مسکین آدمی ہوں۔ کسی کی بُرائی میں نہیں۔ البتہ حکام اپنی قدردانی سے میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر حسد کرتے ہیں وہ اپنی کیوں نہیں ایسی لیاقت پیدا کرتے کہ حکام کی آنکھ میں ان کی عزت یا قدر ہو۔ داسیات بکنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میری تفسیر پہنچی ہوگی اس کو مطالعہ فرما کر جو نقص نظر میں پڑے اس سے مطلع فرمائیے اور پانچ روپیہ قیمت کے جلد بھیج دیجیے۔ اور ہمیشہ اور اپنی خیر و عافیت سے جلد جلد مطلع فرماتے رہیے۔ منشی امام الدین کا بہت دنوں سے حال معلوم نہیں ہوا۔ ان کے حال سے مطلع فرمادیں کہ کس رنگ میں ہیں۔ ہم سے تو وہ جہی ناخوش ہو گئے تھے جب جناب پادشہ صاحب بہادر آزرده ہوئے تھے۔ مگر میں تو بہ دستور ان کا دوست ہوں۔ اس لیے ان کی خیر و عافیت چاہتا ہوں۔ والسلام

خاک سار

سید احمد غازی پور سہراگست ۱۲۸۶ھ

سید احمد خاں نے پہلے خط میں ”ولی اللہ“ مولوی پیغمبر بخش کو بطور طعن کے لکھا ہے۔ مولوی صاحب

دفعیہ نوٹ صفحہ ۱۰۱ (حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوں گے جو اس کے پہلے نمبر کے مرورق پر درج تھی) ”ان دنوں ہندوستان میں ایک قرن شیطان پیدا ہوا جس کے سبب سے عجب وقت پیدا ہوا۔ درالحاد باز ہوا۔ . . . . . الملوی باتوں کے شائع کرنے کو ایک پرچہ اخبار نیا ایجاد ہوا اور بہ مصداق ”برعکس تہند نام رنگی کا فور“ بہ تہذیب الاطلاق نام نہاد کیا۔ بس حامیان اسلام کی طرف سے ”نور الافاق“ جاری ہوا“ (ملاحظہ ہو نور الافاق نمبر ۱ جلد ۱: سہراگست ۱۲۸۶ھ)

مراد آباد میں سید احمد خاں کی جگہ مقرر ہوئے تھے۔ دوسرے خط میں (جو فارسی میں ہے) مولوی پنیبر بخش کی نسبت لکھا ہے کہ ”مردماں را عادت است کہ کسی کہ بہ عنایت ایزدی نام آرد وہ و نیک نام ہی باشد بر آں حسد می برد و بدگوئی نیک نامی می کنند و نمی دانند کہ ازیں لغویات بیچ فائدہ شان و مضرت آں شخص نیست“

اسی فارسی خط میں مولوی عالم علی کے متعلق لکھا ہے کہ ”مولوی عالم علی از حد طمع و احسان فراموش اند۔ من در مراد آباد شنیده بودم کہ او شان شکایت من می کنند و درس جا متواتر شنیدم چنانچہ بہ جہت رخصت من ہم نیامدہ بود۔ الحال او شان فراموش کردند کہ بہ طفیل من و بہ تصدیق جناب شیکسپیر صاحب از پھانسی نجات یافتند“

**خیالات و نظریات** | مردار مرغی کا واقعہ :- ان خطوط سے ہم سر سید مرحوم کے ذاتی اعتقادات بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ ادب کی یہی وہ صفت ہے جس میں لکھنے والا اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے اور وہ اپنا کیہ کٹر، مافی الضمیر اور اپنی سچی رائیں بلا کم و کاست ظاہر کر دیتا ہے۔ لندن پہنچ کر سر سید نے بے ذبح کی ہوئی مرغی کھائی اور اس کی اطلاع لوہاب محسن الملک مرحوم کو بھی گئی۔ ان کو بڑا رنج ہوا اور سختی سے محاسبہ کیا۔ سر سید اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

”جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جس سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ بات جوڑ کو ہندوستانی نہ شرعی طور پر توہر کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے۔ جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا۔ تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کر دو گے۔ بھائی کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں بڑا کروں اور اس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ نہ کہیں۔ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے۔ جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں وہ سن لیتا ہے۔ جو دل میں لاسے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں پھوڑے

نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب بنی نے نہایت پختے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور پختے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی ہمدی علی سے کیا ڈرتا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ بہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ سے نہایت پختے دل سے التجا کرتا ہوں کہ بعض آقاؤں کے نہایت بدخصلت اور بدکردار غلام ہوتے ہیں۔ وہ آقا اپنے غلام پر ناراض تو ہوتے ہیں مگر اس غلام کو غلام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح گو آپ میری حرکات ناشائستہ سے ناراض ہوں مگر مجھ کو اپنا غلام سمجھتے رہیں۔ ”برسن منگر برکرم خویش نگر“ یہ الفاظ میں نے نہیں لکھے میرے دل نے لکھے ہیں“ ۱۷

لیکن دراصل سرستہ کا پختہ یقین یہی تھا کہ بغیر ذبح کی ہوئی مرغی جائز ہے۔ چنانچہ آئندہ ایک خط میں جو محسن الملک ہی کے نام ہی سبہ محمود کی طرف سے لکھتے ہیں :-

”سوائے تقلید کے اور سوائے مرغی والی بات کے باقی سب مانی جا دیں گی“ ۱۸

نواب محسن الملک نے سرستہ کی اس حرکت کے خلاف دوستانہ اور محبت آمیز انداز میں اصرار کیا اور وہ کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ سرستہ نے اس کا جواب نظریانہ دیا ہے لکھتے ہیں :-

”آپ نے جو کچھ میری مردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس نے عجب لطف مجھ کو دیا ہے۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولت عثمانی مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہو کہ نہیں کیوں کہ بغیر اس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اب جو مزہ آپ کے الفاظ نے دیا ہے اس کی مثال بیان کرتا ہوں بعضی دغہ ایسا ہوتا ہے کہ عاشق اور معشوق میں آپس میں خفگی ہو جاتی ہے، درجوش محبت زیادہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو بیڑھی بیڑھی باتیں سناتے ہیں۔ وہ لفظ تو بظاہر ٹیڑھے ہوتے ہیں مگر ان سب سے جوش محبت اور نہایت مزے دار اُلفت ٹپکتی ہے۔“

لیکن سرستہ کو خدا اور رسول سے جو محبت تھی اس سے انکار کی مجال نہیں۔ محسن الملک

کو لکھتے ہیں :-

”ان دنوں میں زرا میرے دل کو سوزش ہو، ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں سفر کے سال میں لکھی ہو اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلادیا اور ان کی نالائقیوں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیب کہ پیچ سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام اُپریہ خزانہ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو بو اپن دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔ مارا نہیں تمغہ شہنشاہی بس است“ ۱۷

سرسید کے دل میں احکام خدا کی محبت بھی پوری طرح جاگزیں تھی نواب وقار الملک کا ایک انگریز آفیسر سے نماز کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

”بھائی مشتاق حسین کل میں سارے دن مترود رہا کیوں کہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ وہ دو آکھی بٹکر بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہو مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش کیا نہایت لچر بنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہو اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو۔ اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرغ گناہ ہو جس کے بجٹے جانے کی توقع ہو اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہو جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو بھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بلجھانا اور گراگڑانا کیسا۔ حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں“ کہنا و آیات تھا۔ ترواق سے استعفا دے دینا تھا۔ اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا تو کوری نہ بیستر ہوتی۔ فاقے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔“ ۱۸

سر سید کی زندگی اور ان کی تحریک عہد و کٹورہ کے مجملہ اثرات کی آئینہ دار ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور روحانی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پُرانے نظریوں پر دوبارہ غور و غوض کر کے زندگی کے مسائل کو نئے اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ سر سید نے مغربی خیالات سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس گری ہوئی عمارت کو نئے طرز پر بنانے کی کوشش کی۔

عہد و کٹورہ میں سائنس کے سیلاب نے مذہب کی بنیادوں کو کم زور کر دیا تھا اور علم کی روشنی نے تاریک گوشوں کو منور کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں جمہوریت کا شعور بھی پیدا ہوا اور تمام مسلمات پر سخت نکتہ پسینی ہونے لگی۔ ڈارون کے اصولوں نے جبلت اور عقل کے درمیان کش مکش پیدا کر دی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عقلیت پسندی کی رذ میں تمام مذہبی عقائد خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے لیکن ہنری ڈرمند اور میتھو آرنلڈ وغیرہ نے مذہب کی حفاظت کا جدید اور سائنٹیفک طریقہ نکالا اور مذہب کو سائنس سے ہم آغوش کر دینے کی کوشش کی سر سید بھی ان خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مذہب، نچر اور سائنس کی حدیں بلا دینے کی سعیِ بلیغ کی لیکن یہ بات اصولاً صحیح نہیں تھی اس لیے کہ سائنس کے نظریات روز بروز بدلتے رہتے ہیں۔

اس سیلاب کا زور گھٹنے کے بعد سر آرتھر ایڈنگٹن (Sir James Jeans) اور سر محمد اقبال کی تحریروں نے عشق و عقل کے امتزاج پر زور دیا اور بتلایا کہ اس محفل کی رونق اسی مینائے محبت سے قائم ہے۔ لیکن سر سید کی ان تحریروں سے یہ ضرور فائدہ ہوا کہ ہمارا زاویہ نگاہ بدل گیا اور گفتگو اور بحث کے ایسے اسلوب نکل آئے جن میں عقلیت پسندی کا بھی اصول کارفرما تھا۔

**تقلید** | سر سید تقلید کے سخت دشمن تھے اور اسے مسلمانوں کے لیے سخت مضر خیال کرتے تھے۔ خطوط میں اس کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :-

”بھائی جان سُنو اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکتوباتِ ضمیمہ کو غنّی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں

کہ اگر لوگ تنقید نہیں چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور احادیثِ صحیح سے حاصل ہوتی ہو نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہنڈستان سے معدوم ہو جائے گا۔ ۱۷

سریہ پردے کے حامی تھے اور اس محلے میں مولوی عبدالحلیم شرر کے سخت مخالف تھے۔ ۱۸  
شرر کہتے تھے کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مذہب لباس کا نام ہو۔ اور گھر کی چھل دیواری میں عورتوں کو بند کر دینا پردہ نہیں بلکہ حماقت ہو۔ انھوں نے سنہ ۱۹۱۷ء میں ”پردہ عصمت“ نام کا ایک رسالہ بھی لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے پردے کی رسم اٹھادی جائے۔ سراج الدین احمد بیرسٹر ایڈیٹر ”چودھویں صدی“ اور سرمد گزٹ نے اس باب میں سریہ سے استفسار کیا۔ اس کا جواب ذیل میں درج ہو:۔

”و مخدومی بے شک میں پردے کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہنڈستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہونچنے تک اور پانوٹھنے تک ستریں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بہ سبب فسادات زمانہ منہ کو پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر صاحب نے میری نسبت ایک لغو بات لکھ دی ہے میں نے کسی کے سامنے کہا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردے میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔“ ۱۹

اسی طرح یہ بات بھی ول چسپ ہے کہ سریہ حدیثوں کے جانچنے اور صحیح قرار دینے ۲۰  
درایت میں اصولِ درایت کے قائل تھے۔ یعنی وہ راوی کے معتبر یا غیر معتبر ہونے سے قطع نظر کر کے نفسِ حدیث پر غور کرنا پسند کرتے تھے کہ وہ فی نفسہ صحیح ہو سکتی ہو یا نہیں۔ ۲۱

۱۷ دخطوبہ سریہ، ۵۵، اس کے علاوہ ملاحظہ ہو ”دُردُ نشر: سریہ کے زیر اثر“ (انگریزی)، ص ۲۲-۲۳

۱۸ دخطوبہ سریہ، ص ۱۹

۱۹ ترجمہ عسکری: تاریخ ادب اُردو، ۱۳۵

۲۰ دخطوبہ سریہ، ۵۵



جمع بین الصلواتین کو جائز سمجھتے تھے۔ ۱۵

یورپ کا اثر | سہ سید کے خیالات پر انگلستان کا بڑا گہرا اثر پڑا وہ نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں۔ اصول ایمانیہ اسلامیہ پر جس قدر یقین یورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور علماء کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہے بلا تشبیہ وعود وایسا یقین حج سے نہیں ہوتا۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے ہمتی اور تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آمینہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں بھی وہ حماقت اور نالائقی اور گم راہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے۔ پس کوئی کیا کرے۔ بد اقبالی و بد نفسی کا کچھ علاج نہیں ہے۔

اسی خط میں خطبات احمدیہ کے متعلق لکھتے ہیں "اگر میری کتاب تیار ہوگئی جس میں دس باب ہیں تو میں لندن میں آنا دس جج کی برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔" ۷۷

سرستید کا بیان ہو کہ سید محمود پر بھی یورپ کا نہایت عمدہ اثر ہوا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :-

”آج رات کو اس (سید محمود) نے کہا کہ میں تو لندن میں آکر سچا اور پکا اور تصدیق قلبی سے

مسلمان ہوا ہوں ہے

انگلستان کی فضا میں پہنچ کر سرسید کا یہ حال تھا جیسے ایک شخص اذہیرے کمرے سے بھل کر ایک دم بجلی کی روشنی میں پہنچ جائے۔

وہ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :

”انگریزوں کو ہندوستانیوں سے وہ نسبت ہر جو خوب صورت آدمی کو ایک وحشی جانور سے ہے۔“

سہ 'خطوط سرسید' ع ۲۵۱ - ۵۲، 'خطوط سرسید' ص ۴۱ - ۵۳، 'خطوط سرسید' ص ۴۲ -

۷۷ " " ص ۳۴ - ۷۵ " " ص ۸۰ -

اپنی ولایتی خادموں کا ذکر ابن الفاظ میں کرتے ہیں ”اگر یہ عورت جو نہایت غریب آدمی اور اہل گیری کی نوکری کی محتاج ہو اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہو اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔“

اسٹار آف انڈیا کے تمنغہ یلنے کی اطراح نواب محسن الملک کو اس طرح کرتے ہیں :-  
”مجھ کو یقین ہو کہ اس امر سے آپ سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔ اس لیے کہ باقی حضرات کو عقل زرا کم ہو۔“

لندن سے جو خطوط لکھے گئے ہیں ان میں عمائدین سے ہاتھ بیلانے اور دعوتوں کی شرکت پر جو اظہار مسرت ہو اس کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہو لیکن اس سے بحث کرتے ہوئے ہمیں انیسویں صدی کے مخصوص حالات سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔

سرہند کا انگلستان جانے کا مقصد یہ تھا کہ مغربی ملکوں کی شایستگی کے عجیب و غریب نمونے اور اس کی ترقی کو چشم خود دیکھیں، مگر انک نے خوب لکھا تھا کہ ”اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا۔ رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے“ انھوں نے انگلستان کو قبوہ خانوں کی بجائے انجمنوں اور کتب خانوں میں دیکھا اور اپنا تمام وقت علمی تحقیقات اور مشاغل میں صرف کیا۔ علی گڑھ کالج کا نقشہ یہیں تیار ہوا۔ ”تہذیب الاخلاق“ کا بلاک بول حالی ”یہیں بنوایا گیا“ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا ملازم جولیس سیزر ہو اس کی تحقیق یہیں کی اور میٹور کی کتاب کا دندان شکن جواب یہیں لکھا۔

سرہند نے انگلستان پہنچ کر ہر چیز کو عبرت اور حیرت کی نظر سے دیکھا۔ کتب خانہ انڈیا آفس کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”کتب خانہ نہیں کتابوں کا شہر ہو“ برٹش میوزیم کے بارے میں لکھتے ہیں :  
”ایک بڑا کتابوں کا جنگل ہو“ لندن کے متعلق لکھتے ہیں ”لندن جنت ہو اور حوروں کا ہونا بچ

ہو“

## ۲۔ تاریخی معلومات

خطوط سرستہ کی دوسری خصوصیت یہ ہو کہ وہ تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ آج جو طریقے تاریخ ماضی کی تدوین و ترتیب کے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ان میں تاریخ کی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ان چیزوں کو دخل حاصل ہو جو تاریخ کے طور پر نہیں لکھی گئیں لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس زمانے کے حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہی فراہن، سیاسی تحریرات اور مکتوبات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اسی لیے پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم کی تالیف میں دمشقاۃ فریدوں کا استعمال فراخ دلی کے ساتھ کیا ہو اور سرکار نے آدنگ زیب کی تاریخ لکھتے وقت مکاتیب عالم گیر سے خاص طور پر استفادہ کیا ہو۔

خطوط سرستہ کے ذریعے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت، تحریک علی گڑھ، مدرستہ العلوم مسلمانان ہند، ریاست حیدرآباد، تہذیب الاخلاق، کانچ کے غبن، معاصرین سرستہ، اردو ہندی نزاع اور جدید اردو شاعری وغیرہ کے متعلق بہت سی تاریخی معلومات ہم پہنچ سکتی ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربراہان ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی رائج ہو جائے۔ جب اس مقصد کی اشاعت اور حصول کے لیے الہ آباد میں ایک صدر مجلس قائم کی گئی تو سرستہ نے ۲۹ اپریل ۱۸۷۷ء کو ایک خط نواب حسن الملک کے نام لندن سے لکھا جس سے ان کے تاثرات کا اندازہ ہو سکتا ہو۔

۱۱ ایک اور خبر مجھے ملی ہو جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہو کہ بالوشید پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دل میں جوش آیا ہو کہ زبان اردو خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہو (باقی آئے)۔

۱۲ خطوط سرستہ، ۶۷ - ۱۲۳ - ایضاً ۱۰۳ - ۳۵ - ایضاً ۷۳ -

۱۳ - ۱۲۷ - ۲۳۲ - ۱۲۷ - ایضاً ۶۷ - ۱۲۷ - ایضاً ۷۲ - ۱۲۷ -

# تبصرہ

## ادبیات

فین اتان گونی | (مؤلفہ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب - دائرۃ ادب بائجی پور پٹنہ - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

اس کتاب میں ’طلسم ہوش با‘، ’بوستان خیال‘، مختصر داستانیں اور منظوم داستانیں بحث میں آئی ہیں۔ مختصر داستانوں میں ’باغ دیہار‘، ’فساد عجائب‘ اور ’آرائش محفل‘ اور منظوم حکایتوں میں صرت ’مثنوی میر حسن‘ اور ’مغل ذار نسیم‘ کا ذکر ہے۔

داستانیں، فسانے، قصہ کہانیاں ہر زمانے میں مقبول رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ لیکن ہر زمانے کے حالات جدا ہوتے ہیں اسی لحاظ سے داستانوں اور فسانوں کی نوعیت ہوتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کتابیں اس قسم کی پہلے زمانے میں لکھی گئی تھیں وہ اب قابل اعتنا نہیں۔ پروفیسر کلیم نے ہماری بھولی بسری داستانوں کو جو ہمارے ادب میں خاص درجہ رکھتی ہیں اپنی تنقید سے از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی خصوصیتوں اور خوبیوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ ہر دور ان کا یہ کہنا سچ معلوم ہوتا ہے کہ ”اگر ہم غور سے سوچیں تو شاید یہ حقیقت سمجھ میں آجائے کہ اردو میں افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں داستانوں کا زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری نامحیی اور لاعلمی ہے کہ ہم اس قیمتی سرمایے کی قدر و قیمت سے بالکل واقف نہیں۔ اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتے۔“

’باغ دیہار‘، ’فساد عجائب‘ اور ’آرائش محفل‘ کے محاسن و معائب کا مقابلہ بھی خوبی سے کیا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے ’باغ و بہار‘ ہماری زبان میں بے مثل کتاب ہو۔ ثنوی اور ’گل زار نسیم‘ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن پروفیسر کلیم کی تنقید بھی پڑھنے کے قابل ہو وہ کہیں کہیں ان ثنویوں کے بیانات کا مقابلہ میرا متن کے قصے سے کرتے ہیں تو باغ و بہار کی قدرو قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

ہمیں اُن سے کامل اتفاق ہو کہ ”اُردو میں اچھے ناول بہت کم ہیں۔ اور شاید بہت اچھے تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ آج کل کے جدید افسانوں سے بہت بیزار ہیں اور ان کی بیزاری کچھ بے جا نہیں۔

مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی صاحب ناظم کتب خانہ ریاست رام پور۔

### انتخاب غالب

نواب کلپ علی خاں والیہ ریاست رام پور نے فارسی و اُردو کے چیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب کرنے کے سلسلے میں مرزا غالب سے فرمائش کی کہ وہ جلد اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب کر کے بھیج دیں۔ مرزا صاحب نے اس فرمائش کی تعمیل میں اپنے کلیات اُردو اور فارسی کے انتخابات نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے۔

یہ ہے اس انتخاب کی شان نزول۔ ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء کو فرمائش ہوئی اور ۱۸ ستمبر ۱۸۶۶ء کو اُردو کا اور ۲۴ ستمبر کو فارسی کا انتخاب ارسال کر دیا۔ یہ مرزا صاحب کی عمر کا آخری زمانہ تھا، بہت ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے اور اکثر بیمار رہتے تھے، اس پر تعمیل کی جلدی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو فارسی کلیات پر نشان کرتے گئے اور انتخاب نقل کردا کر بھیج دیے۔ اس وجہ سے متعدد اچھے اشعار انتخاب سے رہ گئے۔ عرشی صاحب نے ایسے کچھ اشعار ضمیمے میں درج کر دیے ہیں، ان میں کچھ اور اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس انتخاب سے ایک بات اور بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا صاحب نے نواب صاحب کے خیال سے اس میں کچھ مصلحت سے بھی کام لیا ہے۔

عرشی صاحب نے اسے بڑی خوبی اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ علاوہ دیباچے کے آخر میں بعض اشعار کی شرح بھی لکھ دی ہے اور اس میں کہیں کہیں بڑے لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ شرح کا تاسد میں اکثر مرزا صاحب کے بیان ان کے رقعات وغیرہ سے نکال کر دیے ہیں۔ شرح کے بعد

اختلافِ نسخ بڑی محنت سے مرتب کیا ہو اور سب سے آخر میں اشاریہ ہو۔

”اختلافِ نسخ“ میں عرشی صاحب نے اس شعر کے متعلق

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ناک ہو جائیں گے ہم تم نو خبر ہونے تک  
یہ لکھا ہو ”ہونے تک“۔ اسکا طرح تمام جدید الطبع نسخوں میں پایا جاتا ہو۔ لیکن یہ جدید محاورہ ہو۔ پُرانا  
محاورہ وہی ہو جو تمام قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں لکھا گیا ہو۔ ”بے شک“ ہوتے تک ”صحیح  
ہو اور ہم نے بعض اُن حضرات سے اس کی تصدیق کی ہو جنہوں نے خود مرزا صاحب کی زبان سے  
اسی طرح سنا تھا۔ لیکن عرشی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ پُرانا محاورہ ہو صحیح نہیں۔ ہوتے تک اور  
ہونے تک میں نازک فرق ہو۔ ہوتے تک میں ایک تسلسل پایا جاتا ہو جو ہونے تک میں نہیں۔  
اس کا لطف اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ انتخاب عرشی صاحب کے سلسلے کی دوسری کتابوں کی طرح نہایت پاکیزہ خطِ نسخ میں چھپا ہو  
لیکن اس کی صفائی اور نفاست دوسری کتابوں پر سبقت لے گئی ہو۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں  
اس سے فاضل مرتب کی نفاستِ ذوق کا بھی پتا لگتا ہو۔

(مجموعہ نظم مولانا ظفر علی خاں۔ پبلشرز یونائٹڈ۔ لاہور قیمت چار روپے آٹھ آنے)

## ہنگامِ رستان

مولانا ظفر علی خاں کا جب کبھی خیال آتا ہو اور جب کبھی میں اُن کی کوئی تحریر یا  
نظم دیکھتا ہوں تو اس خیال سے دل دکھتا ہو کہ وہ کیوں ادبیات کے دائرہ سے حل کر سیاسیات کے  
میدان میں جا پہنچے۔ اگر وہ ذوقِ ادب ہی کی پرورش کرتے تو اُردو کی عظیم الشان خدمت انجام دیتے۔  
لیکن سیاسیات میں جا کر بھی انہوں نے اپنا ادبی ذوق نہیں چھوڑا۔ اور حقیقت یہ ہو کہ سیاسی شلوئی  
کی بنیاد انہوں نے ڈالی۔ اور اپنے اخبار کے ذریعے سے اس رنگ کو جو کبھی کبھی بہت تنوع  
ہو جاتا ہو، ملک میں پھیلایا۔ عجلت ان کی فطرت میں ہو۔ وہ جلد بولتے، جلد بہت جلد لکھتے،  
جلد بھجھتے ہیں۔ دل میں کسی خیال کے آتے ہی مٹا مٹا کر بیٹھتے ہیں۔ یہی حال شعر کہنے کا ہو۔  
خیال آیا اور شعر حاضر۔ کوئی موقع ہر نظم تیار۔ ان کا مجموعہ نظم ایک گلِ دستہ ہو جس میں طرح

طرح کے بھول ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے اکثر نظمیں وقتی ہیں لیکن وہ وقت کے اقتضا کو بتاتی ہیں۔ کچھ واقعات کے متعلق ہیں اور کچھ اشخاص کے متعلق (جن میں دوست دشمن سب ہیں) کہیں باہمی چشمکیں ہیں اور کہیں سیاسی آویزشیں۔ اکثر فی الہدیہ ہیں۔ ان کی طبیعت کی شوخی جگہ جگہ نظر آتی ہے اور بعض جگہ بڑا لطف دیتی ہے۔ مولانا کو زبان پر حیرت انگیز قدرت ہے۔ کیسی ہی سخت زمین ہو، کہیں بند نہیں۔ قافیے ایسے نکالتے اور اس طرح نبھاتے ہیں کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ مذہبی جوش اور حمیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ نظم کسی موضوع پر ہو روانی، زور بیان اور لطف سے خالی نہیں۔

اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ ’بہارستان‘ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ دوسرا مجموعہ اب ’نگارستان‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دونوں پڑھنے کے قابل ہیں۔

## EUROPEAN & INDO-EUROPEAN

### POETS OF URDU & PERSIAN

’اُردو ادب فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شاعر۔‘ مصنفہ راسے بہادر رام بابو سکسینہ ایم۔ اے

ایل ایل۔ بی، ایف۔ آر۔ اے۔ ایس۔ (لندن) وغیرہ۔

راسے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں ان کی تالیف ’تاریخ ادب اُردو‘ انگریزی اور اُردو میں بہت مشہور ہو چکی ہے اور ہندستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ادب اُردو کی تاریخ پر اس وقت بھی ایک مکمل کتاب ہے۔ اب یہ ان کی دوسری کتاب شائع ہوئی ہے جو اپنے انوکھے موضوع اور تحقیق و جستجو کے اعتبار سے پہلی تالیف سے بھی بہت زیادہ اعلیٰ ہے۔

یوں تو اُردو ادب اور اس کی تاریخ کے شائقین اس قدر ضرور جانتے تھے کہ کچھ یورپین تھے جو اُردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ پرے ایک سو زانو

یورپین اور نیم یورپین ایسے عرصے ہیں جنہیں ہماری زبان کے شعرو سخن سے بڑا شذوذ تھا اور بن میں سے بعض کے پورے دیوان موجود ہیں۔ یہ سکینہ صاحب ہی کی ہمت تھی کہ پورے پندرہ سال اس دھن میں لگے رہے اور کہاں کہاں سے اور کس کس طرح اور کیسے کیسے جتن کر کے ان بھولے دوسرے یورپین اردو شاعروں کو ڈھونڈ نکالا ہو۔ سچ پوچھو تو انہوں نے مردوں کو زندہ کیا ہو۔ ان میں خالص یورپین اور انٹلو انڈین شاعروں کے علاوہ ارتھی، انڈو برٹش، انڈو پرتگیزی، انڈو ڈچ، انڈو جرمن، انڈو آلمین نیز انڈو یوہین ڈیہن بھی ہیں جو اردو زبان میں شاعری کرتی تھیں۔

ان تمام حالات کی تحقیق میں فاضل مصنف نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان شاعروں کے مطبوعہ دیوان جو کسی زمانے میں طبع ہوئے تھے اور اب نایاب ہیں اور لوگوں کو بہت کم اُن کا علم ہو بہم پہنچائے۔ ان کے علاوہ اُن کے غیر مطبوعہ قلمی دیوان یا نظمیں مسلسل اور مستقل جدوجہد اور جستجو کر کے حاصل کیں۔ تمام تذکرے جن میں ان لوگوں کا کہیں ذکر آیا ہو مطالعہ کیے اردو کے وہ نئے نئے پڑانے رسالے جن میں کہیں ان کے کام کا حوالہ نہ تھا، بنز انگریزی ادبی اور تاریخی رسالے، قلمی بیاضیں جن میں بعض ایسی کام کی چیزیں ملیں جن کی توقع نہ تھی۔ ان سب کو پڑھا۔ پھر ہندوستان اور انگلستان کے کتب خانے، کتاب خانے، ویسی ریاستوں کے کتب خانے اور سرکاری دفاتر چھان مارے۔ گرجاؤں کو بھی نہیں بھولا اور اُن کے قبائلوں میں اپنے مصدب کے کتبے اور ان کے رجسٹروں میں سے اپنے کام کی باتیں ڈھونڈ نکالیں۔ گزٹیئر، سیاحت نامے، سوانح، تاریخیں، لغات، کتب استاد، لارڈز، انجی کاغذات سب کھنگال ڈالے اور ہزار ہا خطوط دریافت حالات میں مختلف لوگوں کو جگہ جگہ لکھے اور جہاں کہیں سے کوئی بات باقی رہی، تلخبات کی

فاضل مصنف نے ان شاعروں کے حالات اور نماناتی تذکروں اور شہرہ بنی رکتفا نہیں کی بلکہ اس زمانے کی معاشرت اور حالت پر بھی نظر دالی ہو جو یہاں معلومات اور دلچسپ سو کتاب کی تکمیل کے بعد جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ضمیمہ میں شائع کی گئی ہیں۔ یہ تعداد میں گیارہ ہیں۔ اصل کتاب تقریباً سو اتین سو صفحے کی ہے۔ اس کے ساتھ ان شعرا کے کلام کا انتخاب بھی



ہو۔ جو چار سو صفحے پر آیا ہے۔

اس موضوع پر، لکھنے کے لیے سامان بہم پہنچانا نہایت دشوار تھا۔ سکینہ کی ہمت اور شوق تحقیق پر آفریں اور صد آفریں ہو۔ انھوں نے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ ہم سے زیادہ اینگلو انڈین جماعت کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے بزرگوں کے اس کمال کو جسے وہ خود ٹیلا چکے تھے کیسی محنت اور جستجو سے ایک مدت کے بعد روشن کیا ہے۔ اینگلو انڈین اصحاب کو اپنے بزرگوں کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس سلسلے کو جو وہ ایک عرصے سے منقطع کر چکے ہیں پھر تازہ کرنا چاہیے

کلام کا انتخاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان یورپین اور اینگلو انڈین شاعروں نے اُردو زبان کو بڑے شوق سے سیکھا تھا۔ ان کا کلام ہر صنفِ شعریں پایا جاتا ہے۔ قصیدے، رباعیاں، اشوبیل، غزلیں سبھی کچھ لکھا ہے۔ ان کے اور کسی ہندوستانی شاعر کے کلام میں مطلق فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی تشبیہیں اور استعارے وہی تلمیحات، وہی روزمرہ اور وہی محاورات، وہی اسلوبِ بیان، کہیں کہیں وہی ہیام گوئی۔ آج کل یورپین اور اینگلو انڈین مدارس میں اُردو زبان کے سیکھنے کی طرف زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ صرت امتحان پاس کرنے کے لیے نہیں سیکھنی چاہیے بلکہ اسی شوق ادا چاؤ سے سیکھنی چاہیے جیسے ان کے بزرگوں نے سیکھی تھی۔ انھیں اب ہندستان میں رہنا ہے اور ہندستان میں رہنے اور ہندستانیوں سے میل ملاپ اور تعلقات بڑھانے کے لیے زبان سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو زبان انھیں ہندستان میں ہر جگہ اور ہر موقع پر کام دے سکتی ہے وہ اُردو ہے۔

اس باب میں فاضل مولف کی سنجیدہ رائے کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں نقل کرنا مناسب ہے۔ کتاب کے پندرھویں باب کے آخر میں لکھتے ہیں : (ترجمہ :-)

”ان یورپین اور اینگلو انڈین شعراء کرم کی گراں قدر شاعرانہ بلند پروازیوں سے اُردو ادب کے تنوع اور ہمہ گیری کا پتا چلتا ہے یہ ایک بحرِ وقار ہے جس سے بہ کثرت چٹنے نکلتے ہیں، اس شوخ رنگ نمونے میں مختلف خوش نما رنگ جھلکتے ہیں اُردو ادب

کسی ایک ہی قوم کی ملکیت نہیں ہے یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے۔ یہ تمام فرقی تنازعات اور سیاسی جھگڑوں سے بالاتر ہے ہنگامی مجبوس اور جماعتی منافضوں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے باہمی شکر رنجی میں اسے پھنسانا درست نہیں ہے۔ یہ اتحاد اور باہمی محبت کا نشان ہے اور زبردست متحد کرنے والی قوت ہے اس میں ان مول موتیوں کا خزانہ ہے جس کی ہمیں حفاظت اور قدر کرنی چاہئے، ہندو مسلمانوں، یورپیوں اور انڈو یورپیوں نے اس کی تعمیر میں اپنی اعلازین کوششیں صرف کی ہیں ایسے مشترکہ ترکے کو جو ناقابلِ تقسیم ہے ہمیں کسی حال میں ضائع نہ کرنا چاہیے۔“

**ذہنی زلزلے** | دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ، جدید لے آئی۔ حیدر آباد (دکن) چھوٹی تقطیع ۱۹۲ صفحات  
سادہ جلد منقش گرد پوش۔ قیمت دو روپے چار آنے۔ چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف جناب نعیم صاحب صدیقی مدیر معاون رسالہ 'کوثر' (سابق 'مسلمان') اب دلائل اسلام ٹھان کوٹ میں مقیم ہیں۔ کتاب کا "افتتاحیہ" ان الفاظ پر ختم ہوا ہے۔

"اس کتاب کا مصنف موجودہ سماج سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ اس کی ساری تعمیر کو بنیاد تک اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے اور مستقبل کی سوسائٹی کا محل ایک نئے نقشے سے بنانا چاہتا ہے۔ مگر اس کا نقشہ ان نقشوں سے بالکل مختلف ہے جن کا پرویگنڈا کرنے میں وقت کے اکثر اہل قلم معروف ہیں۔ یہ معدود فکری بغاوت کے اندر ایک نئی فکری بغاوت کا آغازی اقدام ہے۔"

لاحق مصنف کا تعلق شاید مولانا مودودی صاحب کی اس جدید جماعت سے ہے جو دین اسلام کے محکم اساسی عقائد و اعمال کو جمود و رسمیات کے انبار سے نکالنا چاہتی اور مسلمانوں کو ازسرنو ایک دلولہ انگیز دینی زندگی کی دعوت دیتی ہے۔ اس تحریک نے یورپ کی جدید تہذیب، الحاد و مادہ پرستی اور نفسانی بلکہ حیوانی مقاصد پر بھی سخت ضرب لگائی ہے اور ان سب وجوہ سے مسلمانوں میں خاص قدر و منزلت کا استحقاق حاصل کر لیا ہے۔ نوجوان مصنف افسانے کے پیرائے میں اسی تحریک کے علم بردار معلوم ہوتے ہیں اور ہندی مسلمانوں میں جو مذہبی ردِ عمل پیدا ہوا ہے اس کے ادبی دنیا میں بہت اچھے

نمائندے سمجھے جاسکتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں اُن کے بعض افسانے جیسے ”دیکھائی تناہل“ ”جیب کترا“ ”دماغ کی اسمبلی“ وغیرہ ہر اعتبار سے دل چسپ اور کامیاب نسانے ہیں جن کی اربابِ ذوق داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔ کتاب کی عبارت میں کہیں کہیں مولویانہ ثقالت اور زبان کی بھی خفیف غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن ہمیں یقین ہو کہ معمولی توجہ اور مشق سے نوجوان مصنف ان کی بہ خوبی اصلاح کر لیں گے۔ ایک عمدہ افسانہ نویس کے لیے اصل ضرورت یہ ہو کہ اعلا دربت کی تختید اور مشاہدے کی توفیق رکھتا ہو۔ قصے میں ربط و دل کشی پیدا کر دے اور اداسے مطالب میں جدت و نطفہ بیان پر قادر ہو۔ ہمارے خیال میں صدیقی صاحب میں یہ سب اوصاف موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ بہت جلد مقبول افسانہ نویسوں کی صفِ اول میں شمار نہ ہوتے لگیں۔

کتاب میں الحاد و دہریت، فحاشی و بدکاری کی تردید و تنزیل کے ساتھ کہیں کہیں معاصرین پر کھلی ہوئی چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ اس کا جواب دینا نہ دینا صدیقی صاحب کے حریفوں کا کام ہو۔ البتہ اگر وہ اجازت دیں تو اس قدر ہم ضرور عرض کریں گے کہ گو مذہب کے حقائقِ عالیہ کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ان کو سمجھنے سمجھانے میں غلطی اور اختلاف کی بڑی گنجائش ہو۔ اصلاحِ عقائد و اخلاق، انبیاءِ معصوم کا منصب رہا ہو، ظالمی انسانوں کو اپنی اصابتِ رائے اور صحتِ علم پر جو وثوق ہو جاتا ہو اس کا سبب کبھی کبھی قصورِ فہم اور فریبِ نفس ہوا کرتا ہو۔ قتال۔

س۔ہ

## تاریخ

ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں | بقلم جناب محمود غاں صاحب محمود مولف ”سلطنتِ خدا داد“  
 (غیرہ۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ چھوٹی تقطیع۔ قیمت چار روپے، مبارک بنی، لاہور کے پتے سے مل سکے گی۔)

ہی زبان میں اس قسم کی بہت سی کتابیں مختلف ممالک کی بڑی جنگوں کی نسبت لکھی گئی

ہیں اور ہندوستان کی جنگوں پر بھی۔ لیکن یہ اتنا بڑا ملک ہو کہ اس کی فیصلہ کن لڑائیاں قرار دینے میں ذاتی پسند و مذاق کے اختلاف کی بڑی گنجائش پائی جاتی ہو۔ ان آٹھ معرکوں میں جن کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں درج ہو، جنگ تالی کوٹ یا پلاسی اور آخر میں سرنگاپٹم کے معرکے کو پورے ہندوستان کی فیصلہ کن جنگ قرار دینا، تکلف سے خالی نہیں ہو۔ نوجوان مولف پرجوش اور شگفتہ انشا پرداز ہیں اور جنوبی ہند پر ان کی تاریخی کتابیں کافی دل چسپ ہیں لیکن تمام ہندوستان کی اور وہ بھی صد ہا سال کی تاریخ سے بحث کرنے کے لیے زیادہ وسیع مطالعے کی ضرورت ہو۔ اس کے واسطے انگریزی درسی تاریخیں، رسالہ 'ہتایوں' کا مضمون اور تاریخ 'ذکار اللہ' پر حصر کرنے سے کام نہیں چل سکتا جن سے مولف صاحب نے اپنے ماخذوں کا کام لیا ہو۔ فیروز شاہ اور مہاراجوں کی جنگ قنوج کے ماخذوں میں تاریخ "فیروز شاہی" بھی درج ہو (ص ۵۷) حال آنکہ وہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مکمل ہوگئی تھی۔ غرض تاریخی اعتبار سے مولف صاحب کی یہ کوشش کسی بلند پایہ تحقیق کا نمونہ نہیں نظر آتی۔ البتہ ادبی لحاظ سے خامی دل چسپ اور لکھائی چھپائی میں بہ خوبی دیدہ زیب کتاب ہو۔ س۔ ۵

مولفہ محمد کلیم اللہ، ناشر ماڈرن بک ڈپو، سلطان بازار، حیدرآباد دکن ۳۲۔ صفحے ۵

**سویٹ روس**

قیمت سے

موجودہ جنگِ عظیم سے پیش تر سویٹ روس کے نظامِ حکومت و معیشت کا ساری دنیا میں منہکے اڑایا جاتا تھا اور کمیونسٹ نظامِ اقتصادیات کے ناقابلِ عمل ہونے اور اس کی ناکامی کی پیش گوئی پر ہر جگہ مشکافیاں کی جاتی تھیں۔ لیکن اس جنگ میں اس کے نظامِ حکومت و معیشت کی کامیابی ثابت ہوگئی کہ اس میں مزید دلیل و حجت کی گنجائش نہ تھی۔ اس عالم گیر انقلابِ رائے نے سب کی نگاہیں اس کی طرف متوجہ کر دیں اور لوگوں کو اس نظام کی تفصیلات اور اُن حالات کے معلوم کرنے کی فکر ہونے لگی جن سے اتنی شان دار کامیابی حاصل ہوئی کہ ملک کا فرسودہ نظامِ معاشرت نئی زندگی کے ساتھ جاگ اٹھا اور حکومت کے طرزِ عمل نے حاکم و محکوم کو ایک مقصد اور ایک نصب العین پر متبی کر دیا۔ چنانچہ یورپین زبانوں میں بکثرت کتابیں اس مضمون پر لکھی گئیں اور ترجمہ کی گئیں، لیکن

اردو زبان میں ابھی اس قسم کے لٹریچر کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے اور سارے نظام حکومت و معیشت پر ایک جا معلومات کی تو شاید کوئی کتاب اردو زبان میں نہ تھی۔ اس لحاظ سے مولوی محمد کلیم اللہ کی یہ کوشش مستحق تحسین ہے کہ انھوں نے اردو دان پبلک کے لیے مختصر اور جامع طور پر سو میٹ نظام کی تفصیلات جمع کر دیں جن کے پڑھنے سے ان اسباب کا تعین کیا جاسکتا ہے جو انقلاب روس کے بعد سے اس پسماندہ اور فلاکت زدہ ملک کو تیز گامی کے ساتھ ترقی کی منازل پر آگے بڑھاتے رہے اور جنھوں نے مختلف قومیت، مختلف زبان، مختلف مذہب اور مختلف تمدن کی ایک وسیع آبادی کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کر دیا۔ کتاب شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے اور موجودہ گرائیوں کے زمانے میں اس کی قیمت زیادہ نہیں ہے۔ کاغذ عمدہ اور جلد خوب صورت ہے لیکن کتابت و طباعت اگر اس سے بہتر ہوتی تو اچھا تھا۔

ر - ع - ۱

## متفرقات

افادات جناب مولانا عبدالمجید صاحب دریابادی - ۱۳۲ صفحات - چھوٹی تقطیع - سادہ مسائل و قصص | جلد مع گردپوش - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - ادارہ اشاعت اردو - حیدرآباد دکن سے طلب کی جائے۔

اصل میں یہ ان دو مقالوں کا مجموعہ ہے جن میں سے پہلا رام پور اکاڈمی کے جلسے میں اور دوسرا اسلامیہ کالج پشاور کی ایک خاص مجلس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اخبار صدق، لکھنؤ میں باقسط دونوں چھپے لیکن اب ضروری ترمیم اور نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔

فاضل مصنف ایک مدت سے قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے ضمن میں تفسیر کا مطالعہ کر رہے ہیں اور انھیں خدا کے فضل سے دینی مسائل میں خاص بصیرت اور تجربہ حاصل ہو گیا ہے۔ ان کی نشاندہی ایک مدت سے ملک میں مقبول و مسلم ہے اور متین شریف اور سنجیدہ گرم گفتاری کا نادر نمونہ

پیش کرتی ہے۔

ان مقالوں میں مولانا نے قرآن مجید کے چند تاریخی مباحث پر روشنی ڈالی ہے اور قوم بنی اسرائیل، نیز بعض بزرگ انبیاء کے حالات میں ایسے ایسے عالمانہ نکتے بیان کیے ہیں جو اہل ذوق سے داد لیے بغیر نہ رہیں گے۔ کتاب ضخامت میں کم ضخامت میں کہیں بڑی ہے۔ ہر مذاق کا آدمی اسے پڑھ کر محفوظ و مستفید ہو سکتا ہے۔

س۔ ۵

بقلم جناب پروفیسر نواب علی صاحب قریشی۔ صدر شعبہ تاریخ و تمدن مسلم کالج،  
**اصولِ تمدن** | کانپور۔ درسی کتب کی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر خاصی صاف چھپی ہے اور  
 سیدہ اسٹیشنری مارٹ، چوک، کانپور سے بہ قیمت دو روپے آٹھ آنے دست یاب ہو سکتی ہے۔

فاضل مصنف نے انگریزی اصطلاح "سکس" کا اردو مرادف "تمدن" پسند کیا ہے جو اب تک "بوی بڑے شن" کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "مدنیات" بہتر ہوتا۔ یا کتاب کے دوسرے باب میں کئی جگہ "شہریات" لکھا گیا ہے، اسی کو اختیار کر لیا جاتا۔ بعض دوسری اصطلاحات کی نسبت بھی گفتگو کی گنجائش ہے لیکن مجموعی طور پر لائق مصنف نے بہت غور و محنت سے ہر انگریزی اصطلاح کا صحیح ترجمہ ہم پہنچایا ہے اور ہر جگہ انگریزی حروف میں اصل لفظ بھی تحریر کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ انگریزی الفاظ نیز عبارتیں بہت صاف اور صحیح چھاپی گئی ہیں لیکن رتھو کی چھپائی میں وہ صفائی کہاں آ سکتی ہے جسے ہم انگریزی ٹائپ میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اردو کتاب میں جاہ جابہ ایہ اجنبی رسم خط اسے مطبوعہ سرکاری اداروں سے مشابہ بناتا ہے اور خوش نما نہیں نظر آتا۔ مگر چونکہ کتاب ایف اے کے طلبہ کے واسطے لکھی گئی ہے اس لیے غالباً یہ اہتمام ضروری سمجھا گیا۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ کی صورت میں انگریزی الفاظ اور ان کے اردو مرادفات دے دیے جاتے یا مغربی حواشی میں انگریزی اصطلاحات متن سے الگ کر کے لکھ دی جاتیں۔

معنوی اعتبار سے کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ عام شائقین کے واسطے بھی نہایت مفید معلوم ہوتی ہے اس کے اٹھارہ ابواب میں شہری زندگی کے آغاز اس کے نشوونما، شہری حقوق و فرائض، مملکت،

حکومت اس کے آئین و دستور پر کافی وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ لائق مصنف اپنے مضمون سے امداد درجے کی واقفیت رکھتے ہیں اور اُن کی کوشش یہ ہے کہ جو کچھ خود سمجھا ہے اسے اچھی طرح ناظرین کو سمجھائیں۔ اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے اگرچہ وہ ایک خشک مضمون کو زیادہ دل چسپ اور شگفتہ نہ بنا سکے ہوں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی مصطلحات اور اُردو تراجم غالباً مصنف کے پیش نظر رہے ہیں۔ انھوں نے ’پدرسی‘ اور ’مادری‘ جیسے دو نئے لفظ بھی اختیار کر لیے ہیں لیکن اقتصادیات کی بجائے ’معاشیات‘ کو پسند نہیں کیا جو نسبتاً جدید اصطلاح ہے ڈومک رسی کا مرادف ’’جمہوریت‘‘ لکھا ہے جو قدیم سے ’’ریپبلک‘‘ کے واسطے آتا تھا۔ پہلی اصطلاح کا ترجمہ حکومتِ عوام یا عوامیہ شاید لائقِ ترجیح ہوتا۔ دوسرے اصطلاحات، یر بھی آئندہ زیادہ تفصیل و تدقیق سے نظر ثانی کی جائے اور انھیں صحتِ معانی کے ساتھ عام فہم یا اُردو محاورے سے قریب تر لانے کا خیال رکھا جائے تو کتاب کی افادیت کے ساتھ اس کی ادبیات میں بھی ترقی ممکن ہے۔

بہر حال اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کتاب مغربی علوم کو اُردو میں خوانی اور خوش اسلوبی سے منتقل کرنے کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اہل علم میں وہی قدر مقبولیت پائے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

س۔ ۵۔

مولفہ مولوی فصیح الدین احمد ایم اے۔ شارح کردہ ادیب بک ڈپو۔ نیا کتاب گھر اُردو | تاج دار رقاصہ | بازار دہلی۔ چھٹا ثانی قیمت مجلہ چار۔

یہ اباک فرانسیسی ناول کا ترجمہ ہے جو مولوی فصیح الدین احمد صاحب نے کیا۔ اصل فرانسیسی ناول کا نام نہیں دیا۔ مگر اس سے کتاب کی دل چسپی میں فرق نہیں آیا جو نہایت سلیس اور صاف زبان میں ہے۔ یہ ایک رقاصہ کا افسانہ ہے جو چمکے کی تاریک اور گندی زندگی سے بھل کر شاہی محل تک پہنچتی ہے اور شہنشاہِ حسینیں کی ملکہ بن کر وسیع سلطنتِ روم پر نہایت مطلق العنانی اور سفاکی سے حکومت کرتی ہے اور اپنی پچھلی ناپاک زندگی کے تاثرات و اثرات مٹانے کے لیے نہایت ہی بے رحمدل مظالم کی

مڑھب ہتی ہو اور بے وقوف جشینیں اس کے حُسن جہاں سوز کا اتنا گرویدہ ہوتا ہو کہ سارا کلمہ عیارِ حکومت اس کے سپرد کر دیتا ہو اور امورِ سلطنت اسی کی رے اور حُکم سے انجام پاتے ہیں۔ اس ”کامیاب“ زندگی کے بعد جب موت سر پر آتی ہو تو اس کے گشتہ ہائے مظالم کی رُحیں اس کے سامنے آکر اس کی خوف ناک عاقبت کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اس سفاک ملکہ کے ساتھ ہی اس کا عاشق زار جشینیں بھی خود کشی کر کے فنا ہو جاتا ہو۔ اور روما کو ایک پُرہول دورِ حکومت سے نجات مل جاتی ہو۔ سارا قصہ دِل چسپ اور عبرت انگیز ہو۔

ر۔ ع۔ ۱

## نئے رسائل اور خاص نمبر

”ہم دردِ صحت“ دہلی جو طبی مضامین عام فہم انداز میں شائع کرنے کی شہرت حاصل کر چکا ہو اپنے جدید خاص نمبر میں خود اپنی سابقہ اشاعتوں پر فوقیت لے گیا ہو۔ یہ خاص نمبر جو جنگ اور طب کے نام سے موسوم کیا گیا ہو تقریباً دس صفحات کی کتاب ہو جس کی زیریائش و افادیت میں اس گرانی اور مشکلات کے زمانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہو، اور یہ سب آٹھ آنے کی قیمت میں واقعی حیرت انگیز بات سمجھی جائے گی۔ ”جنگ اور طب“ میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اس جنگِ عظیم کے دوران میں جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہو اور نہ جلنے آئندہ کب تک جاری رہے گی فنِ طب یا تشخیص و علاج کے مختلف شعبوں میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں اور کیا کیا انقلابات رونما ہوئے۔ ظاہر بات ہو کہ اس وسیع اور شاخ و شاخ مضامین پر ماہرانہ انداز سے لکھنا کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس میں لکھنے والوں کی فہرست خاصی ممتاز و معزز ہو لیکن تحریر کا سب سے زیادہ بوجھ رسالے کے نگراں اور دواخانہ ہم درد کے مالک حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے خود اپنے کاندھوں پر لیا اور رسالے کا حصہ اول جو ۱۵ صفحات پر مشتمل ہو اور جس میں علاوہ فنِ جراحات کے تقریباً تمام عنوانات فنِ طب کے آگئے ہیں، تمام و کمال موصوفت ہی کا لکھا ہوا ہو۔ علم و فنِ جراحات کا حصہ ڈاکٹر جے گرے ٹرنز کی ”شہور کتاب



”موجودہ جنگ کے دوران میں علم و فن و فن جراحات کے تغیرات اور اس کی ترقیاں“ کا ترجمہ ہو جو ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر ماہرین کے مضامین اور تراجم بھی ہیں اور آخری حصے (سوم) میں ادبیاتِ جنگ کے عنوان سے اُن مضامین پر نظر ڈالی گئی ہے جو اہل ادب کی دل چسپی کے ہیں اور جس میں ایم ایم اسلم صاحب، کوثر صاحب چاندپوری اور سلطان حیدر صاحب جوش نے اپنا اپنا نورِ قلم دکھایا ہے۔ اور بعض مضامین اداسے کی طرف سے بھی لکھے گئے ہیں۔ غرض کہ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے مفید پُر از معلومات اور دل چسپ ہے اور ترتیب و طباعت کے لحاظ سے کافی دیدہ زیب بھی ہے۔ اہل فن اور عامی دونوں اپنی اپنی حد تک اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور اٹھ آنے کی قیمت میں اتنا لٹریچر بہت ہی ارزاں ہے۔ ہم ادارہ ’ہم و وصحت‘ کو ان کی اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس خاص نمبر کو خاص مقبولیت حاصل ہوگی۔

ر۔ ع۔ ۱

ماہنامہ لوہارو - مدیر مرزا صلاح الدین صاحب - چند سالانہ کے  
**امین الادب** | ہنرمائی نس نواب صاحب بہادر فرماں روا نے لوہارو کی زیر سرپرستی یہ نیا ماہنامہ نکھلنا شروع ہوا ہے جس کے دو نمبر اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔ خاندانِ لوہارو نے اردو علم و ادب اور شاعری کی جو خدمات کی ہیں۔ اُن سے دُنیا واقف ہے، حضرت سائل و پلوسی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ہم اس رسالے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دستِ پر چھا ہیں۔ اور دل سے چاہتے ہیں کہ یہ رسالہ ادب کی خدمت مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق، لیکن اسی بلند معیار پر انجام دے جو خاندانِ لوہارو کی روایات کو تازہ رکھ سکے۔ زیرِ نظر دو اشاعتوں میں خطِ زبان کا کافی جوش و خروش دکھایا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ مضامین میں بھی زیادہ سنجیدہ تنقید اور اعلیٰ تحقیقات کی صورت میں اس کا عملی ظہور ہوگا۔

ر۔ ع۔ ۱

سہ ماہی، حیدرآباد دکن، مدیر محمد غوث صاحب ایم اے، ال ال بی (عثمانیہ)  
**مجلہ طیلسانین** | چند سالانہ صر

بنجامین جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا یہ علمی و ادبی سماہی رسالہ اپنی زندگی کے آٹھ  
اور اس کا تازہ نمبر (جولائی ۱۹۴۷ء) جلد ہشتم کا تیسرا نمبر ہے۔ جو اپنے اعلیٰ علمی اور  
عین کے لحاظ سے اُس معیار پر قائم ہے جو ابتدا سے اس کے پیش نظر رہا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت  
یہ علمی تحقیقی مضامین ہیں، خاص کر خواجہ محمد یوسف الدین کا مضمون قدیم زمانے کے کتب خانوں پر  
اور پینڈت دتھی دھر انکار کا مضمون برعنوان اکبر الہ آبادی ہندی میں نہایت پر از معلومات اور دل چسپ  
ہیں۔ قائدِ ملت مولوی محمد بہادر خاں کی وفات کا غم حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں کئی پردو  
نظموں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسلامی معاشی نظریات، ہندستان کے وسائل نقل و حمل پر جنگ کے  
اثرات اور ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی کارکردگی کے مسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اردو  
زبان میں ایسے رسائل کی ضرورت ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ اپنے  
مقدور بھر اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

۱-۷۰

دوماہی، مدیر محمد شاہین، ۱۔ رانچی راؤ روڈ، بسون گروہی، بنگلور سٹی، چندہ سالانہ سے،  
بنگلور کا یہ دوماہی رسالہ جو ریڈروں کے سائز پر خوب صورت اہتمام و طباعت کے  
ساتھ شائع ہوتا ہے اپنے نام کی رعایت سے ادبِ جدید کا علم بردار ہے اور ترقی پسند ادب کی حمایت  
کرتا ہے چنانچہ اس ادب کے ایک پرجوش حامی فیض احمد فیض کا ایک مضمون ترقی پسند ادب پر  
اشاعتِ زیرِ نظر (اگست و ستمبر ۱۹۴۷ء) میں شائع ہوا ہے جس میں معترضین کو جواب دے کر  
ترقی پسند ادب کی زبردست حمایت کی گئی ہے۔ اس مضمون کے علاوہ رسالے میں اور کئی مضامین ہیں  
جو محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ نظموں میں جدید و قدیم دونوں طرز کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ہندستان  
کے اس دورِ افتادہ خطے سے اس مردو ادبی رسالے کی اشاعتِ اردو زبان کی عمومیت اور ہمہ گیری  
کی ایک بینِ مثال ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ملک میں مقبول ہوگا۔

۱-۷۰

تبصرے

14 "کا ترجمہ ہر جو ڈاکٹر  
کے علاوہ بعض دیگر

سے اُن مضامین

ہدی

October 1944

No. 4

# THE URDU

The Quarterly Journal  
OF  
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

*Edited by*  
ABDUL HAQ

---

*Published by*  
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)  
Delhi.





